عنقائے معانی (جلد دوم)

شرح اردو دیوانِ غالبؔ

شارح : شیر علی سرخوش
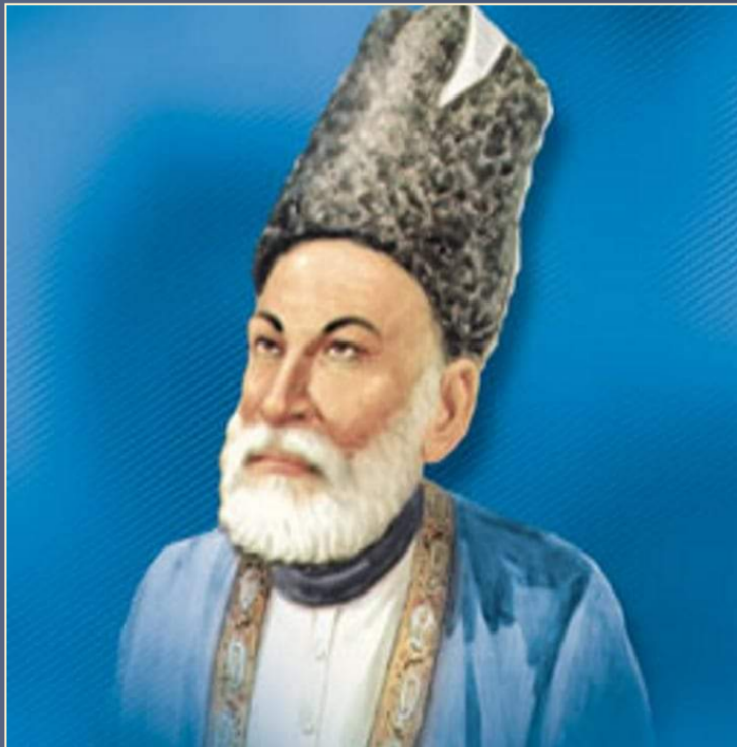
مطبوعہ انقلاب سٹیم پریس، بیرون موری دروازہ، لاہور

عنقائے معانی

یعنے

صحیح ترین و بہترین شرحِ اردو دیوانِ غالب

حصۂ دوم

(١٠٠١) کہتے تو ہو تم سب کہ بتِ غالیہ مو آئے
یک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وو آئے

(١٠٠٢) ہوں کشمکشِ نزع میں ہاں جذبِ محبت
کچھ کہہ نہ سکوں جو وہ مرے پوچھنے کو آئے

(١٠٠٣) ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم
آنا ہی سمجھ میں مری آتا نہیں گو آئے

(١٠٠٤) ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین
ہاں منہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے

(۱۰۰۵) جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے
ہم سمجھے ہوئے ہیں اُسے جس بھیس میں جو آئے

(۱۰۰۶) ہاں اہلِ طلب کون سنے طعنۂ نا یافت
دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

(۱۰۰۷) اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں
اُس در پہ نہیں بار تو کعبہ ہی کو ہو آئے

(۱۰۰۸) کی ہمنفسوں نے اثرِ گریہ میں تقریر
اچھے رہے آپ اُس سے مگر مجھ کو ڈبو آئے

(۱۰۰۹) اُس انجمنِ ناز کی کیا بات ہے غالب
ہم بھی گئے واں اور تری تقدیر کو رو آئے

(۱۰۰۱) حل۔ اے دوستو۔ یوں تو تم سب گئے ہو۔ میں چاہتا ہی ہوں کہ وہ محبوب۔ غالیہ مو (خوشبودار بالوں والا) میرے پاس آئے۔ مگر تم میں سے کوئی ذرا گھبرا کے یعنی بلند آواز سے دیوانہ وار اس کا نام لے کے یہ تو چلا اُٹھے کہ "وہ آئے" (تاکہ ممکن ہے کہ وہ ایسی گھبراہٹ کی صدا سن کے اور پھر اپنا نام یوں لیتے ہوئے سُن کے یہاں آ جائے۔ اور میں اُس کا نظارہ کر لوں۔)

(۱۰۰۲) اے محبت کے جذبے۔ میں اس وقت نزع کی کشمکش میں ہوں یعنی جان توڑ رہا ہوں۔ تو کچھ ایسا اثر کر کہ وہ میری حالت دریافت کرنے آ جائے۔ کہ میں اس سے اپنے آخری وقت میں کچھ بات چیت نہ کر سکوں۔

(۱۰۰۳) صاعقہ۔ بجلی کی کڑک۔ جو ایک لمحہ سے بھی کم رہتی ہے۔ شعلہ بھی ذرا بھڑک کر جلدی خاموش ہو جاتا ہے۔ سیماب۔ پارہ۔ وہ بیقراری کا عالم۔ کہ ایک جگہ بھی ایک لمحہ کے لئے پارہ قرار نہیں کرتا۔

حل۔ باوجودیکہ دوست میرے گھر میں آیا۔ مگر وہ اتنی جلدی چلدیا کہ سمجھ ہی میں نہیں آتا۔ کہ یہ اس کا آنا کیا تھا۔ بجلی کی کڑک کا آ کے گذر جانا تھا۔ شعلے کا بھڑک اُٹھنا تھا۔ یا کہ پارے کا ایک جگہ آ کے بے قراری سے بھاگ جانا۔

(۱۰۰۴) لغت۔ بادۂ دوشینہ۔ رات کی پی ہوئی شراب۔

حل۔ ظاہر ہے کہ قبر میں مجھے منکر نکیر کچھ سوال کرنے آئیں گے۔ تو وہ میرے جیسے گنہگار آدمی کو ضرور تنگ کریں گے۔ اور گھبرا کے یعنی جلدی میرا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ ہاں اگر مرنے سے ایک دن پہلے میں شراب خوب چھک کے پی لوں گا۔ تو میرے منہ کی بدبو سے وہ ضرور بھاگ جائیں گے اور سوال و جواب نہیں کرنے پائیں گے۔

(۱۰۰۵) ہم عشق میں نہ تو کسی جلاد سے ڈرتے ہیں۔ مثلاً کسی رقیب سے اور نہ واعظ سے۔ اس کی باتیں سُن کے ان سے جھگڑتے ہیں۔ کیونکہ ہم انھیں اسے سمجھے ہوئے ہیں۔ یعنی جانتے ہیں۔ کہ یہ سب گویا ہمارا محبوب ہی ہے۔ جو ہماری تکلیف کا باعث ہے۔ خواہ کسی بھیس میں ہو۔ یعنی رقیب جفا شعار کی صورت میں یا واعظ و ناصح بن کے آیا ہو۔

(۱۰۰۶) لغت۔ اہلِ طلب۔ یہاں مراد خدا کی تلاش کرنے والے لوگ۔ نا یافت۔ یعنی کوئی چیز نہ ہاتھ آئے۔ تو سالک کی کوشش پر لوگ طعنہ کرتے ہیں۔ کہ بھلا ایسے لوگ بھی اتنا بڑا کام کر سکتے ہیں۔ یہاں

خدا کی تلاش مراد ہے۔ کہ جس کے لئے کوئی کوشش کیجئے تو سب طعن کرتے ہیں کہ کیا خدا بھی کہیں ہاتھ آتا ہے۔ اپنے کو کھو آئے - یعنی اپنے ہی کو دیوانہ بنا کے چھوڑا۔

حل ۔ اے اہل طلب - خدا کے نہ ملنے پر کون طعنے سنتا - دیکھا کہ وہ ملتا نہیں ہے - تو ہم اپنے ہی کو کھو آئے - یعنی دیوانوں کے پھرنے لگے تاکہ کسی کے طعنوں کو سن کے دل پر نہ لگائیں۔

(۱۰۰۷) شیوہ ۔ دستور۔ حل - ہمارا یہ دستور نہیں ہے۔ کہ کبھی آرام سے بیٹھیں - ہم کچھ نہ کچھ کوشش خدا سے ملنے کی کرتے ہی رہتے ہیں مثلاً اس دیر میں نہیں پایا - یعنی اگر خدا ہم کو اپنے گھر میں نہیں ملا۔ تو کعبہ یعنی خدا کے گھر تک ہی ہو آئے۔

(۱۰۰۸) لغت ۔ ہم نفس - ہمدم و شریک صحبت ۔ اثر گریہ میں تقریر کی۔ یہاں مراد - میرے رونے دھونے کی تاثیر کے متعلق بات چیت کی۔ اچھے رہے - یعنی سرخ رو رہے۔

حل - تمہارے شریک صحبت احباب نے میرے رونے دھونے کے متعلق تقریر کی - کہ میرے گریہ میں کچھ تاثیر نہیں ہے - تو تم اپنے دعویٰ میں سرخرو رہے - کہ بہ لحاظ معشوق تمہیں ایسا ہی سنگدل ہونا چاہیے تھا - مگر آپ مجھ کو ڈبو آئے - یعنی رقیبوں پر ثابت ہو گیا - کہ میرا رونا دھونا بھی تم پر کچھ اثر نہیں کر سکتا۔

(۱۰۰۹) انجمن ناز - ناز سے مراد یہاں معشوقانہ غرور و ناز و بے اعتنائی ہے۔

حل ۔ اے غالب اس انجمن ناز یعنی غرور کے چلنے کی بابت

…ے کیا کہیں - ہم بھی اس کے پاس گئے تھے - اور ہمارا یہ جانا گویا تیری قسمت پر …رو رہا تھا - کہ تو کہاں ڈوبا۔

غزل

(۱۰۱۰) پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے
سینہ جویائے زخم کاری ہے

(۱۰۱۱) پھر جگر کھودنے لگا ناخن
آمد فصل لالہ کاری ہے

(۱۰۱۲) قبلۂ مقصد نگاہ و نیاز
پھر وہی پردہ عماری ہے

(۱۰۱۳) چشم دلال جنس رسوائی
دل خریدار ذوق خواری ہے

(۱۰۱۴) وہی صد رنگ نالہ فرسائی
وہی صد گونہ اشکباری ہے

(۱۰۱۵) دل ہوائے خرام ناز سے پھر
محشرستان بے قراری ہے

(۱۰۱۶) جلوہ پھر عرض ناز کرتا ہے
روز بازار جاں سپاری ہے

(۱۰۱۷) پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں
پھر وہی زندگی ہماری ہے

قطعہ

پھر کھلا ہے درِ عدالتِ ناز (۱۰۱۸)
گرم بازار فوجداری ہے

(۱۰۱۹) ہو رہا ہے جہان میں اندھیر
زلف کی پھر سررشتہ داری ہے

پھر دیا پارۂ جگر نے سوال (۱۰۲۰)
ایک فریاد و آہ و زاری ہے

(۱۰۲۱) پھر ہوئے ہیں گواہِ عشق طلب
اشکباری کا حکم جاری ہے

دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا (۱۰۲۲)
آج پھر اُس کی روبکاری ہے

(۱۰۲۳) بے خودی بے سبب نہیں غالبؔ
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

(۱۰۱۰) میرے دل کو پھر کچھ بے قراری سی ہو رہی ہے۔ بو میرا [illegible] کسی کاری (مہلک) زخم کا متلاشی ہے یعنے پھر کسی ظالم کا عشق دل [illegible] سمایا ہے۔

(۱۰۱۱) پھر میرے جگر کے زخم کو ناخن کریدنے لگا۔ یعنی گل لالہ کے پو[illegible] کی فصل آگئی۔ یا بہار آئی اور میں دیوانہ بننے لگا۔

(۱۰۱۲) لغت۔ قبلہ۔ کعبہ کی طرف یہاں مراد دوست کی طرف [illegible]

مقصدِ نگاہ و نیاز۔ دل نذر کرنے والی نظر کا مدعا۔

حل۔ پھر میرا دوست کی طرف دل نذر کرنے کا ارادہ ہے۔ یعنی میں مجنوں بنا ہوں۔ اور وہ اس کاوش محبوب کے کجادے کا پردہ ہے۔ کہ جس کو میں قبلہ مقصد نگاہ و نیاز خیال کیا کرتا ہوں کیونکہ وہ محبوب اس کے اندر چھپا ہوا رہتا ہے۔

(۱۰،۳) قطعہ بند۔ میری آنکھ اس رسوائی کی جنس یعنی رسوائی کی دلالی کر رہی ہے۔ یعنی پھر کسی پر عاشق ہونے کی ترغیب دے رہی ہے۔ اور میرا دل اس خواری کے شوق کا خریدار یعنی متمنی ہے۔ (ذوقِ خواری عشق)

(۱۰۱۴) اب وہی سو سو طرح سے نالہ و فریاد کرنا۔ اور وہی سیکڑوں طریق سے اشک باری کرنا یعنی اپنے دل کا دکھڑا رونا ہے۔

(۱۰،۵) میرا دل پھر کسی کی مستانہ چال کے شوق میں بیقراری و بےچینی کا محشر بن گیا ہے۔

(۱۰۱۶) پھر کسی معشوق کا جلوہ اپنے غرور و ناز کو عرض کرتا ہے۔ یعنی اس کو ہمارے سامنے پھیلا رہا ہے۔ یا وہ ہم پر ناز کر رہا ہے۔ اور یہاں ہر روز اسی معشوق کو دل دینے کا بازار گرم ہے۔ یعنی پھر ہم ہر روز کسی پہ جان قربان کرنے لگے ہیں۔

(۱۰۱۷) پھر اُسی بے وفا پر (کہ جس سے ہم کنارہ کشی کرنا چاہتے تھے) ہم مرنے لگے ہیں۔ اور پھر وہی ہماری زندگی (خراب و خستہ ہے)

(۱۰۱۸) قطعہ بند۔ پھر دوست کے غرور کی عدالت کا دروازہ

کھلا ہے۔ (اور وہ ہم پر دست درازیاں کر رہا ہے) اس لئے فوجداری کا بازار گرم ہے۔ یعنی وہ ہم پر جور و جبر کر رہا ہے۔

(۱۰۱۹) دنیا میں اس کے ظلم کے باعث اندھیر چھا گیا ہے۔ اور پھر وہی زلف اس دوست کی سررشتہ داری کر رہی ہے۔ یعنی اس کے ہاتھ سے عشاق پر ظلم کرا رہی ہے۔ (سررشتہ داری۔ کسی کام میں ذمہ داری کا اختیار ہونا۔)

(۱۰۲۰) پھر میرے جگر کے کسی ٹکڑے نے (دوست کے ظلم و ستم کے خلاف) عدالت ناز میں انصاف کے لئے عرضی دی ہے۔ اور ایک فریاد آہ و زاری ہے۔ یعنی وہ پارہ جگر جو گریہ و زاری کر رہا ہے۔ اس کا شور خوب مچا ہوا ہے۔

(۱۰۲۱) پھر عشق کے گواہ (عدالت ناز میں) طلب کئے جاتے ہیں۔ اور وہاں سے عاشق کے لئے یہ حکم جاری ہوا ہے کہ خوب رویا کرے یہ ظلم کبھی بند نہیں ہوگا۔

(۱۰۲۲) میرے دل اور اس کی پلکوں کا مقدمہ درپیش تھا۔ چنانچہ آج پھر اس کی کارروائی عدالت ناز میں ہوئی۔ (مراد یہ کہ معشوق کی پلکیں دل کو اڑا لے گئی ہیں اس کا رونا ہے)

(۱۰۲۳) غالبؔ! تمہاری یہ مدہوش سی حالت یونہی نہیں ہو گئی۔ تم ضرور کسی پر عاشق ہو گئے۔ (جیسا کہ اوپر بیان ہوا) مگر تم پردہ داری کرتے ہو۔ یعنی اپنا عشق اب ہم سے چھپایا چاہتے ہو۔ کہ اس طرح عدالت ناز سررشتہ داری گواہ اور حکم کے استعاروں میں اس کا حال بیان کر رہے ہو۔

غزل

جنوں تہمت کش تسکیں نہ ہو گر شادمانی کی (۱۰۲۴)
نمک پاش خراش دل ہے لذت زندگانی کی

(۱۰۲۵) کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعی آزادی
ہوئی زنجیر موج آب کو فرصت روانی کی

پس از مردن بھی دیوانہ زیارت گاہ طفلاں ہے (۱۰۲۶)
شرار سنگ نے تربت پہ میری گلفشانی کی

(۱۰۲۴) لغت۔ تہمت کش تسکیں۔ عشق میں تسلی یا تسکین خاطر حاصل کرنے کا الزام۔ شادمانی کی۔ "شادماں کردم" خوشی منائی۔ خراش دل۔ زخم دل۔

حل۔ اے جنون تو عشق میں تسکین خاطر حاصل کرنے کا متہم (ملزم) نہ گردانا جائے۔ اگر کچھ خوشی منائی۔ یعنی زخم دل پر نمک چھڑک دیا۔ اور اسی کو لذت زندگانی تصور کیا گیا ہے۔ (مراد یہ کہ نمک پاشی سے تو زخم اور تکلیف دیتا ہے۔ نہ کہ لطف۔ پھر یہ خوشی منانے کا الزام کیسا)

(۱۰۲۵) لغت۔ کشاکش ہائے ہستی۔ زندگی کی الجھنیں یا تکلیفات۔ سعی آزادی۔ آزادی پانے کی کوشش۔ فرصت۔ اجازت۔

حل۔ موج آب زندگی کی الجھنوں سے آزادی پانے کی کوشش کیا کرے (یعنی کس طرح آزادی حاصل کرے۔) کہ موج آب یعنی پانی کی نہر کو روانی یا دریا میں چلنے پھرنے کی اجازت ملی۔ تو وہی روانی آب (پانی کا بہنا)

یعنی لہر کی صورت ہونا اس لہر کے لئے ایک زنجیر سی بن گئی۔ (اور زنجیر علامت قید کی ہوا کرتی ہے۔)

(۱۰۲۶) لغت۔ زیارت گاہ بنانا۔ کسی کی قبر پر جانا۔ اور کچھ پھول یا نقدی وغیرہ وہاں تقسیم کرنا۔ اور فاتحہ پڑھنا۔ شرارۂ سنگ مراد پتھروں سے شرارے نکلنا۔

حل۔ مرنے کے بعد بھی مجھ دیوانے کی قبر لڑکوں کی زیارت گاہ بن گئی ہے۔ وہ اس پر اتنے پتھر مار جاتے ہیں۔ کہ انھیں پتھروں سے شرارے نکل کر میری قبر پر گویا پھول برساتے ہیں۔

غزل

نکوہش ہے سزا فریادیٔ بیدادِ دلبر کی (۱۰۲۷)
مبادا خندۂ دنداں نما ہو صبح محشر کی

(۱۰۲۸) رگِ لیلےٰ کو خاکِ دشتِ مجنوں ریشگی بخشے
اگر بودے بجائے دانہ دہقاں نوک نشتر کی

پرِ پروانہ شاید بادبانِ کشتیِ مے تھا (۱۰۲۹)
ہوئی مجلس کی گرمی سے روانی دورِ ساغر کی

(۱۰۳۰) کروں بیدادِ ذوقِ پر فشانی عرض کیا قدرت
کہ طاقت اُڑ گئی اُڑنے سے پہلے میرے شہپر کی

کہاں تک روؤں اُس کے خیمہ کے پیچھے قیامت ہے (۱۰۳۱)
مری قسمت میں یارب کیا نہ تھی دیوار پتھر کی

(۱۰۲۷) دلبر یا معشوق کے ظلم کے ہاتھ سے فریاد کرنے والے کی سزا زجر و ملامت ہے۔ میں ڈرتا ہوں۔ کہیں صبح قیامت بھی اسی فریادی عشق پر۔ خندہ دنداں نما نہ ہو۔ یعنی حقارت سے اس پر دانت نکال کے ہنسنے والی نہ ہو۔ (مراد۔ یہاں تو عاشق پر ملامت ہے۔ کہیں وہاں بھی تحقیر نہ ہو۔)

(۱۰۲۸) رگِ لیلیٰ و نشتر۔ اس میں اشارہ یہ ہے۔ کہ ایک مرتبہ لیلیٰ کی رگ نشتر سے کاٹی گئی تھی۔ یعنی اس کی فصد لی۔ کہ جس جگہ سے لیلےٰ کا خون نکلا تھا۔ جسم کے اسی مقام سے مجنوں کا خون بھی بہنے لگ گیا تھا۔ خاکِ دشتِ مجنوں۔ صحرائے نجد کی مٹی۔ ریشگی بخشے۔ یعنی ریشہ دار کردے۔ یا اُگا دے۔

حل۔ اگر دہقان دانے کے بجائے نشتر کی نوک زمین میں بودے تو نجد کی مٹی وہاں رگ لیلیٰ کو زمین سے اُگا دے۔ کیونکہ عاشق و معشوق کے اتحاد سے اب عاشق۔ معشوق کی چیزوں پر بھی باہمی کشش کا اثر پڑنے لگا ہے۔

(۱۰۲۹) پروانے کا پر شاید شراب کی کشتی کا بادبان تھا۔ (یعنی رات کو پروانہ جلنے لگا۔ تو گویا وہ جو تھا اپنے پروں سے کشتی کا بادبان بن گیا ہے) کہ شمع سے جو مجلس میں گرمی پہنچی۔ (اور اس سے وہ پروانہ متاثر ہوا) تو دورِ ساغر چلنے لگا۔

(۱۰۳۰) لغت۔ بیدادِ ذوق۔ پر فشانی۔ قاعدہ ہے۔ کہ جانور کو پکڑ کر پنجرے میں ڈالنے سے پہلے اُس کے پر نوچے جاتے ہیں۔ تاکہ وہ پھر اُڑنے نہ پائے۔ تو بیدادِ ذوق۔ گویا صیاد کا ظلم۔ اور وہ

ظلم کیا پر فشانی - یعنی مرغ اسیر کے پر توڑ کے جھاڑ دینا۔

حل - میری کیا مجال کہ (بہ حیثیت ایک قیدی جانور ہونے کے) میں صیاد کے ظلم کے اس شوق کو جو میرے پر جھاڑنے کے متعلق اُس میں پایا جاتا ہے - عرض یا بیان کر سکوں - کہ اس کا نتیجہ ہے جواب پر مجھ کو آزادی کا موقع ملا ہے تو اُڑنے سے پہلے ہی میرے سب سے بڑے پر کی طاقت اڑ چکی ہے - (بوجہ صیاد کی کانٹ چھانٹ کے)

(۱۰۳۱) میں کہاں تک اُس کے خیمے کے پیچھے رووں یہ مصیبت تو قیامت ہے - (مراد مجنوں کہاں تک لیلیٰ کے خیمے کے ساتھ لگ کر رویا کرے -) کیا اے خدا میری قسمت میں یہ بھی نہیں ہونا تھا - صحرا میں کوئی دیوار پتھر کی بنی ہوتی - کہ جس سے میں اپنا سر ٹکرا کے مر جاتا - اور خلاصی پاتا -

غزل

بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے (۱۰۳۲)
جتنے زیادہ ہو گئے اُتنے ہی کم ہوئے

(۱۰۳۳) پنہاں تھا دام سخت قریب آشیانہ کے
اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے (۱۰۳۴)
یاں تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے

(۱۰۳۵) سختی کشانِ عشق کی پوچھے ہے کیا خبر
وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا الم ہوئے

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں (۱۰۳۶)
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

(۱۰۳۷) لکھتے رہے جنوں کی حکایات خونچکاں
ہر چند اُس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

اللہ رے تری تندیٔ خو جس کے بیم سے (۱۰۳۸)
اجزائے نالہ دل میں مرے رزقِ ہم ہوئے

(۱۰۳۹) اہلِ ہوس کی فتح ہے ترکِ نبردِ عشق
جو پاؤں اُٹھ گئے وہی اُن کے علم ہوئے

نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے (۱۰۴۰)
جو واں نہ کھنچ سکے سو وہ یاں آ کے دم ہوئے

(۱۰۴۱) چھوڑی اسدؔ نہ ہم نے گدائی میں دل لگی
سائل ہوئے تو عاشقِ اہلِ کرم ہوئے

(۱۰۳۲) ہم بے اعتدالیوں یا بدپرہیزیوں کی وجہ سے (جیسا کہ کوئی میخوار یا عیاش آدمی ہوا کرتا ہے) سب میں سبک ہو گئے - یعنے جتنے بدپرہیز ہوئے اُتنے ہی زیادہ بے قدر و بے وقعت ہو گئے - گویا اُدھر بے اعتدالی میں بڑھے اور اِدھر عزت میں گھٹ گئے -

(۱۰۳۳) ایک پختہ دام (پنجرہ یا جال یا قفس) جس کو ہم توڑ نہیں سکتے تھے ہمارے گھونسلے کے قریب ہی صیاد نے لگا دیا تھا کہ ابھی قفس سے کچھ دور ہی اڑنے پائے تھے - کہ اس دام میں گرفتار ہو کے رہ گئے - مراد یہ کہ صیاد نے ہم کو بُری طرح پھانسا ہے - کہ

ہم اس کے پنجے سے اب نکل ہی نہیں سکتے۔ ہم یہ نہیں جانتے تھے۔ کہ وہ کس قدر ہوشیاری کے ساتھ ہماری نادانی سے فائدہ اُٹھائیگا۔

(۱۰۳۴) ہماری یہ ہستی سے مراد انسان کی زندگی۔ جس کی نسبت ہر شخص جانتا ہے۔ کہ یہ فنا ہونے والی ہے۔ مگر یہ ہستی کس قدر فنا ہونے والی ہے۔ اس کی دلیل خود یہ ہستی ہی ہے۔ کیونکہ فنا کا اصل مدعا کلیۃً مٹ جاتا ہے۔ اور زندگی جب مٹ چکی ہو۔ تو آپ اپنی قسم بن جاتی ہے۔ یعنی نام و نشان نام کو بھی باقی نہیں رہتی۔ اور قسم کھا کر اس کا یقین دلانا پڑتا ہے۔ کہ یہ کبھی وجود میں تھی اس لئے کہتا ہے کہ جب ہستی مٹ کے اسقدر ریا مجدا امکان نیست و نابود ہو جاتی ہے تو ظاہر ہے کہ اس کے کبھی ہونے کا یقین بھی نہیں آ سکتا۔ اور گویا اس کا ہونا خود اپنی فنا کی دلیل ہے۔

(۱۰۳۵) سختی کشانِ عشق۔ یعنی آفت زدہ عشاق تو اُنکی حالت کیا دریافت کرتا ہے۔ وہ لوگ تکلیفیں سہتے سہتے مجسم غم بن گئے۔ یعنی ہر وقت مبتلائے رنج و الم ہیں۔

(۱۰۳۶) مانا کہ تو نے مجھ پر جو ظلم کئے تھے۔ اب تو نے اُن کی تلافی کر دی۔ یعنی میرا نقصان پورا کر دیا۔ مراد۔ تو وفادار دوست بن گیا۔ مگر اس عشق میں زمانے کے ہاتھوں اور بھی تو بہت سے ظلم مجھ پر ہوئے تھے۔ اب اُنکی تلافی کس طرح ہوگی۔

(۱۰۳۷) ہم اپنے جنون کی وہ دردناک داستان نہیں بڑھا سکتے رہے۔ کہ جن کو سنکر لوگوں کی آنکھوں سے خون ٹپک پڑتا تھا۔ اگرچہ ایسی داستانوں کے لکھنے سے ہمارے ہاتھ

قلم ہو گئے۔ یعنی اس محبوب کی طرف سے ہمارے ہاتھ قلم ہوئے۔ یا کاٹ دیئے گئے۔

(۱۰۳۸) لغت۔ رزقِ ہم۔ دونوں کا ایک ساتھ رزق یا خورش بنجانا۔

حل۔ اللہ رے۔ یعنی کس قدر تعجب انگیز ہے۔ تیری مزاج کی تیزی (وہ بدمزاجی) کہ جس کے خوف سے میری آہ و فریاد کے اجزا بھی ایک دوسرے کی خوراک بن گئے۔ مطلب تیری بدمزاجی دیکھکر فریاد نہ کرسکے۔ اندر ہی اندر پی گئے۔ اور وہ اس طرح کہ ایک نالہ نکلا۔ تو وہ دوسرے کا رزق ہو گیا۔ یعنی ان میں ضم مدغم ہو گیا۔ علی ہذا القیاس دوسرا تیسرا نالہ اور کوئی دل سے باہر نہ آیا۔

(۱۰۳۹) نبردِ عشق۔ عشق و محبت کی جنگ۔ پاؤں اُٹھ گئے۔ پاؤں اکھڑ گئے۔ علم ہونا۔ جھنڈا بلند ہونا۔ جو علامت فتح کی ہے۔ یا خوشی منانے کی۔ حل۔ بوالہوس لوگوں کی فتح عشق و محبت میں یہ ہے۔ کہ عشق کی لڑائی ترک کرکے جب بھاگیں۔ تو ان کے جو پاؤں میدان سے اُٹھ گئے یعنی اُکھڑ گئے۔ وہی گویا اُن کی فتح کا جھنڈا بلند ہو گیا۔ (مراد یہ کہ عشاق کے سامنے اپنی جان بچاکے بھاگے۔ تو اسی کو اپنی فتح سمجھ لیا۔ گویا جان بچی تو لاکھوں پائے۔

(۱۰۴۰) عدم یعنی پیدا ہونے سے پہلے ہم بساطِ عدم۔ کچھ نالے ہمارے ہمراہ تھے۔ جب ان کو ہم وہاں نہ کھینچ سکے۔ تو جو باقی رہتے تھے۔ ہمارے (.....) یہاں آنے یعنی دنیا میں پیدا ہونے پر وہی (بقیہ نالے) ہمارے دم یعنی سانس بن گئے۔ (چونکہ نالہ یعنی آہ بھی سانس ہوتی ہے۔ اور دم بھی سانس۔ عدم میں نالہ جو سانس تھا۔ وہ دنیا میں آکے آہ بن گیا)

(۱۰۴۱) اے اسد ہم نے فقیری میں بھی دل لگی کو (یہاں مراد عشق و محبت کا) ترک نہیں کیا۔ چنانچہ ہم سوال کرتے ہیں۔ تو صرف ان لوگوں سے کہ جو حسین ہیں گویا انہی کے عاشق ہیں۔ کہ بغیر ان کے اور کسی کے سائل ہی نہیں ہوتے (فقیر کا دستور ہے۔ کہ جو زیادہ دان دے اُس کے گرد رہا کرتے ہیں۔ گویا ان کے عاشق ہو جاتے ہیں۔)

غزل

ہو نہ نقد داغ دل کی کرے شعلہ پاسبانی (۱۰۴۲)
تو فسردگی نہاں ہے بہ کمین بے زبانی

مجھے اس سے کیا توقع بزمانۂ جوانی (۱۰۴۳)
کبھی کودکی میں جس نے نہ سنی میری کہانی

یوں ہی دکھ کسی کو دینا نہیں خوب ورنہ کہتا (۱۰۴۴)
کہ مرے عدو کو یارب ملے میری زندگانی

(۱۰۴۲) نقد داغ۔ زخم کے گول گول نشان۔ شعراء کے نزدیک گویا سکہ یا زر و نقد ہیں۔ کیونکہ روپیہ پیسہ بھی گول شکل کا ہوا کرتا ہے۔ شعلہ یہاں مراد داغ دل سے جو اس کی جلن کی وجہ سے آگ بھڑک رہی ہوتی ہے شعلہ پاسبانی کرنے سے مراد ہمارے دل کے داغ کا بوجہ سوزش دل کے آگ بھڑکاتے رہنا۔ یا کہ شعلہ نکلتا رہے۔ فسردگی۔ آگ کا بجھ جانا۔ بہ کمین یعنی گھات میں بیٹھا ہے۔
حل۔ اگر دل کے داغ کا بوجہ سوزش دروِنی یہ شعلے اٹھانا

نہ ہو۔ یعنی دل کی سوزش کی آگ بھڑکتی رہے۔ تو وہ شعلہ میرے دل کے داغ کے نقد کی کبھی پاسبانی نہ کر سکے۔ مراد یہ کہ دل کی جلن ہی دل کے داغوں کو برقرار رکھتی ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو فسردگی (مراد دل کا بجھ جانا) جو بے زبانی کی گھات لگائے بیٹھی ہے۔ وہ اس نقد داغ دل پر حملہ کر دے۔ حاصل مطلب یہ کہ دل جلتا ہے۔ زخم اس سے بڑھتے ہیں۔ گویا نقد داغ دل محفوظ ہے۔ مگر دل بجھ جائے۔ تو پھر دل کا جلنا کہاں۔ ہم خاموش ہو کے رہ جائیں۔ اور عشق و محبت کی آگ مغلوب ہو کر نقد داغ دل کھو یا جائے۔

(۱۰۴۳) مجھے ایسے بے وفا شخص سے جوانی کے دنوں میں کیا امید ہو سکتی ہے۔ جبکہ لڑکپن میں بھی وہ میرے غم کی کہانی نہیں سنا کرتا تھا۔ (حالانکہ لڑکپن میں تو کہانیاں سننے کا بہت شوق ہوا کرتا ہے۔) مراد۔ وہ ہمیشہ ہی سے میرا دشمن ہے۔

(۱۰۴۴) کسی کو بے فائدہ یعنی یونہی دکھ دینا اچھا نہیں ہوتا۔ ورنہ میں کہتا یعنی خدا سے دعا مانگتا۔ کہ کاش میری زندگی میرے دشمن ہی کو مل جائے۔ یعنی میری زندگی اس قدر تلخ ہے۔ کہ اگر دشمن اس کو لے لے تو گویا میں خوش ہونگا۔ کہ اس کو اس سے سخت رنج پہنچا کرے گا۔ لیکن میں اس پر رحم کر کے ایسا ظلم کرنا نہیں چاہتا۔

غزل

ظلمت کدہ میں میرے شب غم کا جوش ہے (۱۰۴۵)
اک شمع ہے دلیل سحر سو خموش ہے

(۱۰۴۶) نے مژدۂ وصال نہ نظارۂ جمال
مدت ہوئی کہ آشتیٔ چشم و گوش ہے

(۱۰۴۷) مے نے کیا ہے حسن خود آرا کو بے حجاب
اے شوق یاں اجازت تسلیم ہوش ہے

(۱۰۴۸) گوہر کو عقد گردن خوباں میں دیکھنا
کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے

(۱۰۴۹) دیدار بادہ حوصلہ ساقی نگاہ مست
بزم خیال میکدۂ بے خروش ہے

(۱۰۵۰) اے تازہ واردان بساط ہوائے دل
زنہار گر تمہیں ہوس نائے و نوش ہے

(۱۰۵۱) دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہے

(۱۰۵۲) ساقی بجلوہ دشمن ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزن تمکین و ہوش ہے

(۱۰۵۳) یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامان باغبان و کف گل فروش ہے

(۱۰۵۴) لطف خرام ساقی و ذوق صدائے چنگ
یہ جنت نگاہ وہ فردوس گوش ہے

(۱۰۵۵) یا صبحدم جو دیکھئے آ کر تو بزم میں
نے وہ سرور و شور نہ جوش و خروش ہے

(۱۰۵۶) داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

(۱۰۵۷) آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالبؔ صریر خامہ نوائے سروش ہے

(۱۰۴۵) ظلمتکدہ - یہاں اندھیرے گھر سے مراد ہے۔ شب غم کا جوش - یعنی غم فراق کی رات کا غلبہ - مراد سخت اندھیرا چھا جانا - کہ جس کے ہوتے بھی امید ہی نہ ہو سکے - کہ صبح بھی کبھی ہوگی - کیونکہ شعرا شب فراق کی سحر ناپیدا خیال کیا کرتے ہیں - شمع خموش ہے یعنی بجھ چکی ہے -

حل - میرے اندھیرے گھر میں فراق کی رات کا سخت اندھیرا چھایا ہے - کہ امید ہی نہیں کہ کس طرح دور ہو - یعنی سحر ناپید ہے - یا اس سحر یا صبح کا ایک نشان یا دلیل یہ ہے کہ میرے گھر میں جو ایک بجھا ہوا چراغ رکھا ہے - وہ حسب دستور صبح کو بجھایا گیا تھا - کیا خوب شب غم کی صبح ہونے کا ثبوت ایک ایسے شمع یا چراغ سے دیا ہے - کہ جو بجھا ہوا ہے - اور روشنی نہیں دیتا - گویا صبح کبھی ہوئی ہی نہیں - کہ چراغ جلا کے پھر بجھایا جاتا - خلاصہ یہ کہ شب غم کی بدولت میرا گھر تاریک ہی رہیگا - کبھی روشن نہ ہوگا -

(۱۰۴۶) لغت - آشتیٔ چشم و گوش - انتظار میں آنکھ اور کانوں کے ساتھ اتحاد ہونا یعنی ان کے ذریعہ منتظر رہنا - مجھے نہ وصال کا مژدہ - نہ دوست کے جمال کے نظارہ کرنے کی خوشخبری کہیں سے آتی ہے بہت عرصے سے میں اپنی آنکھوں اور کانوں سے آشتی رکھتا ہوں -

یعنی منتظر بیٹھا ہوں۔

(١٠٤٧) حسن خود آرا۔ وہ اپنے آپ کو بنانے سنوارنے والا محبوب اس کا حسن۔ حل۔ شراب نے اس حسن خود آرا کو بے پردے سے باہر کر دیا ہے۔ اے ہمارے دل کے شوق اب تجھ کو اجازت ہے۔ کہ تسلیم ہوش کر۔ یعنی اپنے ہوش کو اس دوست کے سپرد کر دے۔ یار سے دیکھکر بے ہوش و حواس ہو جا۔ مراد۔ عاشق اپنے معشوق کا حسن دیکھے تو ضرور ہے۔ کہ وہ بے ہوش ہو جائے۔

(١٠٤٨) لغت۔ عقد۔ کسی کو کسی کے ساتھ لگا دینا یا وابستہ کر دینا یہاں مراد ہار۔ حل۔ اس لعل کو حسینوں کی گردن کے ساتھ ہار میں لگا ہوا ذرا دیکھنا۔ کہ اس کی بدولت جوہری کا ستارہ کس قدر عروج پر ہو گیا ہے۔ یعنی ان حسینوں کو اب جوہری کی دوکان پر جانا پڑتا ہے۔ تاکہ گلے کا ہار خرید کریں۔ یا جوہری جبکہ ہار ایسا نازنین کے گلے میں ہے۔ اس سے خوش طالع ہو گیا ہے۔

(١٠٤٩) دیدار بادہ یعنی دوست کا دیدار تو شراب ہے۔ حوصلہ ساقی۔ مراد۔ جس قدر اس دیدار کا حوصلہ یعنی اس کے دیکھنے کی طاقت ہے۔ وہ ساقی ہے۔ اور نگاہ مست۔ یعنی نظر مست ہے۔ کہ اس کو اپنے خیال میں محو ہو کے دیکھ رہی ہے۔ لہذا یہ ہمارے خیال کی محفل بھی ایک شراب فروش کا خاموش شراب خانہ ہے۔ (بے خروش۔ مراد چپ چاپ)

(١٠٥٠) قطعہ بند۔ لغت۔ تازہ واردان۔ نئے آنے والے۔ یہاں مراد نئے شوقین۔ ہوا سے مراد خواہش۔ لہذا ہوائے دل۔ دل کی خواہش۔ زنہار۔ نفی موکد۔ یعنی ایسا نہ کرنا۔ نا و نوش۔ کھانا پینا۔

حل۔ اے نئے نئے شوقینوں۔ جو ابھی اپنے دل کی خواہش سے فرش پر آئے ہو۔ یعنی عیش و عشرت کا آغاز کیا ہے۔ اگر تمہیں کھانے پینے کی ہوس ہو تو زنہار یعنی ایسا ہرگز نہ کرنا۔

(١٠٥١) عبرت نگاہ۔ نصیحت حاصل کرنے والی نظر۔

حل۔ مجھ کو دیکھو اگر عبرت یا نصیحت حاصل کرنے والی آنکھ رکھتے ہو۔ اور اگر نصیحت سننے والے کان ہیں۔ تو میری نصیحت کو سنو۔

(١٠٥٢) لغت۔ بجلوہ۔ اپنے چہرے کو دکھانے میں۔ آگہی۔ علم و عقل۔ تمکین۔ خودداری۔

حل۔ ساقی اپنے جلوے سے ایمان اور عقل کا دشمن ہے۔ یعنی اس کے دیکھتے ہی سے ایمان اور عقل جاتے رہتے ہیں۔ اور مطرب یا گانے بجانے والا اپنے گانے کے ذریعہ سے خودداری اور ہوشیاری کا لٹیرا ہے۔ یعنی اس کا گانا سنکر انسان اختیار سے باہر ہو جاتا ہے۔

(١٠٥٣) یا رات کو ہم دیکھتے تھے۔ کہ اس فرش کا ہر کونہ۔ مالی کی جھولی۔ اور پھول بیچنے والے کی ہتھیلی ہے۔ یعنی اس قدر پھولوں کا ڈھیر ہو رہا ہے۔

(١٠٥٤) لغت۔ لطف خرام ساقی۔ ساقی کے آنے کی خوشی۔ ذوق صدائے چنگ۔ چنگ نامی باجے کے آواز کا مزا۔

حل اور ساقی کے محفل میں آنے کی خوشی اور چنگ کی آواز کا مزا ہے۔ ساقی تو گویا نظر کے لئے ایک جنت ہے۔ اور چنگ کانوں کے لئے ایک بہشت۔ یعنی بہت عیش و مزے میں رات گزر رہی ہے۔

(١٠٥٥) لغت۔ صبح دم۔ صبح کو جبکہ عیش کی رات

(۱۰۶۰) ہائے مجھے اپنے رونے پر کچھ اختیار نہیں ہے۔ (میں اسے بند نہیں کر سکتا) اور یہی رونا مجھے تیری مجلس سے نکالے ڈالتا ہے۔

(۱۰۶۱) گمان رنجش خاطر۔ یعنی یہ وہم کہ دل میں عشاق کے رنجش یا غبار ہے۔ حالانکہ عشاق تو ایسی مٹی کے بنے ہیں کہ اس میں غبار کہاں (صاف شعر ہے)

(۱۰۶۲) لغت۔ دل سے اُٹھا۔ یعنی اپنے دل سے حاصل کر۔ جلوہ ہائے معانی۔ حقیقت کے طرح طرح کے جلوے۔ غیر گل۔ بغیر پھول کے۔ آئینہ بہار موسم بہار کو ایک آئینہ فرض کر لیا ہے۔ جس میں پھولوں کی تصویر دکھائی دیتی ہے۔

حل۔ تو شاہدان معانی کے جلووں کا لطف اپنے دل سے اُٹھا (یعنی حقیقت کے رازوں کا لطف) کیونکہ آئینہ بہار یعنی بہار کی حقیقت بغیر پھول کے اور کچھ نہیں ہوا کرتی۔

(۱۰۶۳) لغت۔ بارے۔ یعنی خدا کا شکر ہے۔

حل۔ بارے تو نے میرے قتل کرنے کا اقرار کر لیا ہے۔ لیکن اگر یہ اقرار استوار یعنی سچا ثابت نہوا۔ تو سخت افسوس حاصل ہوگا۔

(۱۰۶۴) اے غالب تو نے قسم کھائی ہے۔ کہ پھر شراب نہیں پیوں گا۔ مگر تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے۔ کیونکہ شرابی ایسی جھوٹی قسمیں اکثر کھایا کرتے ہیں۔

غزل

ہجوم غم سے یاں تک سر نگونی مجھکو حاصل ہے (۱۰۶۵)
کہ تار دامن و تار نظر میں فرق مشکل ہے

(۱۰۶۶) رفوئے زخم سے مطلب ہے لذت زخم سوزن کی
سمجھیو مت کہ پاس درد سے دیوانہ غافل ہے
وہ گل جس گلستاں میں جلوہ فرمائی کرے غالب
چٹکنا غنچۂ گل کا صدائے خندۂ دل ہے (۱۰۶۷)

(۱۰۶۵) لغت۔ سر نگونی۔ سر کا نیہوڑا دینا۔

حل۔ غم کی کثرت سے مجھے اس قدر اکڑوں ہو کے یا سر نیہوڑا کے بیٹھنا پڑتا ہے۔ کہ میری آنکھوں کی نظر کا تار گویا اپنے دامن کو دیکھتے دیکھتے اسی میں پھنس کے رہ گیا ہے۔ اور تارِ دامن اور تارِ نظر میں فرق کرنا مشکل ہو گیا ہے۔

(۱۰۶۶) میں جو دیوانہ اور غافل دکھائی دیتا ہوں۔ اسقدر بیوقوف بھی نہیں ہوں کہ لذت زخم ہی سے بے خبر ہو گیا ہوں۔ لہذا اپنے زخم کو رفو کرا رہا ہوں۔ یعنی جراح سے اسے سلوا رہا ہوں۔ تاکہ مجھے جراح کی سوئی کے زخم سینے کی لذت حاصل ہو۔ مگر تم سمجھتے ہو کہ میں زخم اچھا کرانے کی نیت سے اسے سلوا رہا ہوں۔ نہیں۔ میں دیوانہ سہی۔ مگر درد اور تکلیف پہنچنے کے خیال سے ہرگز غافل نہیں ہوں۔ (عشاق ایذا دوست ہوا کرتے ہیں)

(۱۰۶۷) اے غالب وہ گل (محبوب نازنین) جس باغ میں جلوہ فرمائی کرے یعنی اپنا جلوہ دکھاوے۔ پھول کی کلی کا کھلنا۔ گویا (باغ کے) دل کی ہنسی کی صدا ہے۔ یعنی باغ اس کو دیکھکر خوش ہو جاتا ہے۔

غزل

پابدامن ہو رہا ہوں اسقدر میں صحرا نورد (۱۰۶۸)
خار پا ہیں جوہر آئینۂ زانو مجھے

دیکھنا حالت مرے دل کی ہم آغوشی کے وقت (۱۰۶۹)
ہے نگاہ آشنا تیرا سر ہر مو مجھے

ہوں سراپا ساز آہنگ شکایت کچھ نہ پوچھ (۱۰۷۰)
ہے یہی بہتر کہ لوگوں میں نہ چھیڑے تو مجھے

(۱۰۶۸) پابدامن ہونا۔ اپنا پاؤں دامن میں ڈال کے تھک کر بیٹھ جانا۔ آئینہ زانو۔ عموماً شعرا زانو کو آئینہ سے نسبت دیا کرتے ہیں۔
حل۔ میں جنگلوں میں پھرنے والا دامن میں پاؤں ڈال کے تھک کر بیٹھ رہا ہوں۔ میرے پاؤں کے کانٹے (جو مجھے جنگل میں چبھے تھے) میرے آئینہ زانو کے جوہر بن گئے ہیں۔ مراد یہ کہ پاؤں کے کانٹے اتنے لمبے تھے۔ کہ گویا وہ زانو کے برابر بلند ہو گئے نصیر کا ایک شعر ہے۔ کہ مجنوں کے متعلق ہے۔ ؎

جسے تم سینگ سمجھے ہو یہ ہیں خار
لگے ہیں پاؤں میں نکلے ہیں سر سے

(۱۰۶۹) تیرے ساتھ بغلگیر ہوتے وقت میرے دل کی حالت قابل دید ہو گئی۔ کہ میں یہ سمجھا کہ تو اس قدر مجھ پہ مہربان ہو گیا ہے۔ کہ گویا تیرے جسم کے ہر بال کا منہ ایک نگاہ آشنا یعنی نگاہ لطف بن گئی ہے۔ چونکہ نظر بال سے تیز ہوا کرتی ہے۔ اسکو سر مو سے تشابہ دیا ہے۔

(۱۰۷۰) لغت۔ ساز۔ باجا۔ آہنگ۔ راگ۔
حل۔ میں سرتاپا شکایتوں کے راگ کا باجا ہوں۔ اس کی بابت کچھ نہ پوچھ۔ یہی بہتر ہے۔ کہ تو مجھکو لوگوں میں نہ چھیڑے۔ ورنہ سب کے سامنے تیری شکایتیں کروں گا۔ تو تو بدنام ہوگی۔

غزل

جس بزم میں تو نازسے گفتار میں آوے (۱۰۷۱)
جاں کالبد صورت دیوار میں آوے

(۱۰۷۲) سایہ کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر
تو اس قد دلکش سے جو گلزار میں آوے

تب ناز گراں مائگی اشک بجا ہے (۱۰۷۳)
جب لخت جگر دیدۂ خونبار میں آوے

(۱۰۷۴) دے مجھکو شکایت کی اجازت کہ ستمگر
کچھ تجھکو مزا بھی مرے آزار میں آوے

اس چشم فسونگر کا اگر پائے اشارہ (۱۰۷۵)
طوطی کی طرح آئینہ گفتار میں آوے

(۱۰۷۶) کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب
اک آبلہ پا وادیٔ پُرخار میں آوے

مر جاؤں نہ کیوں رشک سے جب وہ تن نازک (۱۰۷۷)
آغوش خم حلقۂ زنار میں آوے

(۱۰۷۸) غارت گر ناموس نہ ہو گر ہوسِ زر
کیوں شاہدِ گل باغ سے بازار میں آوے

تب چاک گریباں کا مزا ہے دلِ نالاں (۱۰۷۹)
جب اک نفس اُلجھا ہوا ہر تار میں آوے

(۱۰۸۰) آتش کدہ ہے سینہ مرا رازِ نہاں سے
اے وائے اگر معرضِ اظہار میں آوے

گنجینۂ معنی کا طلسم اُس کو سمجھیے (۱۰۸۱)
جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آوے

(۱۰۷۱) لغت۔ کالبد۔ وجود۔ تن بدن۔

حل۔ جس محفل میں تو ناز و انداز سے گفتگو کرے۔ تو تیری بات کا یہ اثر ہوتا ہے۔ کہ در و دیوار جیسی بیجان چیز کی شکل و صورت میں بھی جان یا زندگی کے آثار نمایاں ہو جاتے ہیں۔

(۱۰۷۲) سرو اور صنوبر جو ایک قسم کا سرو ہوتا ہے۔ وہ سب سائے کی طرح تیرے ساتھ ساتھ ہی پھریں۔ اگر تو اس دلکش قد و قامت کے ساتھ (کہ جو تو رکھتا ہے۔) باغ میں سیر کو آئے۔

(۱۰۷۳) لغت۔ گراں مائگی۔ قیمتی سرمایہ۔

حل۔ جب جگر کے ٹکڑے لہو رونے والی آنکھوں میں بھر جائیں۔ تو اشکوں کے ایسے قیمتی سرمایہ پر فخر کرنا بجا ہے۔ (لہو کے قطرے ایک لعل کی مانند سرخ سرخ ہوا کرتے ہیں۔ اس لئے وہ قیمتی ہیں)

(۱۰۷۴) اے ظالم تو مجھکو شکایت کرنے کی اجازت دے۔ تاکہ ایسے

پُر درد حالات بیان کروں۔ کہ میرے ستانے میں مجھ کو بھی کچھ مزہ آجائے۔

(۱۰۷۵) اس جادو کرنے والے دوست کی آنکھ کا اگر اشارہ ہی ہو جائے۔ تو آئینہ بھی مثل طوطی کے بولنے لگے۔ یعنی اس کی آنکھ اس قدر سحر کرنے والی ہے۔ مراد اس کا ناز و انداز بے جان اشیاء تک کو موثر کر دیتا ہے۔

(۱۰۷۶) مارے پیاس کے کانٹوں کی زبان جنگل میں خشک ہو گئی۔ یارب ایک (دیوانہ) جس کے پاؤں میں آبلے ہوں۔ وہ کانٹوں بھری وادی میں آنکلے۔ (تاکہ اس کے آبلوں سے کانٹوں کا حلق تر ہو جائے)

(۱۰۷۷) میں رشک سے کیوں نہ مر جاؤں۔ جب کہ وہ نازک بدن زنار کے حلقے کے خم کی بغل میں آگیا ہے۔ یعنی وہ جنیو پہنے ہوئے اور جنیو کی بغل میں ہے۔

(۱۰۷۸) لغت۔ شاہدِ گل۔ پھول کو رنڈی یا معشوق قرار دیا ہے

حل۔ اگر دولت کی ہوس عزت کو غارت کرنے والی نہ ہو۔ تو وہ پھول جو معشوق یا رنڈی کی طرح ہے۔ کیوں بکنے کے لئے بازار میں آئے۔

(۱۰۷۹) اے فریادی دل گریبان پھاڑنے کا جب مزا ہے۔ کہ گریبان کے ہر تار میں ایک سانس بھی اُلجھ کر نکلے۔ یعنی اس کثرت سے آہیں بھرو کہ جتنے کپڑے میں دھاگے ہوا کرتے ہیں۔

(۱۰۸۰) میرا سینہ پوشیدہ رازوں کی گرمی سے گویا آتشکدہ بن گیا ہے۔ افسوس اگر یہ راز آشکارا ہو جائیں۔ یعنی معرض اظہار میں آئیں تو کیا جانے کس کس کا جور و ستم جو مجھ پر کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہو کر کون کون گرفتار مصیبت ہو۔

(۱۰۸۱) جو جو لفظ میرے اشعار میں مستعمل ہوا ہے۔ اُس کو معنی کے خزانے کا طلسم سمجھیے۔ طلسم اس لئے کہ جادو جس طرح پُر اثر ہوتا ہے۔ اُس کی حقیقت سے عوام الناس کم واقف ہوا کرتے ہیں۔ ایسے غالب کے اشعار کے معنی و مفہوم سے لوگ بہت کم آشنا ہیں۔

غزل

(۱۰۸۲) حسن مہ گرچہ بہنگام کمال اچھا ہے
اس سے میرا مہ خورشید جمال اچھا ہے

(۱۰۸۳) بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ
جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے

(۱۰۸۴) اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
ساغر جم سے مرا جام سفال اچھا ہے

(۱۰۸۵) بے طلب دیں تو مزہ اس میں سوا ملتا ہے
وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے

(۱۰۸۶) اُنکے دیکھے سے جو آتی ہے منھ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

(۱۰۸۷) دیکھیے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

(۱۰۸۸) ہم سخن تیشہ نے فرہاد کو شیریں سے کیا
جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال اچھا ہے

(۱۰۸۹) قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے
کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے

(۱۰۹۰) خضر سلطاں کو رکھے خالق اکبر سرسبز
شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

(۱۰۹۱) ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

(۱۰۸۲) چاند کا حسن جبکہ وہ اپنے کمال کے وقت میں ہو۔ یعنی چودھویں رات کا چاند ہو۔ اچھا ہوتا ہے۔ مگر اس سے بھی میرا وہ چاند یعنی محبوب جس کا جمال آفتاب کی طرح روشن ہے۔ زیادہ اچھا ہے۔

(۱۰۸۳) بوسہ تو دیتے نہیں۔ اور ہردم میرے دل پر (اس کو چھیننے کے لئے) نگاہ جمائے ہوئے ہیں۔ اور دل میں خیال کرتے ہیں۔ کہ اگر بوسہ بھی نہ دینا پڑے اور یہ میرا دل مفت ان کو ہاتھ آجائے۔ تو بہت اچھا ہے۔

(۱۰۸۴) ساغر جم۔ جمشید بادشاہ کا پیالۂ شراب۔ جو بہت قیمتی تھا اور جمشید کے بعد پھر کسی کے ہاتھ نہیں لگا۔

حل۔ میرا یہ جام سفال (مٹی کا پیالہ) جمشید بادشاہ کے شراب کے پیالے سے زیادہ اچھا ہے کیونکہ میرا یہ کوزہ اگر ٹوٹ جائے۔ تو بازار سے آسکتا ہے۔ حالانکہ ساغر جمشید تو اب کہیں دستیاب ہی نہیں ہو سکتا۔ (مراد یہ کہ غربا اپنی ضرورتیں بآسانی رفع کر سکتے ہیں۔ حالانکہ امیروں کی وہی ضرورتیں بہت وقت طلب ہوا کرتی ہیں)

(۱۰۸۵) اگر فقیر کو بلا اس کے سوال کے کچھ دیں۔ تو یہ امر زیادہ لطف دیتا ہے۔ کیونکہ یہ اس خیال پر مبنی ہوتا ہے۔ کہ غریب کی مدد کرنی چاہیئے۔ اور جب اپنا ایسا خیال پورا ہوا۔ تو ہمارا خوش ہونا ضروری بات ہے۔ اسی طرح جو فقیر گدائی کی عادت نہ رکھتا ہو۔ اور توکل بر خدا بیٹھ رہے۔ وہ بھی اچھا ہوتا ہے۔ بہ نسبت اس حریص و طامع فقیر کے جو سوال کر کر کے تنگ کردیا کرتا ہے۔

(۱۰۸۶) اُن کے دیکھنے سے میرے منہ پر خوشی سے جو کچھ سرخی یا رونق آجاتی ہے۔ وہ اس سے یہ سمجھ لیتے ہیں۔ کہ مجھ سے بیمار عشق کا حال پہلے سے کچھ اچھا ہو گیا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

(۱۰۸۷) دیکھئے عشاق اپنے معشوقوں (بتوں) سے کیا فیض (فائدہ) حاصل کرتے ہیں۔ کیونکہ ایک برہمن نے جوتش لگا کر بتایا ہے۔ کہ اب کا سال بہت اچھا رہیگا۔ (چونکہ عاشق کے لئے۔ وہی سال اچھا ہوتا ہے کہ اس کا معشوق اس پر مہربان ہو۔ اسی واسطے مصرعہ اول میں اس کا اشارہ کیا ہے)

(۱۰۸۸) لغت۔ ہم سخن کرنا۔ آپس میں گفتگو کرانا۔

حل۔ شیریں ایک متمول عورت تھی۔ اور فرہاد ایک مزدور پیشہ کوہکن تھا۔ فرہاد کے تیشہ نے فرہاد کی شیریں سے بات چیت کرادی۔ (کیونکہ فرہاد میں پہاڑ کاٹنے کا یہ کمال پایا جاتا تھا۔ کہ اس کا نام ہی کوہکن قرار دیا تھا۔) لہذا انسان میں خواہ کسی طرح کا کمال ہو۔ اچھا ہوتا ہے۔

(۱۰۸۹) قطرہ اگر دریا میں مل جائے۔ تو وہ بھی دریا بن جاتا ہے گویا قطرہ کا یہ انجام اُس کے حق میں بہتر ہوا کرتا ہے۔ ورنہ اگر وہ دریا میں نہ ملے تو ایک کمزور اور ناچیز قطرۂ آب ہوتا ہے۔ کہ جس کی کچھ وقعت نہیں ہوتی۔ لہذا جس کام کا مآل (انجام) اچھا ہو۔ وہی کام بہتر ہوتا ہے۔

(۱۰۹۰) خالق اکبر (سب سے بڑا پیدا کرنے والا یعنی) خدا۔ خضر سلطان کو سرسبز اور سلامت رکھے۔ کیونکہ بادشاہ دہلی (بہادر شاہ ظفر) کے باغ مراد خاندان میں یہ تازہ نہال یا نوپود بہت اچھا نوجوان ہے۔ (شاہزادہ خضر سلطان بہادر شاہ بادشاہ کے ایک فرزند تھے)

(۱۰۹۱) اے غالب ہم کو جنت کی ساری حقیقت معلوم ہے۔ لیکن ہم اس پر کچھ زیادہ کہنا نہیں چاہتے۔ صرف اتنا بتائے دیتے ہیں کہ (ان زاہدوں کے) دلوں کو خوش رکھنے کے لئے (کہ جنت میں ان کو حوریں ملینگی) بہت اچھا خیال ہے۔

غالب نے اس شعر میں اہل شرح کی اس ظاہرداری پر تمسخر اڑایا گیا ہے۔ جو خیال کیا کرتے ہیں۔ کہ بہشت میں سچ مچ حوریں ہونگی۔ اور وہاں یہ لوگ عیش مزے کیا کریں گے۔ حالانکہ اسلام کے بعض فرقوں کے نزدیک اسطرح بہشت محض ہوس رانی کے لئے نہیں بنایا گیا۔ اور یہی غالب کا نکتہ نظر ہے۔

غزل

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی (۱۰۹۲)
امتحاں اور بھی باقی ہو تو یہ بھی نہ سہی

(۱۰۹۳) خار خارِ الم حسرتِ دیدار تو ہے
شوق گلچینِ گلستانِ تسلی نہ سہی

مے پرستاں خمِ مے منہ سے لگائے ہی بنے (۱۰۹۴)
ایک دن گر نہ ہوا بزم میں ساقی نہ سہی

(۱۰۹۵) نفسِ قیس کہ ہے چشم و چراغِ صحرا
گر نہیں شمعِ سیہ خانۂ لیلیٰ نہ سہی

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق (۱۰۹۶)
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

(۱۰۹۷) نہ ستایش کی تمنا نہ صلے کی پرواہ
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

عشرتِ صحبتِ خوباں ہی غنیمت سمجھو (۱۰۹۸)
نہ ہوئی غالبؔ اگر عمرِ طبیعی نہ سہی

(۱۰۹۲) لغت۔ امتحان۔ یہاں مراد عاشق نے محبوب کے ساتھ وفا کرنے میں جان تک دینے میں دریغ نہ کیا۔ تو گویا اُس کی سچی محبت کا یہ امتحان ہو گیا۔ یعنی امتحانِ وفا صادق نکلا۔

حل۔ اگر میرے مرنے سے آپ کی تسلی نہیں ہوئی۔ اور آپ کا یہ خیال ہے۔ کہ میں امتحانِ وفا میں پورا نہیں اترا۔ اور ابھی اور امتحان لینا باقی ہے۔ تو جان حاضر ہے۔ امتحانِ وفا کیجئے۔ میں تو پہلے آپ پر مرتا ہوں۔ ویسا ہی ہمیشہ مرتا رہوں گا۔

(۱۰۹۳) اُس کے دیدار کی حسرت کے سبب۔ جو میرے دل میں

کانٹے سے چبھ رہے ہیں۔ یہی غنیمت ہیں۔ اگر میرا شوق محبوب تسلی کے باغ کا گلچیں (پامال) نہ ہوا۔ یعنی اگر میں دوست کا وصال نہ حاصل کر سکا تو کم از کم اس کے عشق کی تکلیفات تو مجھے حاصل ہیں۔ پس وصال بھی کبھی نہ کبھی نصیب ہو جائیگا۔

(۱۰۹۴) اے مے کے پینے والو۔ صراحیِ شراب کو آخر منہ لگانا ہی پڑا۔ اچھا ایک دن محفل میں ساقی نہ ہوا۔ (اور اس کے سبب شراب کے پیالے بھی نہ ہوئے) تو نہ سہی۔ آخر کسی طرح شراب تو پی لی۔

(۱۰۹۵) اس شعر کی یوں نثر کیجئے۔ نفسِ قیس (جو چشم و چراغِ صحرا ہے) اگر شمعِ سیاہ خانۂ لیلیٰ نہ ہوا۔ تو نہ سہی۔ یعنی مجنوں کا دم دشتِ نجد کے لئے بڑا غنیمت ہے۔ اگر وہ لیلیٰ کے سیاہ رنگ کے خیمے کا چراغ نہ بنا تو نہ سہی۔ گویا مجنوں تو اب اس کی بھی پرواہ نہیں کرتا۔ کہ ضرور لیلیٰ اسے پاس بلائے۔ وہ تو دیوانہ وار پھرنا ہی پسند کرتا ہے۔

(۱۰۹۶) ہنگامہ۔ ہجوم۔ رونق۔ مجمع۔

حل۔ گھر کی رونق ایک ہنگامہ۔ یا ہجوم پر منحصر ہے یعنی کوئی مجمع رہے۔ اور کچھ نہ کچھ ہوتا رہے۔ یعنی خوشی کی کسی تقریب کے سبب اگر باجہ نہ بجتا ہو۔ تو نہ سہی۔ غم کا نوحہ یعنی صفِ ماتم ہی بچھی ہوئی اچھی ہے۔ کہ چار آدمی جمع ہو کر ایک دوسرے کے دل کی بات تو سن لیں گے۔

(۱۰۹۷) مجھکو یہ خیال نہیں ہے۔ کہ کوئی میرے شعروں کی

تعریف کرے۔ نہ ان شعروں کا معاوضہ یا ان کی داد کسی سے مانگتا ہوں۔ اگر ان شعروں میں معنی نہیں ہیں۔ (کیونکہ یہ بہت مشکل ہیں۔ اور لوگ ایسا ہی خیال کرتے ہیں) تو مجھے کچھ اس کی پرواہ نہیں ہے۔

(۱۰۹۸) عموماً کہا کرتے ہیں کہ عیش و عشرت میں پڑ کر انسان جوانی ہی میں گزر جاتا ہے۔ اور عمر طبعی جو اندازاً سو برس کی ہوتی ہے۔ نہیں حاصل کرتا۔ اسی خیال کے متعلق کہتا ہے۔ کہ حسینوں کے ساتھ صحبت رکھنے کی ناپائیدار خوشی ہی غنیمت سمجھو۔ اے غالب اگر تم کو عمر طبعی (اس عیش کے مضر اسباب کی وجہ سے) نہیں حاصل ہوئی۔ تو نہ سہی۔ خوشی کا ایک دم ہی بہت ہے

غزل

عجب نشاط سے جلاد کے چلے ہیں ہم آگے (۱۰۹۹)
کہ اپنے سایہ سے سر پاؤں سے ہے دو قدم آگے

(۱۱۰۰) قضا نے تھا مجھے چاہا خراب بادۂ اُلفت
فقط خراب لکھا بس نہ چل سکا قلم آگے

غم زمانہ نے جھاڑی نشاط عشق کی مستی (۱۱۰۱)
وگرنہ ہم بھی اُٹھاتے تھے لذت الم آگے

(۱۱۰۲) خدا کے واسطے داد اس جنون شوق کی دینا
کہ اُس کے در پہ پہنچتے ہیں نامہ بر سے ہم آگے

یہ عمر بھر جو پریشانیاں اُٹھائی ہیں ہم نے (۱۱۰۳)
تمہاری آئیو اے طرہ ہائے خم بہ خم آگے

(۱۱۰۴) دل و جگر میں پر افشاں جو ایک موجۂ خوں ہے
ہم اپنے زعم میں سمجھے ہوئے تھے اُس کو دم آگے

قسم جنازہ پہ آنے کی میرے کھاتے ہیں غالب (۱۱۰۵)
ہمیشہ کھاتے تھے جو میری جان کی قسم آگے

(۱۰۹۹) ہم جلاد (یا قاتل) کے آگے آگے عجب طرح کی خوشی کے ساتھ (اپنے قتل ہونے کو) گئے۔ کہ ہمارے سر کا جو سایہ زمین پر پڑا۔ تو اُس سے بھی ہمارا سر آگے تھا۔ اور یوں وہ پاؤں سے بھی گویا دو قدم آگے رہا تھا۔ (حالانکہ چلتے وقت سر کبھی پاؤں کے آگے نہیں چل سکتا۔ کیونکہ سر تو پاؤں ہی کے سہارے پر کھڑا ہے۔ مگر شوق قتل کے سبب سر ہم سے اسقدر آگے بڑھا چلا جا رہا ہے)

(۱۱۰۰) خراب اور خراب بادۂ الفت میں بہت فرق ہے۔ یعنی خراب تو ہر طرح کا بدمعاش۔ لچہ۔ لفنگا۔ بدچلن آدمی مراد لی جا سکتی ہے حالانکہ خراب بادۂ الفت وہ شخص کہ صرف دوسروں کے عشق میں مبتلا ہو کے خراب و خستہ حال ہو گیا ہو۔ تو اس سے اہل قوم کو تو کچھ نقصان نہیں پہنچتا۔ مگر "خراب آدمی" قوم کے حق میں سخت مضر ہوتا ہے۔

حل۔ قدرت نے مجھے (لوح قدرت میں) خراب بادۂ اُلفت لکھنا چاہا تھا۔ مگر صرف خراب کا لفظ میرے نام کے آگے لکھکر اس کا وہ قلم رک گیا۔ (گویا میں خراب ہوں۔ تو یہ قدرت ہی کی غلطی ہے اس میں میرا کیا قصور ہے۔)

(۱۱۰۱) لغت۔ لذت الم۔ یعنی عشق میں جو دُکھ درد کہ اُٹھاکے

تعریف کرے۔ نہ ان شعروں کا معاوضہ یا ان کی داد کسی سے مانگتا ہوں۔ اگر ان شعروں میں معنی نہیں ہیں۔ (کیونکہ یہ بہت مشکل ہیں۔ اور لوگ ایسا ہی خیال کرتے ہیں) تو مجھے کچھ اس کی پرواہ نہیں ہے۔

(۱۰۹۸) عموماً کہا کرتے ہیں کہ عیش و عشرت میں پڑ کر انسان جوانی ہی میں گزر جاتا ہے۔ اور عمر طبعی جو اندازاً سو برس کی ہوتی ہے۔ نہیں حاصل کرتا۔ اسی خیال کے متعلق کہتا ہے۔ کہ حسینوں کے ساتھ صحبت رکھنے کی ناپائیدار خوشی ہی غنیمت سمجھو۔ اے غالب اگر تم کو عمر طبعی (اس عیش کے مضر اسباب کی وجہ سے) نہیں حاصل ہوئی۔ تو نہ سہی۔ خوشی کا ایک دم ہی بہت ہے

غزل

عجب نشاط سے جلاد کے چلے ہیں ہم آگے (۱۰۹۹)
کہ اپنے سایہ سے سر پاؤں سے ہے دو قدم آگے

(۱۱۰۰) قضا نے تھا مجھے چاہا خراب بادۂ الفت
فقط خراب لکھا بس نہ چل سکا قلم آگے

غم زمانہ نے جھاڑی نشاط عشق کی مستی (۱۱۰۱)
وگرنہ ہم بھی اٹھاتے تھے لذت الم آگے

(۱۱۰۲) خدا کے واسطے داد اس جنون شوق کی دینا
کہ اس کے در پہ پہنچتے ہیں نامہ بر سے ہم آگے

یہ عمر بھر جو پریشانیاں اٹھائی ہیں ہم نے (۱۱۰۳)
تمہاری آئیو اے طرہ ہائے خم بہ خم آگے

(۱۱۰۴) دل و جگر میں پرافشاں جو ایک موجۂ خوں ہے
ہم اپنے زعم میں سمجھے ہوئے تھے اس کو دم آگے

قسم جنازہ پہ آنے کی میرے کھاتے ہیں غالب (۱۱۰۵)
ہمیشہ کھاتے تھے جو میری جان کی قسم آگے

(۱۰۹۹) ہم جلاد (یا قاتل) کے آگے آگے عجب طرح کی خوشی کے ساتھ (اپنے قتل ہونے کو) گئے۔ کہ ہمارے سر کا جو سایہ زمین پر پڑا۔ تو اس سے بھی ہمارا سر آگے تھا۔ اور یوں وہ پاؤں سے بھی گویا دو قدم آگے رہا تھا۔ (حالانکہ چلتے وقت سر کبھی پاؤں کے آگے نہیں چل سکتا۔ کیونکہ سر تو پاؤں ہی کے سہارے پر کھڑا ہے۔ مگر شوق قتل کے سبب سر ہم سے اسقدر آگے بڑھا چلا جا رہا ہے)

(۱۱۰۰) خراب اور خراب بادۂ الفت میں بہت فرق ہے۔ یعنی خراب تو ہر طرح کا بدمعاش۔ لچا۔ لفنگا۔ بدچلن آدمی مراد لی جا سکتی ہے حالانکہ خراب بادۂ الفت وہ شخص کہ صرف دوسروں کے عشق میں مبتلا ہو کے خراب و خستہ حال ہو گیا ہو۔ تو اس سے اہل قوم کو تو کچھ نقصان نہیں پہنچتا۔ مگر "خراب آدمی" قوم کے حق میں سخت مضر ہوتا ہے۔

حل۔ قدرت نے مجھے (لوح قدرت میں) خراب بادۂ الفت لکھنا چاہا تھا۔ مگر صرف خراب کا لفظ میرے نام کے آگے لکھ کر اس کا وہ قلم رک گیا۔ (گویا میں خراب ہوں۔ تو یہ قدرت ہی کی غلطی ہے اس میں میرا کیا قصور ہے۔)

(۱۱۰۱) لغت۔ لذت الم۔ یعنی عشق میں جو دکھ درد دکھ اٹھا کے

انسان کا دل مزا حاصل کرتا ہے۔

حل۔ دنیا کے رنج و غم نے عشق کے نشے کی خوشی سب جھاڑ دی۔ یعنی ہم سے چھڑا دی۔ ورنہ ہم بھی عشق کے دکھوں کی لذت شوق سے برداشت کیا کرتے تھے۔ مراد یہ کہ غم روزگار میں عشق کا سب نشہ ہرن ہو گیا۔

(۱۱۰۲) خدا را اس جنون شوق کی کہ ہمارا خط فوراً دوست تک پہنچ جائے۔ داد دیجئے۔ کہ ابھی نامہ بر بھی ہمارا خط لے کے در یار تک نہیں پہنچتا۔ کہ ہم اس سے پیشتر ہی وہاں جا پہنچتے ہیں۔

(۱۱۰۳) لغت۔ تیرے آگے آئے۔ ایک محاورہ ہے۔ جس کا مطلب یہ کہ تو نے جو بے انصافی یا ظلم مجھ پر کیا ہے۔ اس کے بدلے تجھ کو بھی ایسا ہی ظلم کسی اور کے ہاتھ سے اٹھانا پڑے۔

حل۔ اے طرہ ہائے خم بہ خم۔ یعنی زلف کے پیچ در پیچ نوکدار بالو ہم نے تمھارے ہاتھوں سے جو عمر بھر پریشانیاں اٹھائی ہیں۔ یہ پریشانیاں تمھارے آگے آئیں۔ مطلب یہ کہ معشوق کو کنایہ سے کہتا ہے۔ کہ جو ظلم تو نے مجھ پر کیا ہے۔ رقیب کے ہاتھ سے ویسا ہی ظلم تجھ پر بھی نازل ہو۔

(۱۱۰۴) لغت۔ پرافشاں۔ پروں کو ڈالے ہوئے یعنی پھیلائے ہوئے۔ جیسے کہ چیل پر پھیلائے اڑتی ہے۔ موجہ خون۔ خون کی لہر۔

حل۔ ہم اپنے قیاس میں جس چیز کو اپنا دم سمجھے ہوئے تھے وہ سانس دراصل ایک خون کی لہر ہے۔ جو کہ دل و جگر کے درمیان خوب پھیل کر چل رہی ہے۔ (چونکہ سانس لینا جگر سے متعلق ہوتا ہے اس لئے کہتا ہے۔ کہ وہ سانس اب ہوا نہیں رہا۔ غم کا خون بن گیا ہے۔ جو بطور سانس اب عاشق کے سینہ سے باہر آتا ہے)

(۱۱۰۵) لغت۔ جان کی قسم کھانا۔ مثلاً یہ کہنا۔ تیری جان کی قسم۔ اس سے یہ مراد کہ تیری جان مجھ کو ایسی عزیز ہے۔ کہ میں اس کی سلامتی ہمیشہ چاہتا ہوں۔ اسی طرح کہا کرتے ہیں۔ مجھکو بیٹے کی قسم۔

حل۔ اب وہ دوست جو میری زندگی میں میری جان کی قسم کھایا کرتا تھا۔ (یعنی اس قدر مجھے چاہتا تھا۔) اب میرے مرنے کے بعد میرے جنازے پر بھی آنے کی قسم کھاتا ہے۔ یعنی ہرگز ہرگز آنا نہیں چاہتا۔ (گویا طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لی ہیں۔)

غزل

(۱۱۰۶) شکوے کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے
یہ بھی مت کہہ کہ جو کہیئے تو گلا ہوتا ہے

(۱۱۰۷) پر ہوں میں شکوے سے یوں راگ سے جیسے باجہ
اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

(۱۱۰۸) گو سمجھتا نہیں پر حسن تلافی دیکھو
شکوۂ جور سے سرگرم جفا ہوتا ہے

(۱۱۰۹) عشق کی راہ میں ہے چرخ مکوکب کی وہ چال
سست رو جیسے کوئی آبلہ پا ہوتا ہے

(۱۱۱۰) کیوں نہ ٹھہریں ہدف ناوک بیداد کہ ہم
آپ اٹھا لاتے ہیں گر تیر خطا ہوتا ہے

(۱۱۱۱) خوب تھا پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ
کہ بھلا چاہتے ہیں اور برا ہوتا ہے

نالہ جاتا تھا پرے عرش سے میرا اور اب (۱۱۱۲)
لب تک آتا ہے جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے

(۱۱۰۳) خامہ میرا کہ وہ ہے بار بد بزم سخن
شاہ کی مدح میں یوں نغمہ سرا ہوتا ہے

اے شہنشاہ کواکب سپہ و مہر علم (۱۱۱۴)
تیرے اکرام کا حق کس سے ادا ہوتا ہے

(۱۱۱۵) سات اقلیم کا حاصل جو فراہم کیجے
تو وہ لشکر کا ترے نعل بہا ہوتا ہے

ہر مہینہ میں جو یہ بدر سے ہوتا ہے ہلال (۱۱۱۶)
آستاں پر ترے مہ ناصیہ سا ہوتا ہے

(۱۱۱۷) میں جو گستاخ ہوں آئین غزل خوانی میں
یہ بھی تیرا ہی کرم ذوق فزا ہوتا ہے

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف (۱۱۱۸)
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

(۱۱۰۶) وہ بے وفا دوست چونکہ گلے شکوہ کا نام ہی سنکر خفا ہو جاتا ہے۔ تو تجھ کو یہ بات بھی (گو معمولی سی ہے۔ کہ وہ شکوہ کا بُرا مناتا ہے) ہرگز منہ سے نہیں نکالنی چاہئے۔ کیونکہ آخر یہ کہنا بھی تو ایک طرح کا شکوہ ہے۔

(۱۱۰۷) لغت۔ چھیڑنا۔ کسی سڑی آدمی کو کوئی بات اُس کے خلاف طبع کہکر پھر بات پر بات اُس کے مُنہ سے سننا اور اُسے تنگ کرنا۔

حل۔ مجھے ایک ذرا چھیڑ دیجئے۔ (مثلاً یہ کہدیجئے کہ ہاں غالب دوست نے تیرے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہ کیا۔) تو پھر دیکھئے کہ میں شکوہ شکایت سے اس طرح لبریز ہوں گا۔ جیسے کہ راگ سے باجا بھرا ہوتا ہے کہ ذرا چھیڑا تو بجنے لگتا ہے۔

(۱۱۰۸) مومن کا ایک شعر ہے سے
اگر غفلت سے باز آیا جفا کی
تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

یہی مضمون غالب کے اس شعر میں بندھا ہے۔ دراصل جور یا ستم کرنا انصاف کے برعکس عمل کرنا ہے۔ اور جفا کا عمل، وفا کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔ جور تو یہ ہے۔ کہ عاشق بتقاضائے فطرت معشوق سے محبت کرتا ہے۔ اور وہ معشوق اس کی محبت پر اُسے قتل کر دیتا ہے۔ بجائے اس کے کہ اس سے کچھ انصاف کرے۔ اور جفا یہ کہ عاشق جس جس طرح شوق عشق میں تکلیفیں اُٹھاتا ہے معشوق اس طرح اُس سے وفا نہیں کرتا۔ یعنی اسی طرح عاشق کے لئے کوئی تکلیف گوارا نہیں کرتا۔ حُسن تلافی۔ کسی کا نقصان پورا کرنا۔

حل۔ میں نے دوست سے اُس کے ستم کا گلہ شکوہ کیا۔ تو وہ اگرچہ یہ بات سمجھ نہ سکا۔ کہ ترک ستم کیونکر کیا جاتا ہے اس نے میرے کہنے سننے پر ایسا کر تو دیا۔ مگر حُسن تلافی دیکھو کہ اب ترک جور کرکے وہ سرگرم جفا ہو گیا ہے۔ یعنی جس وقت ہم وفا کرتے ہیں تو وہ جفا کرنے پر تل جاتا ہے۔

(۱۱۰۹) لغت۔ کوکب۔ ستاروں بھرا۔ حل۔ وہ

ستاروں بھرا آسمان (جس میں ہر شخص کی قسمت کے اچھے بُرے ستارے بکثرت موجود ہیں۔) ہمارے عشق کے زمانہ میں ہمارے ساتھ اس قدر شکستہ روی سے کام لیتا ہے۔ کہ جیسے کسی پاؤں میں چھالے پڑے ہوں۔ تو وہ چل نہ سکے۔ (حاصل شعر یہ کہ آسمان کی گردش ہی سے کسی کی قسمت کا ستارہ پھرا کرتا ہے۔ تو جب آسمان شکستہ رو ہو تو پھر قسمت کیا پھرے گی؟)

(۱۱۱۰) ہم کہیں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ تو وہ دوست ہم پر تیر چلانے کی مشق کیا کرتا ہے۔ اب اگر کسی وقت اس کا تیر ہم پر نہ لگے تو ہم اس کا وہ تیر اُٹھا کے اُسے دیدیتے ہیں۔ تاکہ وہ دوبارہ چلائے۔ اور نشانہ کرے۔ تو ظاہر ہے کہ ہم خود ہی اس کے ہدفِ ناوک بیداد بننا چاہتے ہیں۔ یعنی ہر صورت اس کے ظالم تیر کا نشانہ بن کے اُس کے ہاتھ سے تیر کھانا پسند کرتے ہیں۔ مراد یہ کہ خواہ وہ کہیں ہو۔ کسی حال میں ہو۔ ہم دانستہ اُس کے سامنے آجاتے ہیں۔ تاکہ وہ ہم پر اپنے تیر نظر برسائے۔)

(۱۱۱۱) ہم بھلائی کی امید رکھتے ہیں۔ (یعنی اپنے دوست سے) تو ہمیں (اُس کے ہاتھ سے) بُرائی نصیب ہوتی ہے۔ کیا خوب ہوتا۔ جو ہم روزِ اول ہی سے اپنا بُرا چاہتے۔ تو وہ دوست ہماری ضدیت ہمارے ساتھ ضرور بھلائی کرتا۔

(۱۱۱۲) کوکب۔ ستارہ۔ حل۔ میرا نالہ کسی زمانہ میں عرش سے بھی پرے ساتِ آسمان پھاند جاتا تھا۔ اور بابِ اجابت تک اُس کی رسائی ہوتی تھی۔ یعنی اس قدر مقبول ہوتا تھا۔ اب ضعفِ دل

سے یہ حالت ہے۔ کہ کوئی ایسا رسا یا دور پہنچنے والا نالہ ہی ایسا ہوتا ہے۔ جو کہ محض میرے ہونٹ تک پہنچتا ہے۔ (مگر آگے نہیں پہنچ سکتا۔ کہ کسی عنبر تک رسائی ہو سکے۔ اور کوئی میری فریاد کو پہنچے)

(۱۱۱۳) قطعہ۔ میرا قلم جو کہ بزم شاعری کا باربد یعنی ایک بڑا گویا ہے وہ بادشاہ کی تعریف میں اس طرح گاتا ہے۔

(۱۱۱۴) اے شہنشاہ جس کی فوج ستاروں کی طرح ہے۔ (کواکب جمع کوکب بہ معنی ستارہ) اور جس کا جھنڈا آفتاب ہے۔ تیری مہربانیوں کا حق کس سے ادا ہو سکتا ہے۔

(۱۱۱۵) سات ملکوں کی پیداوار یا ان کا محاصل اگر جمع کریں۔ تو وہ تیرے لشکر کے گھوڑوں کی نعلبندی کے خرچ کے برابر ہوتا ہے۔

(۱۱۱۶) لغت۔ ناصیہ۔ پیشانی۔ سا۔ سائیدن سے۔ رگڑنے والا۔ ناصیہ سا۔ پیشانی گھسنے والا۔

حل۔ یہ جو ہر مہینے چاند پہلے بدر یعنی پورا چاند ہوتا ہے۔ اور پھر ہلال (آدھا چاند) رہ جاتا ہے۔ یہ اس لئے کہ وہ تیری دہلیز پر اپنی پیشانی گھسا کرتا ہے۔

(۱۱۱۷) تو مجھ پہ بہت مہربانی کرتا ہے۔ تو میرا ذوق غزل خوانی بڑھتا ہے۔ اور اس قدر کہ غزل کے اشعار جن میں محض حُسن و عشق کے خیالات بندھنے چاہئیں۔ میں ایسا گستاخ ہوں کہ ان میں بھی تیری تعریف کے اشعار تصنیف کرکے درج کر دیتا ہوں۔ (یہاں بہادر شاہ بادشاہ دہلی کی طرف خطاب کیا گیا ہے۔ کہ جس کے دربار کا غالب وظیفہ خوار تھا۔)

(۱۱۱۸) یہ چند اشعار جو اس قطعے میں لکھے گئے ہیں۔ ایک قصیدے کی تمہید کے طور پر تھے۔ کہ جو نا تمام رہا۔ لہذا بطور عذر یہ شعر لکھکر اس غزل میں کے قصیدے کا خاتمہ کر دیا ہے۔ کہتا ہے۔ اے غالب مجھکو اس "تلخ نوائی یعنی اس قصیدے کے پورا کرنے کی محنت سے معاف رکھ۔ کیونکہ آج میرے دل میں کوئی سخت غم اُٹھا ہے۔ اور زیادہ لکھ نہیں سکتا۔

غزل

(۱۱۱۹) ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تُو کیا ہے
تمہیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے

(۱۱۲۰) نہ شعلہ میں یہ کرشمہ نہ برق میں یہ ادا
کوئی بتاؤ کہ وہ شوخ تند خو کیا ہے

(۱۱۲۱) یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے
وگرنہ خوف بد آموزیٔ عدو کیا ہے

(۱۱۲۲) چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن
ہماری جیب کو اب حاجت رفو کیا ہے

(۱۱۲۳) جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

(۱۱۲۴) رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

(۱۱۲۵) وہ چیز جس کے لئے ہم کو ہو بہشت عزیز
سوائے بادۂ گلفام مشکبو کیا ہے

(۱۱۲۶) پیوں شراب اگر خُم بھی دیکھ لوں دو چار
یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے

(۱۱۲۷) رہی نہ طاقت گفتار اور اگر ہو بھی
تو کس امید پہ کہئے کہ آرزو کیا ہے

(۱۱۲۸) ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالبؔ کی آبرو کیا ہے

(۱۱۱۹) میری ہر بات پر تم مجھ سے حقارت سے کہتے ہو کہ "تُو کیا ہے" یعنی بے حقیقت سا ایک حقیر آدمی۔ میں پوچھتا ہوں کہ آپ کا یہ بات کرنے کا طریقہ کیسا ہے۔ (کیا آپ کو لازم ہے۔ کہ دوسروں کو "تُو" "تُو" کہو)

(۱۱۲۰) لغت۔ کرشمہ۔ ناز و کرشمہ یا شوخ مزاجی۔ ادا۔ ناز و انداز (نخرے)

حل۔ نہ آگ کے شعلے میں اُس تند خو شوخ محبوب جیسے کرشمے۔ نہ بجلی میں وہ ناز و انداز۔ کوئی مجھے بتائے تو سہی کہ وہ دوست اگر شعلہ یا بجلی نہیں ہے تو پھر کیا ہے۔

(۱۱۲۱) لغت۔ بد آموزی۔ کسی بُری بات کو سکھانا۔ بدراہی کرنا۔ یہاں مراد رقیب کا عاشق کے برخلاف دوست کو بدراہ کرنا۔

حل۔ مجھے یہ رشک ہے۔ کہ وہ (رقیب) تم سے بات چیت کیا کرتا ہے۔ وگرنہ وہ تم کو جو بدراہ کیا کرتا ہے۔ تو مجھے اس بد آموزی یا تمہاری گمراہی سے مطلق کچھ ڈر نہیں ہے۔ (وہ ہزار تمہیں میرے

برخلاف بھڑکایا کرے۔ مجھ کو تو یہ حسد ہے۔ کہ وہ اس بہانے سے تمہارے ساتھ گفتگو ہی کیوں کرتا ہے۔

(۱۱۲۲) جیب۔ یہاں مراد گریبان کی جیب۔ کہتا ہے۔ کہ ہماری جیب گریبان چاک ہو چکی۔ اب اس کو سینے کی کچھ حاجت نہیں رہی۔ کیونکہ پیراہن یعنی ہمارا کرتہ جس طرح لہو کی وجہ سے (جو بدن پر لگا ہوا ہے) ہمارے جسم سے چپک سکتا ہے۔ اسی طرح چاک شدہ گریبان کے ٹکڑے بھی لہو کے ساتھ چپکائے جا سکتے ہیں۔ (مراد یہ کہ میں لہولہان ہو رہا ہوں۔ اسقدر کہ کپڑے بدن سے چپک جاتے ہیں۔)

(۱۱۲۳) جہاں میرا جسم جل کے راکھ ہو گیا ہے۔ (یعنی آتش عشق کی بدولت) وہاں میرا دل بھی اس آگ میں مجسم ہو گیا ہوگا۔ اب تم میری راکھ میں کیوں اس کو کھود کھود کے دیکھ رہے ہو۔ یہ فضول محنت ہے۔ (مراد یہ کہ عشق کا دل جلا ہوں۔ میرا دل اب کہاں رہا ہے کہ گھڑی بھر تمہارے ساتھ ہنسی خوشی کی باتیں کر سکوں)

(۱۱۲۴) خون ہر شخص کی رگوں میں دوڑتا پھرتا ہے۔ مگر ہم اس کے قائل نہیں ہیں۔ یعنی اس کی کچھ قدر و وقعت نہیں کرتے۔ تا وقتیکہ یہ کسی کی آنکھوں سے ٹپکا کرے۔ (جو دو حالتوں میں ہو سکتا ہے۔ غیرت کے سبب یا کمال رنج و غم میں۔ اور یہ باتیں عشق ہی سے حاصل ہوتی ہیں۔ گویا ہر شخص یہاں سچا عاشق نہیں ہے۔ زیادہ تر بوالہوس لوگ ہیں کہ جن کے خون میں کچھ جوش نہیں ہوتا)۔

(۱۱۲۵) لغت۔ بادۂ گلفام مشکبو۔ شراب لال لال گلاب کی رنگت والی۔ جس میں مشک نافہ کی طرح کی خوشبو رچی ہے۔

حل۔ اگر ہم کو بہشت عزیز ہو۔ (یعنی واعظ کو سنا کر کہتا ہے کہ تیرے کہنے کے مطابق ہم اگر بہشت کی خواہش کریں۔) تو وہ چیز جس کی خاطر ہم بہشت کو چاہیں گے۔ بجز "بادۂ گلفام مشکبو" اور کیا ہو سکتی ہے۔ واعظ کہتا تھا۔ کہ بہشت میں شراب طہور ملیگی۔ تو واعظ کی ساری نعمتوں کا غالب نے گویا یہی خلاصہ کر لیا ہے۔ یعنی ایک شراب مشکبو

(۱۱۲۶) میں یہ شیشہ (شراب کی بوتل) قدح (شراب کا پیالہ) کوزہ (شراب کی صراحی) اور سبو (شراب کا گھڑا) کب خیال میں لاتا ہوں میں تو بڑا پینے والا ہوں۔ جب شراب پیتا ہوں۔ تو پہلے دیکھ لیتا ہوں، کہ میرے سامنے شراب کے دو چار خم یا مٹکے بھرے ہوئے رکھدئے گئے ہیں۔ یا کہ نہیں۔ ورنہ میری تسلی نہیں ہوتی۔

(۱۱۲۷) اب تو کسی پر اپنی آرزو ظاہر کرنے کی طاقت گویائی نہیں رہی۔ یعنی مایوسی نے اس قدر ضعیف کر دیا ہے۔ اور اگر یہ طاقت گفتار مجھ میں ہو بھی۔ تو دوست سے تو کسی مقصد براری کی قطعاً امید ہی نہیں ہو سکتی۔ لہذا پھر کس بھروسہ پر ہم اپنی آرزو کا اظہار اس پر کریں۔ (گویا دوست نے اتنا مایوس کر دیا ہے۔ کہ اب اظہار آرزو تک سے بھی پرہیز ہے)

(۱۱۲۸) لغت۔ مصاحب۔ کسی امیر آدمی کی صحبت میں بیٹھا۔ غالب اب بادشاہ کا شریک صحبت یعنی مصاحب بن گیا ہے۔ اور سب پر اسی لئے اکڑتا پھرتا ہے۔ ورنہ اس کی شہر (دہلی) میں عزت ہی کیا ہے۔ مراد یہ کہ ایک طرح بادشاہ کے نوکر ہوئے یہ فخر کیا ہے۔

غزل

(۱۱۲۹) میں اُنھیں چھیڑوں اور کچھ نہ کہیں
چل نکلتے جو مے پیے ہوتے
(۱۱۳۰) قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو
کاش کہ تم مرے لئے ہوتے
(۱۱۳۱) میری قسمت میں غم گر اتنا تھا
دل بھی یارب کئی دئے ہوتے
(۱۱۳۲) آ ہی جاتا وہ راہ پر غالب
کوئی دن اور بھی جئے ہوتے

(۱۱۲۹) میں دوست کو چھیڑوں اور وہ مجھے کچھ نہ کہے۔ یہ تو حیرانی کی بات ہے۔ ہاں آج اس نے شراب نہیں پی رکھی۔ ورنہ نشہ میں کسی کو کیا ہوش رہتا ہے۔ وہ ضرور چل نکلتے۔ یعنی مجھ سے خوب نوک جھونک کرتے۔ اور میری چھیڑ کا جواب دیتے۔

(۱۱۳۰) تم کو کوئی قہر کہتا ہے۔ کوئی بلا بتاتا ہے۔ کاش تم میرے ہی لئے ہوتے۔ یعنی کسی غیر سے ہرگز تعلق نہ رکھتے۔ مراد یہ کہ جو سختی اغیار تمہارے ہاتھ سے نہ اُٹھا سکیں۔ وہ میں بخوشی اُٹھاؤں گا۔ اگر تم میرے دوست بن جاؤ۔

(۱۱۳۱) قدرت پر طعن کرنے کو کہتا ہے۔ کہ اگر اس نے میری قسمت میں اتنا غم لکھا تھا۔ کاش مجھے اس غم کے برداشت کرنے

کے لئے۔ دل بھی تو دو چار دئے ہوتے۔ فقط ایک دل سے کام کیسے چلے۔

(۱۱۳۲) اے غالب وہ دوست تیرے ڈھب کا ہو ہی جاتا۔ بشرطیکہ تیری زندگی کچھ دنوں اور ہوتی۔ مراد یہ کہ غالب مرتا مر گیا۔ مگر دوست نے اُس کے ساتھ وفا نہ کی۔

غزل

(۱۱۳۳) غیر لیں محفل میں بوسے جام کے
ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے
(۱۱۳۴) خستگی کا تم سے کیا شکوہ کہ یہ
ہتھکنڈے ہیں چرخِ نیلی فام کے
(۱۱۳۵) خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے
(۱۱۳۶) رات پی زمزم پہ مے اور صبحدم
دھوئے دھبے جامۂ احرام کے
(۱۱۳۷) دل کو آنکھوں نے پھنسایا کیا مگر
یہ بھی حلقے ہیں تمہارے دام کے
(۱۱۳۸) شاہ کی ہے غسل صحت کی خبر
دیکھئے کب دن پھریں حمام کے
(۱۱۳۹) عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

غزل

میں اُنھیں چھیڑوں اور کچھ نہ کہیں (۱۱۲۹)
چل نکلتے جو مے پئے ہوتے

(۱۱۳۰) قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو
کاش کہ تم مرے لئے ہوتے

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا (۱۱۳۱)
دل بھی یا رب کئی دئے ہوتے

(۱۱۳۲) آ ہی جاتا وہ راہ پر غالبؔ
کوئی دن اور بھی جئے ہوتے

(۱۱۲۹) میں دوست کو چھیڑوں اور وہ مجھے کچھ نہ کہے۔ یہ تو حیرانی کی بات ہے۔ ہاں آج اس نے شراب نہیں پی رکھی۔ ورنہ نشہ میں کسی کو کیا ہوش رہتا ہے۔ وہ ضرور چل نکلتے۔ یعنی مجھ سے خوب نوک جھونک کرتے۔ اور میری چھیڑ کا جواب دیتے۔

(۱۱۳۰) تم کو کوئی قہر کہتا ہے۔ کوئی بلا بتاتا ہے۔ کاش تم میرے ہی لئے ہوتے۔ یعنی کسی غیر سے ہرگز تعلق نہ رکھتے۔ مراد یہ کہ جو سختی اغیار تمہارے ہاتھ سے نہ اُٹھا سکیں۔ وہ میں بخوشی اُٹھاؤں گا۔ اگر تم میرے دوست بن جاؤ۔

(۱۱۳۱) قدرت پر طعن کرنے کو کہتا ہے۔ کہ اگر اس نے میری قسمت میں اتنا غم لکھا تھا۔ کاش مجھے اس غم کے برداشت کرنے کے لئے۔ دل بھی تو دو چار دئے ہوتے۔ فقط ایک دل سے کام کیسے چلے۔

(۱۱۳۲) اے غالب وہ دوست تیرے ڈھب کا ہو ہی جاتا بشرطیکہ تیری زندگی کچھ دنوں اور ہوتی۔ مراد یہ کہ غالب مرتا مر گیا۔ مگر دوست نے اُس کے ساتھ وفا نہ کی۔

غزل

غیر لیں محفل میں بوسے جام کے (۱۱۳۳)
ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے

(۱۱۳۴) خستگی کا تم سے کیا شکوہ کہ یہ
ہتکنڈے ہیں چرخِ نیلی فام کے

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو (۱۱۳۵)
ہم تو عاشق ہیں تمھارے نام کے

(۱۱۳۶) رات پی زم زم پہ مے اور صبحدم
دھوئے دھبے جامۂ احرام کے

دل کو آنکھوں نے پھنسایا کیا مگر (۱۱۳۷)
یہ بھی حلقے ہیں تمھارے دام کے

(۱۱۳۸) شاہ کی ہے غسل صحت کی خبر
دیکھئے کب دن پھریں حمام کے

عشق نے غالبؔ نکما کر دیا (۱۱۳۹)
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

(۱۳۳) لغت ۔ جام کے بوسے لینا ۔ اس سے مراد جام شراب لو بوسہ لینے کی طرح ہونٹ لگا کے ذوق شوق کے ساتھ وہ شراب پینا کہ جو اس دوست کی طرف سے غیروں کو پیش کی گئی ہے ۔ تشنۂ پیغام ۔ دوست کا اپنے عاشق کو محفل میں نہ بلانا ۔ اور اس کا محروم رہ جانا ۔

حل ۔ اغیار جن کو تو نے محفل میں بلایا ہے ۔ وہ تو مزے لے لے کے جام شراب پئیں ۔ اور ہم اس بات سے بھی محروم رہ جائیں ۔ کہ تو ہمیں کوئی پیغام یا قاصد ہی بھیجکر اپنے ہاں بلوائے ۔

(۱۳۴) اپنی خستگی یعنی تباہی کا ہم تم کو الزام دے کے تم سے کیا شکوہ و شکایت کریں ۔ یہ تو اسی نیلگوں آسمان کے فریب یا ظلم کرنے کے ڈھنگ ہیں ۔ (مراد یہ کہ ہماری قسمت کا ستارہ ہی کچھ گردش میں ہے جو کہ تم ہم کو اسقدر تباہ کر چکے ہو)

(۱۳۵) ہم تیرے نام کے حب عاشق ہیں ۔ تو تجھ کو بار بار خط ضرور لکھیں گے ۔ خواہ تجھے خط میں لکھنے کو ہمارے پاس کچھ مطلب یا مضمون خاص پیش نظر نہ ہو ۔ بلکہ ہم تو صرف تیرا نام ہی خط پہ لکھ لکھکر دیکھیں گے ۔ اور خوش ہوں گے ۔

(۱۳۶) ہمارا تو یہ حال ہے ۔ کہ اگر خانۂ کعبہ میں اپنی مغفرت کے لئے گئے ۔ تو وہاں بھی یہ نقشہ رہا ۔ کہ رات کو زم زم کے چشمے کے کنارے شراب پی لی ۔ اور بوقت صبح اپنے احرام کے وہ دھبے جو شراب کے گرنے سے (بحالت نشہ) اس پر پڑ گئے تھے ۔ اُن کو زم زم ہی کے پانی سے دھونے لگے ۔ یعنی خدا کے گھر میں بھی ہم شراب پینے سے کبھی باز نہ آئے ۔ (زمزم ۔ مکہ میں ایک نہر ہے ۔ جس کو مسلمان ایسا ہی مقدس مانتے ہیں ۔ جیسا کہ ہندو گنگا یا جمنا کو

اور احرام ۔ وہ چادر جس کو حاجی لوگ پہنکر وہاں حج کرتے ہیں ۔) اس شعر کا اصل مقصد تو یہ ہے ۔ کہ واعظ کو غالب نے جھٹلایا ہے ۔ کہ اس کا حج کرنا بھی کسی مقصد سے ہوتا ہے ۔ نہ کہ خدا کی خالص عبادت ۔ جیسے کہ ایک اردو مثل ہے ۔ "حج بھی رنج بھی")

(۱۳۷) لغت ۔ مگر ۔ شاید ۔ دام کے حلقے ۔ سوتی جال کی گول گول زنجیریاں ۔ حل ۔ تمہاری (خوبصورت) آنکھوں نے ہمارے دل کو کیا پھنسایا ۔ شاید یہ بھی تمہارے دام فریب عشق کے حلقے یا زنجیریاں ہیں ۔ کہ جن میں ہمارا دل پھنس کے رہ گیا ۔ (حلقۂ دام اس لئے کہا کہ آنکھوں کا گردو نواح اسی طرح کا دکھائی دیتا ہے ۔)

(۱۳۸) افواہ ہے کہ بادشاہ دہلی کو صحت ہوئی ۔ اب دیکھئے وہ کب حمام میں جاکر نہائیں ۔ اور اس سے حمام کی قسمت جاگ اُٹھے (غالب نے جابجا اپنے بادشاہ کی تعریف کی ہے ۔ تاکہ اس کا نام ان غزلوں میں رہ جائے اور اس طرح اس کے نام کو بقا حاصل ہو ۔)

(۱۳۹) اے غالب (جوانی ہی میں) ہم کو عشق نے غارت کر دیا ۔ ورنہ ہم بھی کوئی کام کرتے ۔ اور کام کے آدمی یعنی دوسروں کو کچھ فائدہ پہنچانے والے انسان بنتے ۔

غزل

پھر اس انداز سے بہار آئی (۱۱۴۰)
کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی

(۱۱۴۱) دیکھو اے ساکنان خطۂ خاک
اس کو کہتے ہیں عالم آرائی

(۱۱۴۲) کہ زمیں ہو گئی ہے سر تا سر
روکش سطح چرخ مینائی

(۱۱۴۳) سبزہ و گل کے دیکھنے کے لئے
چشم نرگس کو دی ہے بینائی

(۱۱۴۴) ہے ہوا میں شراب کی تاثیر
بادہ نوشی ہے باد پیمائی

(۱۱۴۵) کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالب
شاہ دیندار نے شفا پائی

(۱۱۴۰) فصل بہار اب کے سال پھر آئی۔ مگر ایسی پر رونق ہے کہ چاند (باوجودیکہ اس قدر خوشنما ہے) اور سورج (اتنی آب وتاب رکھتا ہے) وہ دونو اس موسم بہار کے نظارے کے دیکھنے کے شایق ہیں۔ (یہ شعر بطور مطلع لکھکر آئندہ اشعار بہ شکل قطعہ اسی بہار کی تعریف میں رقم کیا ہے)

(۱۱۴۱) اے خطۂ خاک یعنی دنیا کے رہنے والو اس بہار کو دیکھو۔ کہ اس کو عالم آرائی کہتے ہیں۔ گویا یہ بہار ایک سماں پیش نظر کر رہی ہے۔ جو قابل دید ہے۔ اور وہ سماں یا دنیا کی زیب و زینت کا باعث ہے۔

(۱۱۴۲) لغت۔ چرخ مینائی۔ چونکہ آسمان میں اکثر نیلا رنگ

ہوتا ہے۔ اور کچھ کچھ سبز سفید۔ لال اور زرد وغیرہ اور یہ سب مینا کاری کے رنگ ہیں۔ لہذا آسمان کو چرخ مینا رنگ کہا کرتے ہیں۔

حل زمین ساری کی ساری مینا رنگ کے گردش کرنے والے آسمان کی روکش ہو گئی ہے۔ یعنی اس زمین کو دیکھکر پھر آسمان کی خوشنمائی دیکھنا کوئی پسند نہیں کرتا۔ (زمین اس لئے مینا رنگ ہوئی کہ اس میں سے سبز سفید لال ہر طرح کے پھول موسم بہار میں پیدا ہو گئے ہیں۔)

(۱۱۴۳) جب پودوں کو زمین کی کثرت پیداوار کی وجہ سے کہیں جگہ نہ ملی۔ تو وہ پانی کی طرف بڑھے۔ مگر پانی میں مٹی تو دکھائی نہ دی۔ کہ جڑیں نکال کے کھڑے ہو جاتے۔ آخر کائی (ایک سبز رنگ کا پودا) بنکر سطح آب پر پڑے رہ گئے۔ مطلب یہ کہ خشکی وتری ہر جگہ بہار کا سبزہ زار نمودار ہو گیا ہے۔

(۱۱۴۴) جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے۔ جب سبزہ و گل یعنی بہار کے پھول پتے اس کثرت سے پیدا ہو گئے۔ تو ان کو دیکھنے کے لئے نرگس کی آنکھ کو بینائی دی گئی۔ یعنی اس کا پھول جو آنکھ کی طرح کا ہوا کرتا ہے اس کو پیدا کیا گیا۔ کہ وہ اس بہار کا سین دیکھے۔ خلاصہ مطلب یہ کہ گلاب اور چنبیلی وغیرہ کے بعد گل نرگس کو بھی پیدا کیا گیا۔

(۱۱۴۵) لغت۔ بادہ نوشی شراب کا پینا پلانا۔ بادپیمائی۔ اس کے یہاں دو معنی ہیں۔ ایک تو ہوا کا ناپنا۔ گویا کوئی فضول کام کرنا۔ دوسرے ہوا کھانا۔

حل۔ جب ہوا میں شراب جیسا اثر یا نشہ (بوجہ موسم بہار کے)

موجود ہے۔ تو مے (بادہ نوشی (شراب کا پینا) ایک فضول کام ہے۔ صرف بہار کی ہوا ہی سے سرور شراب حاصل کیا جا سکتا ہے۔

دوسرے معنی۔ اس موسم بہار کی ہوا میں بادہ پیمائی یعنی ہوا خوری کرنا گویا بادہ نوشی ہے۔ (کیونکہ شراب کی کچھ حاجت نہیں رہی ہے۔ ہوا ہی میں نشہ موجود ہے۔)

(۴۶ ؁) لغت۔ شاہ دیندار یعنی بہادر شاہ ظفر۔ جو فی الواقع ایک دیندار آدمی تھے۔

حل۔ اے غالب اہل دنیا کو خوشی کیوں نہ ہو۔ کہ ان کے دیندار بادشاہ کو صحت حاصل ہوئی۔ (غالباً یہ غزل غالب نے اس وقت کہی ہے۔ جبکہ ذوق نے شاہ موصوف کے روبہ صحت ہونے پر ایک قصیدہ لکھا تھا۔ جس کا مطلع یہ ہے ؎

معتدل ہے کس قدر اب باغ عالم کی ہوا
دے اگر زاغ و زغن بیضہ تو ہو پیدا ہما

غزل

تغافل دوست ہوں میرا دماغ عجز عالی ہے (۴۷ ؁)
اگر پہلو تہی کیجئے تو میری جا بھی خالی ہے
(۴۸ ؁) رہا آباد عالم اہل ہمت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جس قدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

(۴۷ ؁) تغافل دوست۔ یعنی دوسروں کی بے التفاتی کو میں پسند

کیا کرتا ہوں۔ کیونکہ تارک الدنیا ہوں۔ دماغ عجز۔ میری خاکساری کا نکتہ نظر اگر پہلو تہی کیجئے۔ یعنی مجھ سے کنارہ کشی کیجئے۔ جا میرے لئے خالی ہو۔ یعنی آپ کے پہلو میں میرے لئے جگہ پیدا ہو۔ یعنی میں آپ کے نزدیک عزیز تر ہو جاؤں گا۔

حل۔ میں (دنیا سے نفور شخص) اس بات کو پسند کرتا ہوں۔ کہ میرے ساتھ بے التفاتی برتی جائے۔ کیونکہ میرا نکتہ نظر عوام سے زیادہ بلند ہے۔ پس اگر آپ مجھ سے کنارہ کشی کریں۔ تو میں یہ جانوں گا۔ کہ گویا میں آپ کے نزدیک اب زیادہ تر عزیز ہو گیا ہوں۔

(۴۸ ؁) لغت۔ اہل ہمت۔ وہ لوگ جو بلند ارادہ رکھتے ہوں۔ یہاں مراد وہ اشخاص کہ دنیا کا زر و مال جمع کرنے کی فکر میں نہیں ہیں۔ بلکہ اس کو زندگی کا لطف حاصل کرنے میں صرف کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ ان کا بس چلے تو دنیا کی ساری دولت ایک آن میں خرچ کر ڈالیں۔ گویا بقول نظیر ؎

گر مرد ہے تو عاشق کوڑی نہ رکھ کفن کو

حل۔ اگر دنیا آباد ہے۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل ہمت یہاں بہت کم ہیں۔ اور زیادہ تر جز رس اور اپنے لطف زندگی کا حظ نہ اٹھانے والے یا خوب پینے پلانے والے مرد آدمی یہاں مفقود ہیں۔ گویا یہ دنیا ایک میخانہ ہے۔ اس میں جس قدر جام و سبو بھرے رکھے ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اسی نسبت سے میخوار اس میں کم موجود ہیں۔ ورنہ شراب کا ایک قطرہ بھی بچ نہ سکتا۔ یعنی دنیا برباد و ویران ہو جاتی۔ حاصل شعر یہ کہ وہ لوگ جو دنیا کے زر و مال سے متمتع نہ ہوئے۔ وہ گویا اپنا اندوختہ پیچھے چھوڑ گئے تو انکی ذات کو یا ان سے دوسروں کو کیا حاصل ہوا۔

غزل

کب وہ سنتا ہے کہانی میری (۱۱۴۹)
اور پھر وہ بھی زبانی میری

(۱۱۵۰) خلشِ غمزۂ خونریز نہ پوچھ
دیکھ خونابہ فشانی میری

کیا بیاں کر کے مرا روئیں گے یار (۱۱۵۱)
مگر آشفتہ بیانی میری

(۱۱۵۲) ہوں زخود رفتۂ بیدائے خیال
بھول جاتا ہے نشانی میری

متقابل ہے مقابل میرا (۱۱۵۳)
رُک گیا دیکھ روانی میری

(۱۱۵۴) قدرِ سنگِ سرِ رہ رکھتا ہوں
سخت ارزاں ہے گرانی میری

گردبادِ رہِ بیتابی ہوں (۱۱۵۵)
صرصرِ شوق ہے بانی میری

(۱۱۵۶) دہن اُس کا جو نہ معلوم ہوا
کھل گئی ہیچمدانی میری

کر دیا ضعف نے عاجز غالبؔ (۱۱۵۷)
ننگِ پیری ہے جوانی میری

(۱۱۴۹) وہ محبوب میرے عشق کی کہانی کب سنتا ہے۔ اور پھر وہ کہانی بھی میری زبانی کیونکر وہ سنے جب کہ مجھ سے اس کو دلی نفرت ہے۔

(۱۱۵۰) لغت۔ خلش۔ چبھنا۔ غمزہ۔ آنکھوں سے اشارہ کرنا۔ معشوق کا کسی کی طرف نازوادا سے دیکھنا۔ خونابہ فشانی۔ لہو بہانا۔

حل۔ اس محبوب کے خون بہا دینے والے غمزے کی چبھن (خلش) کا کچھ حال نہ پوچھ۔ میری خوں فشانی کو دیکھکر اندازہ کر لے۔ کہ وہ کسقدر موثر ہے۔

(۱۱۵۱) دوست میرے مرنے کے بعد میری کونسی بات یاد کر کے روئیں گے؟ (اس سوال کا خود ہی جواب دیتا ہے کہ) شاید میری آشفتہ بیانی یعنی پریشان گوئی یا غزل خوانی انکو یاد آئیگی۔ (کیونکہ بجز اس کے اور مجھ میں کونسی خوبی موجود ہے۔)

(۱۱۵۲) لغت۔ بیدائے خیال۔ خیالات اور محسوسات کا جنگل۔ زخود رفتہ۔ اپنے آپ سے نکل چکا ہوا۔ یعنی محو بے خودی۔

حل۔ میں خیالات کے جنگل میں محو بے خودی ہوں۔ یعنی خود فراموش ہو چکا ہوں۔ لہذا میری پہچان بھول جاتا ہے۔ یعنی میں ایک ایسا انسان ہوں کہ ہمیشہ خود فراموش رہتا ہوں۔ اور اسی سے پہچانا جاتا ہوں۔

(۱۱۵۳) لغت۔ متقابل۔ عربی میں تقابل کے معنی آمنا سامنا یا ضد و تخالف کے ہیں۔ لہذا متقابل وہ کیفیات کہ ایک دوسرے کے خلاف ہوں۔ جیسے کہ نیک و بد۔ سیاہ و سپید۔ اور خوشی و غم وغیرہ۔ لیکن مقابل وہ اشیا کہ ایک دوسرے کے آمنے سامنے گو ضرور ہوں۔

اور ایک کا دوسرے سے مقابلہ بھی کیا جا سکے۔ تاہم یہ ضروری نہیں یکساں ہیں ایک دوسرے کی ضد ہونے کے خواص بھی پائے جائیں۔ جیسے ایک ہی قسم کے دو قلم پاس پاس رکھکر ہم کہیں کہ یہ قلم اس کے بالمقابل رکھا ہے تو ان میں ضد کی کوئی بات نہیں ہے۔ بلکہ ایک کو دوسرے کے ساتھ ایک گونہ یہ تعلق ہے کہ پاس پاس رکھے ہیں۔ جس طرح دو دوستوں کو ایک دوسرے کا حریف یا مدمقابل کہیں تو اس سے مراد دشمنی نہیں ہوتی بلکہ ایک اُن میں سے دوسرے کے ساتھ تعلق رکھتا یا اُس کی طرف راجع ہوتا ہے۔ لہذا کہتا ہے۔ کہ وہ دوست جو میرا متقابل یعنی میرے ساتھ ضد رکھنے والا اور مخالف تھا۔ وہ کسی حریف دوست کی طرح اب میری روانی طبع کو دیکھکر رُک گیا ہے۔ یعنی میں نے اس سے کچھ بے تکلفی کرنی چاہی تو وہ اس میں متامل سا ہو گیا۔ یعنی رُک کر رہ گیا ہے اور مختلط نہیں ہوتا۔

(۱۱۵۴) میں رستے پر پڑے ہوئے ایک پتھر کی سی عزت رکھتا ہوں۔ (یعنی سخت ذلیل و خوار ہوں۔) لہذا یہ میری گرانی یا میرا وزنی ہونا (کہ جس کی بدولت میں زمین سے نہ اُٹھ سکوں۔) اس سے میری سخت ارزانی پائی جاتی ہے۔ یعنی یہ ایک وجہ خواری و ذلالت ہے۔

(۱۱۵۵) لغت۔ گرد باد۔ بگولا۔ جو کہ ہمیشہ تیز ہوا یعنی صرصر یا آندھی سے پیدا ہوتا ہے۔ رہِ بیتابی۔ بیقراری کا راستہ یا منزل۔ جیسے بگولا بے قراری کے راہ پر چلتا ہے۔ صرصرِ شوق۔ عشق کی تند ہوا۔ بانی میری۔ میری بانی مبانی۔

حل۔ عشق کی تند ہوا میری بانی مبانی ہے۔ لہذا میں بے قراری کی منزل یا اس کے سبب بگولے کی طرح تیز تیز چلتا ہوں۔ (مراد۔ عشق میں

مجھے سخت خواری و بے قراری ہے)

(۱۱۵۶) مجھ کو جب یہ بات معلوم نہ ہو سکی۔ کہ دوست کا منہ کہاں ہے (بوجہ اس کی معدومیِ دہن کے) تو سب پر میری ناواقفیت کا حال منکشف ہو گیا۔ حاصل شعر۔ دوست کی تنگیِ دہن کی نسبت مبالغہ کیا ہے۔

(۱۱۵۷) اے غالب ہوں تو میں جوان۔ مگر میری کمزوری اس قدر بڑھی ہوئی ہے۔ کہ میری یہ جوانی اگر کسی بڈھے میں بھی ہو۔ تو وہ اس سے شرم کھائے گا

غزل

نقشِ نازِ بتِ طناز بآغوشِ رقیب (۱۱۵۸)
پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے

(۱۱۵۹) تو وہ بد خو کہ تحیر کو تماشا جانے
غم وہ افسانہ کہ آشفتہ بیانی مانگے

وہ تپِ عشق تمنا ہے کہ پھر صورتِ شمع (۱۱۶۰)
شعلہ تا نبضِ جگر ریشہ دوانی مانگے

(۱۱۵۸) لغت۔ نقش۔ تصویر۔ نازِ بتِ طناز۔ مغرور معشوق کا ناز و انداز۔ پائے طاؤس۔ مور کا پیر جو اس کے تمام خوبصورت جسم میں بد نما معلوم ہوا کرتا ہے۔ پئے خامۂ مانی۔ مانی (ایک مشہور مصور) کے قلم کے واسطے۔

حل ۔ آغوش رقیب یعنی غیر کی بغل میں اگر اس دوست کے موجود ہونے کی تصویر کھینچی جائے تو دوست تو حسین ہے ۔ اور رقیب بدصورت ۔ لہٰذا مانی جیسا مشہور مصور بھی اس مغرور دوست کے ناز و انداز کی تصویر معہ رقیب کے کھینچنے کے لئے مور کے پاؤں کے قلم کا خواستگار ہوگا ۔ یعنی خود مانی اس تصویر سے متنفر ہوگا ۔ جیسے کہ مور کے تمام جسم میں جو خوبصورت ہوتا ہے ۔ اُس کے پاؤں کو دیکھکر گھن آتی ہے ۔

(۱۱۵۹) لغت ۔ بدخو ۔ بدمزاج آدمی جو کسی کی بات نہ سننا چاہے ۔ تحیر ۔ حیرت ۔ یعنی کسی بات کو سنکر تعجب پیدا ہونا ۔ تماشا جاننا ۔ کھیل سمجھنا ۔ یا عبث شمار کرنا ۔ غم ۔ یہاں مراد غم عشق ۔ خفتہ بیانی ۔ ایسی باتیں بیان کرنا کہ جن سے حیرت و پریشانی سننے والے کے دل میں پیدا ہو ۔

حل ۔ میرا افسانۂ غم ایساہے ۔ کہ جس کا بیان سُنکر ہر شخص کے دل میں حیرت اور پریشانی پیدا ہوتی ہے ۔ لیکن تو ایک ایسا بدمزاج آدمی ہے ۔ کہ ایسے پریشان کن افسانوں کو (بوجہ اپنی سنگدلی کے) محض ایک کھیل تصور کرتا ہے ۔ (لہٰذا تجھ کو اپنے درد عشق کا قصہ سنانا بالکل فضول ہے)

(۱۱۶۰) لغت ۔ تمنا ہے ۔ یعنی مقصود ہے ۔ شعلہ ۔ یہاں مراد شمع کی لو ۔ نبض جگر ۔ نبض سے مراد رگ یا موم بتی کے اندر کا دھاگا ۔ جو جلا کرتا ہے ۔ جگر ۔ موم ۔ جو جگر کے خون کی طرح شمع کے جلنے میں کام آتا ہے ۔ ریشہ دوانی ۔ لغوی معنی ۔ تلگے کا دوڑنا ۔ مراد اندر ہی اندر اپنا کام کرنا ہے ۔

حل ۔ مجھکو عشق میں ایک ایسی تپ یا تپش کی خواہش ہے جو کہ

تمام میرے جسم میں سر سے پاؤں تک سرایت کر جائے ۔ گویا کہ کسی موم بتی کی لو اس کی لو سے لیکر اس کی موم اور اندر کے تاگے تک میں آگ پھیلا دے ۔

غزل

گلشن کو تری صحبت ازبسکہ خوش آئی ہے (۱۱۶۱)
ہر غنچہ کا گل ہونا آغوش کشائی ہے

(۱۱۶۲) واں کنگرِ استغنا ہر دم ہے بلندی پر
یاں نالہ کو اور اُلٹا دعوائے رسائی ہے

ازبسکہ سکھاتا ہے غم ضبط کے اندازے (۱۱۶۳)
جو داغ نظر آیا اک چشم نمائی ہے

(۱۱۶۱) چونکہ باغ کو تیری صحبت بہت پسند آئی ہے ۔ ہر کلی کا وہاں کھل کر پھول بننا گویا تیرے ساتھ ملنے کے لئے اپنی بغل کو کھولنا یا تجھ سے بغلگیری کی تمنا کرتا ہے ۔

(۱۱۶۲) لغت ۔ کنگرۂ استغنا ۔ لاپرواہی کے محل کا چھبوترا ۔ دعوائے رسائی ۔ پہنچنے یا موثر ہونے کا دعویٰ ۔

حل ۔ وہاں لاپرواہی کے محل کا چھبوترا ہر وقت اونچا ہو رہا ہے ۔ یعنی دوست ہر دم ہم سے بہ غرور پیش آتا ہے ۔ اور یہاں ہماری آہ کو جو کچھ پہلے ہی موثر نہ تھی ۔ اُلٹا اب یہ دعویٰ یا خیال دل میں سمایا ہے کہ وہ دوست تک پہنچکر اُس کو متاثر کریگا ۔

(۱۱۷۳) لغت ۔ داغ ۔ غم کی وجہ سے دل پہ داغ پڑنا ۔ جو آنکھ کی صورت تصور کیا جاتا ہے ۔ چشم نمائی کرنا ۔ آنکھیں نکال کے کسی کو گھورنا ۔

حل ۔ میرا غم عشق مجھ کو دل کے ضبط کرنے کا انداز یا طریقہ سکھاتا ہے ۔ یعنی جو داغ میرے دل پر دکھائی دیتا ہے ۔ وہ داغ دل نہیں ہے بلکہ اُستاد کی گھورنے والی آنکھ ہے ۔ جو کہ چشم نمائی کر رہی ہے ۔ تاکہ میرے دل کو ضبط کرنا آجائے ۔

غزل

(۱۱۷۴) جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی
لکھ دیجیو یا رب اُسے قسمت میں عدو کی

(۱۱۷۵) اچھا ہے سر انگشت حنائی کا تصور
دل میں نظر آتی تو ہے اک بوند لہو کی

(۱۱۷۶) کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے حوصلگی سے
یاں تو کوئی سنتا نہیں فریاد کسو کی

(۱۱۷۷) دشنہ نے کبھی منہ نہ لگایا ہو جگر کو
خنجر نے کبھی بات نہ پوچھی ہو گلو کی

(۱۱۷۸) صد حیف وہ ناکام کہ اک عمر سے غالب
حسرت میں رہے ایک بت عربدہ جو کی

(۱۱۷۴) جس زخم کے سینے کی کچھ تدبیر ہو سکتی ہے یا رب (وہ مجھکو

نہ دے ۔ بلکہ) اس کو میرے دشمن کی قسمت میں لکھدے ۔ مراد یہ کہ میں ہمیشہ عشق کے غم میں مبتلا ہی رہنا چاہتا ہوں ۔ لہذا یہ زخم دل کبھی اچھا نہ ہو تو بہتر ہے ۔

(۱۱۷۵) اس شعر کے دوسرے مصرعے میں "تو" نے یہ معنی پیدا کر دئے ہیں ۔ کہ آنکھوں سے لہو روتے روتے ایک قطرہ خون کا بھی دل میں باقی نہیں رہا تھا کہ تیری مہندی رنگی لال لال اُنگلی کے سرے کا خیال دل میں بندھا تو وہاں ایک بوند لہو کی نظر آنے لگی ۔ مراد یہ کہ ہمارے کمزور دل کو تیرے ہی خیال سے تقویت حاصل ہوتی ہے ۔

(۱۱۷۶) لغت ۔ بے حوصلگی ۔ یعنی کسی کے ظلم کو نہ برداشت کر کے آہ و فغاں کرنا ۔

حل ۔ تم عشاق کے بے حوصلہ ہونے یعنی تمھارا ظلم نہ برداشت کر کے فریاد و واویلا مچانے سے کیوں ڈرتے ہو ۔ یہاں تو کسی کی کوئی فریاد سننے والا ہی نہیں ہے ۔

(۱۱۷۷) یہ دو شعر (۱۱۷۷) و (۱۱۷۸) قطعہ بند ہیں ۔ پہلے دوسرے شعر کے معنی پر توجہ کرو ۔ کہتا ہے ۔ کہ اے غالب اس نامراد عاشق پر صد حیف یعنی سخت افسوس آتا ہے ۔ کہ جو ایک عربدہ جو (جنگجو) معشوق کی اس حسرت میں مبتلا رہے کہ اس معشوق کے دشنہ یا چھری اور ناز نے کبھی اس کو منہ نہ لگایا ہو ۔ یعنی اپنے عاشق پر کبھی ناز نہ کیا ہو ۔ اور نہ اس کے خنجر نے کبھی عاشق کے گلے کی بات پوچھی ہو یعنی اس کو حلال نہ کر ڈالا ہو ۔

غزل

سیماب پشت گرمیٔ آئینہ دے ہے ہم (۱۱۶۹)
حیران کیے ہوئے ہیں دلِ بے قرار کے

(۱۱۷۰) آغوشِ گل کشودہ برائے وداع ہے
اے عندلیب چل کہ چلے دن بہار کے

(۱۱۶۹) سیماب - پارہ۔ پشت گرمی - کسی کی پشت پر ہاتھ رکھنا۔ پشتبان لگانا یا سہارا دینا - دل بیقرار۔ حیران دل - جو پارے کی طرح مضطرب ہوا کرتا ہے۔

حل - ہمارا بیقرار دل (جو پارے کی طرح مضطرب ہے وہ) ہم کو (آئینے کی طرح) حیران کیے دیتا ہے - حالانکہ پارہ آئینہ کو پشتبان دیتا ہے یعنی آئینہ کے پیچھے پارہ لگا دیں - تو آئینہ گویا قرار پکڑ جاتا ہے - اور وہ ایک کام کی چیز بن جاتا ہے - مگر ہم اپنے دل کی بے قراری سے ایک طرح نکمے بن جاتے ہیں - یعنی ایک حیران و پریشان انسان -

(۱۱۷۰) اے عندلیب چل - اس سے مراد اے بلبل تو عالمِ مستی میں چل نکل۔ یعنی خوب رنگ رلیاں منا یا عیش کر۔

حل - اے بلبل - پھول اس وقت باغ میں آغوش کشادہ ہے۔ یعنی خوب کھلا ہوا ہے - اور اس کی یہ آغوش کشائی گویا باغ سے اس کے رخصت ہو جانے یا مرجھا کے وداع ہونے کو ظاہر کر رہی ہے - جیسے کہ چلتے وقت کوئی گلے ملتا ہے۔ لہٰذا تو موقع کو غنیمت سمجھ - یعنی خوب

چل نکل یا پھول کے ساتھ خوب عیش منا - ورنہ بہار کے دن چلے جانے کے لئے تیار ہیں - (مراد یہ کہ انسان جتنی تھوڑی مدت بھی دنیا میں رہے عیش سے گذارنے کی کوشش کرے -)

غزل

ہے وصل ہجر عالمِ تمکین و ضبط میں (۱۱۷۱)
معشوق شوخ و عاشق دیوانہ چاہیے

(۱۱۷۲) اس لب سے مل ہی جائے گا بوسہ کبھی تو ہاں
شوقِ فضول و جرأتِ رندانہ چاہیے

(۱۱۷۱) عالمِ تمکین - خودداری یا تمکنت کی حالت - عالمِ ضبط - صبر کرکے بیٹھ رہنا -

حل - اگر معشوق میں عالمِ تمکین ہو - یعنی وہ خوددار اور لاپرواہ ہو۔ اور عاشق میں عالمِ ضبط یعنی صبر سے بیٹھ رہنے کی عادت تو پھر وصل میں بھی ہجر کی سی حالت پیدا ہو جاتی ہے - کہ عاشق کچھ جرأت کرکے معشوق سے طالبِ وصال نہیں ہوتا - اُدھر معشوق بھی خوددار ہے - تو وہ اپنے عاشق کی پرواہ کیا کریگا - لہٰذا معشوق شوخ یعنی ہر کسی سے بلا رکاوٹ چھیڑ خوانیاں کرنے والا - اور عاشق ایک دیوانہ طبیعت کا آدمی ہونا چاہیے کہ کسی سے نہ ڈرے - اور بے سبب پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت کر سکے -

(۱۱۷۲) لغت - شوقِ فضول - حد سے زیادہ شوق جو کسی رکاوٹ

یا مخالفت کی کچھ پروا نہ کرے۔ جیسے کہ ایک دیوانہ جو چاہے کر گزرتا ہے۔ جرأت رندانہ۔ شہدوں کی طرح کسی بُرے یا مذموم کام کرنے سے بھی تامل نہ ہو۔

حل۔ اُس معشوق کے لب کا بوسہ (جو وہ کسی کو نہیں دیتا۔) کبھی تو مل ہی جائیگا۔ بشرطیکہ عاشق میں اس کا بے حد شوق ہو۔ اور وہ ایک رندانہ شوخی سے کام لے۔

غزل

چاہیئے اچھوں کو جتنا چاہیئے (۱۱۷۳)
یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیئے

(۱۱۷۴) صحبت رنداں سے واجب ہے حذر
جائے مے اپنے کو کھینچا چاہیئے

چاہنے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل (۱۱۷۵)
بارے اب اس سے بھی سمجھا چاہیئے

(۱۱۷۶) چاک مت کر جیب بے ایام گل
کچھ ادھر کا بھی اشارہ چاہیئے

دوستی کا پردہ ہے بیگانگی (۱۱۷۷)
منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیئے

(۱۱۷۸) دشمنی نے میری کھویا غیر کو
کس قدر دشمن ہے دیکھا چاہیئے

اپنی رسوائی میں کیا چلتی ہے سعی (۱۱۷۹)
یار ہی ہنگامہ آرا چاہیئے

(۱۱۸۰) منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید
نا اُمیدی اُس کی دیکھا چاہیئے

غافل ان مہ طلعتوں کے واسطے (۱۱۸۱)
چاہنے والا بھی اچھا چاہیئے

(۱۱۸۲) چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسدؔ
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیئے

(۱۱۷۳) بعض لوگ اس شعر کو یوں پڑھا کرتے ہیں۔ ؎

چاہیئے اچھوں کو جیتا چاہیئے
یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیئے

اور اس سے مراد یہ لیتے ہیں۔ کہ حسینوں کو جیتا یعنی زندہ دل ہونا چاہیئے۔ اگر حسین بھی اس بات کو چاہیں۔ یعنی زندہ دل ہوں۔ تو پھر اور کیا چاہیئے۔ مگر غالب نے یوں لکھا ہے ؎

چاہیئے اچھوں کو جتنا چاہیئے الخ

یعنی جتنا کہ ہو سکے حسینوں سے عشق و محبت برتنی چاہیئے۔ ہم اگر یہ بات چاہیں۔ یعنی عشق حسیناں تو اور کسی بات کی پھر ہمیں کیا ضرورت رہیگی۔ لیکن اگر "یہ" سے مراد اگر حسینوں سے لی جائے۔ تو پھر دوسرے مصرعے کا مفہوم یہ ہوگا۔ کہ اگر حسین بھی ان لوگوں کو چاہیں۔ جو ان کو چاہتے ہیں۔ تو پھر ایسے عشاق کو اور کیا چاہیئے۔

(۱۱۷۴) لغت۔ اپنے کھینچنا۔ کنارہ کشی اختیار کرنا۔

حل۔ رندوں یا شہدوں کی محفل سے پرہیز کرنا واجب ہے

لہذا بچائے اس کے کہ ہم سے بچیں۔ یعنی شراب پئیں۔ اپنے ہی کو کھینچنا یعنے محفل رنداں سے کنارہ کش ہو جانا ضروری ہے۔

(۱۱۷۵) تیرے چاہنے یعنی عشق کو میرا دل کیا سمجھا تھا۔ مراد یہ کہ میرا دل کیا عشق کو کھیل سمجھا تھا۔ کہ تجھ پر بے سوچے سمجھے عاشق ہو گیا۔ بارے اب اس سے سمجھا چاہئے۔ یعنی اس کی اس نادانی پر اسے کچھ سزا ملنی چاہئے۔ حاصل یہ کہ معشوق اپنے سہل گیر عاشق پر کچھ جفا کرتا ہے۔ تو اس کو معلوم ہوتا ہے۔ کہ عشق و محبت میں کس قدر تکالیف پیش آتی ہیں۔

(۱۱۷۶) موسم گل یا بہار نہ ہو۔ تو اپنا گریبان مت پھاڑ۔ کچھ ادھر کا اشارہ بھی چاہئے۔ یعنی موسم بہار کی تحریک بھی ہو۔ تو گریبان پھاڑ اور وہ تحریک (موسم بہار میں) پھولوں کا کھلنا ہے۔ جس سے گریبان کے چاک ہونے کی تمثیل مستعار لی جاتی ہے۔ یعنی بہار کے وقت پھول کھلے تو تو بھی اپنے گریبان کو چاک کر دے۔

(۱۱۷۷) جو عورت پردہ کرے اور کسی وقت سرراہ کسی سے بات چیت کر رہی ہو۔ تو شبہ ہوتا ہے کہ وہ ضرور اُس شخص کی آشنا ہے حالانکہ اگر وہی عورت پردے میں نہ ہو۔ اور سب سے سرراہ گفتگو کرتی ہو حتی کہ مسبوق الذکر شخص سے بھی سب کے سامنے گفتگو کرے۔ تو کوئی نہیں کہیگا کہ وہ عورت اس شخص کے ساتھ آشنائی رکھتی ہے۔ لہذا اسے

دوستی کا پردہ ہے بیگانگی

اسی بنا پر کہتا ہے۔ کہ تم ہم سے پردہ کرنا چھوڑ دو۔ اور لوگوں کے سامنے بالکل ہم سے کوئی کلام نہ کیا کرو۔ یا کرو بھی تو اس طرح پر کہ دیکھنے والوں کو یہ معلوم ہو۔ کہ گویا ہم ایک دوسرے سے بیگانہ اور

بالکل ناواقف ہیں۔ پس یہی طریقہ ہے۔ کہ ہم اپنی دوستی کو برقرار رکھ سکتے ہیں۔

(۱۱۷۸) غیر نے میرے ساتھ دشمنی کر کے اپنے کو کھو دیا۔ یعنی مٹا دیا۔ لہذا وہ میرا کتنا بڑا دشمن ہے۔ یہ بات دیکھنے کے قابل ہے۔

دوسرے معنی۔ کھو دینا۔ ایسی حالت کو کہتے ہیں۔ کہ انسان محبت عداوت یا غم وغیرہ کے یک لخت دل پر اثر کرنے سے کچھ مخبوط الحواس سا ہو جائے۔ اور قاعدہ ہے کہ اس طرح کا کھویا جانا ہمیشہ کسی مجمع میں ہوا کرتا ہے۔ کہتا ہے۔ کہ غیر نے مجھ کو دوست کے پاس دیکھ لیا۔ تو بوجہ رقابت اتنا رشک یا غم بھی وہ برداشت نہ کر سکا۔ اور فوراً کھویا گیا۔ دیکھئے کہ وہ کس قدر تمیز دشمن ہے۔

(۱۱۷۹) لغت۔ سعی چلنا۔ جیسے کہ کہا کرتے ہیں۔ اُس کی سفارش چل گئی۔ یہاں سعی چلنا مراد کوشش کا کامیاب ہونا ہے۔ ہرزہ آرا۔ خوب جدوجہد کرنے والا۔

حل۔ عشق میں ہماری جو بدنامی ہو چکی ہے۔ اُس میں "اپنی سعی کیا" چلتی ہے۔ یعنی ہماری کوشش اس بدنامی کو دور نہیں کر سکتی۔ ہاں یار (مراد خدا) ہی جدوجہد کرے تو اتنا بڑا داغ بدنامی دھویا جائے۔ یا وہ مجازی معشوق کچھ کوشش کر کے ہم سے مشفق ہو جائے۔ تو ہم کامیاب عاشق بن کے سرخرو ہو جائیں۔ اور یہ روز کی بدنامی یعنی طعن اغیار مٹ جائے۔

(۱۱۸۰) جو شخص امید و تمنا کا پورا ہونا تو کجا خود اپنی زندگی ہی سے بیزار ہو چکا ہو۔ اور دعا کرتا ہو کہ کسی طرح مجھے موت آجائے۔ اسکی یہ مایوسانہ حالت دیکھنے کے لایق ہوا کرتی ہے۔

(۱۱۸۱) قطعہ بند۔ اے غافل یا بے خبر دل۔ ان چاند کی سی شکلوں والے معشوقوں کے لئے چاہنے والا یعنی عاشق بھی کوئی اچھا آدمی یعنی خوبصورت یا صاحب حیثیت ہونا چاہئے۔ ورنہ یہ کس کو منہ لگاتے ہیں۔

(۱۱۸۲) اے اسد اپنی صورت تو ذرا دیکھو۔ (یعنی خوبصورتی کا تو نام تک نہیں) اور آپ ان حسینوں پہ عاشق ہوئے ہیں۔ کیا عقل کچھ ٹھکانے پر ہے۔

غزل

(۱۱۸۳) ہر قدم دوریٔ منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

(۱۱۸۴) درسِ عنوانِ تماشا بتغافل خوشتر
ہے نگہ رشتۂ شیرازۂ مژگاں مجھ سے

(۱۱۸۵) وحشتِ آتشِ دل سے شبِ تنہائی میں
صورتِ دود رہا سایہ گریزاں مجھ سے

(۱۱۸۶) غمِ عشاق نہ ہو سادگی آموزِ بتاں
کس قدر خانۂ آئینہ ہے ویراں مجھ سے

(۱۱۸۷) اثرِ آبلہ سے جادۂ صحرائے جنوں
صورتِ رشتۂ گوہر ہے چراغاں مجھ سے

(۱۱۸۸) بیخودی بسترِ تمہیدِ فراغت ہو جو
پُر ہے سایہ کی طرح میرا شبستاں مجھ سے

(۱۱۸۹) شوقِ دیدار میں گر تو مجھے گردن مارے
ہو نگہ مثلِ گلِ شمع پریشاں مجھ سے

(۱۱۹۰) بیکسی ہائے شبِ ہجر کی وحشت ہے ہے
سایہ خورشیدِ قیامت میں ہے پنہاں مجھ سے

(۱۱۹۱) گردشِ ساغرِ صد جلوۂ رنگیں تجھ سے
آئینہ داریٔ یک دیدۂ حیراں مجھ سے

(۱۱۹۲) نگہِ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے اسدؔ
ہے چراغاں خس و خاشاکِ گلستاں مجھ سے

(۱۱۸۳) لغت۔ دوریٔ منزل۔ یہاں مصنف منزل سے مراد وہ جگہ لیتا ہے۔ کہ جب حالت سراب میں صاف سامنے نظر آتا ہے۔ کہ یہاں چشمہ بھرا ہے اگر وہاں تک پہنچ جاؤں تو اس کو اپنی منزل بناؤ گے [illegible] مگر وہ جتنا اُس کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔ وہ دور ہی ہوتا چلا جاتا ہے تو یہ گویا دوریٔ منزل ہوئی۔

حل۔ صحرا نوردی میں مجھے سراب کی دوریٔ منزل کی سی حالت درپیش ہے۔ کہ جو قدم آگے بڑھاتا ہوں۔ میری منزل مجھ سے کچھ دور ہی دکھائی دیتی ہے۔ گویا میری رفتار سے یعنی جتنا کہ میں چلتا ہوں اُتنا ہی بیابان بھی مجھ سے دور بھاگتا جاتا ہے۔

(۱۱۸۴) درس۔ سبق یا تجربہ۔ عنوان تماشہ۔ تماشہ سے یہاں مراد معشوق کا اپنے عاشق کی طرف دیکھنا۔ اور عنوان تماشا ایسا دیکھنے کا آغاز کرنا۔ بتغافل۔ معشوق کا غفلت کرنا۔ یہاں مراد

اس کا اپنے عاشق کی طرف نظر بھر کے دیکھنا۔ گویا نیم باز نگہ کے ساتھ۔ مژگاں پلکیں جو آنکھوں کے پپوٹوں پر ہونے سے گویا پپوٹے ان کے شیرازہ بندی کا کام کرتے ہیں۔ اور نگاہِ دوست ایسے شیرازہ میں دھاگے کی طرح آگے رہ جاتی ہے۔ اس وقت جبکہ وہ عنوان تماشہ یعنی اپنے عاشق کی طرف بہ نیم نگاہ نظر اٹھا کے دیکھنا شروع کرتا ہے اس شعر میں دوست کی نیم نگاہی کا تذکرہ کیا ہے۔ مجھ سے مراد یہ حالت نیم نگاہی کی میری بدولت ہی ظہور پذیر ہوئی ہے۔

حل۔ وہ محبوب جو مجھکو بہ تغافل عنوان تماشا کرتا ہے۔ یعنی اپنی نیم باز نگاہ کے ساتھ مجھے دیکھنا شروع کرتا ہے۔ اس کا یہ درس یعنی اس کی یہ مشق ناز مجھے بہت خوشتر یا بھلی معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ اس وقت اس کی وہ نیم باز نگاہ اس کی پلکوں کی شیرازہ بندی کرنے کو مثل دھاگے کے ہوتی ہے۔ یعنی وہ اس شیرازے یعنی پپوٹوں سے باہر نہیں ہوتی۔ اور یہ صورت نیم باز آنکھوں سے دیکھنا شروع کرنے کی ہوا کرتی ہے۔

(۱۱۸۵) فراق میں بے کسی کی یہ حالت ہوا کرتی ہے۔ کہ کوئی کسی کا ساتھ نہیں دیتا۔ بقول شخصے ؎

کسی کا کب کوئی روزِ سیاہ میں ساتھ دیتا ہے
کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا رہتا ہے انساں سے

حل شعر۔ فرقت کی رات میرے دل سے جو آتش غم کے شعلے اٹھے۔ یعنی آتش فرقت ظہور میں آئی تو اس وقت میری بے کسی کی یہ حالت تھی۔ کہ دھوئیں کی طرح میرا سایہ بھی مجھ سے

دور ہی بھاگتا تھا۔

(۱۱۸۶) لغت۔ سادگی آموز۔ سادہ پن سکھانا۔ مراد معشوق کا زیب و زینت ترک کر کے۔ سادہ طور پر زندگی بسر کرنا۔

حل۔ عاشقوں کا غم یعنی ان کی قابل رحم حالت۔ جب معشوقوں کی نظر سے گذرا کرے۔ تو ان کو زیب و زینت ترک کر دینے کی عادت نہیں ڈالنی چاہئے۔ چنانچہ میرے محبوب نے مجھ سے یعنی مجھے دیکھکر ایسا کیا۔ تو خانہ آئینہ کس قدر ویران ہو گیا ہے۔ یعنی وہ اب آئینے کا دیکھنا اور اپنی زیبایش کرنا ہی چھوڑ بیٹھا ہے۔ لیکن اس قدر بھونڈی صورت میں اسے دیکھکر میرا غم گویا دونا ہو گیا ہے۔ حالانکہ وہ محبوب تو میری ہمدردی میں ترک زیب و زینت کر چکا تھا۔

(۱۱۸۷) جادہ۔ وہ تنگ سی راہ یا پٹیا جو کسی چوڑے راستہ پر بن جایا کرتی ہے۔

حل۔ میں نے جنون کے صحرا میں چلنا شروع کیا۔ تو اس صحرا کی پٹیا میں میرے پاؤں کے آبلوں سے یہ اثر پیدا ہوا۔ کہ وہ آبلے گویا موتی بن گئے تھے۔ (کیونکہ ان کی شکل اسی طرح کی تھی۔) اور وہ پٹیا یا تنگ راہ (جس پر میرے پاؤں کے آبلہ گذرتے تھے۔) ایک دھاگہ سا بن گئی تھی۔ کہ جس میں وہ آبلوں کے موتی میرے چلتے وقت پروئے جاتے تھے۔ یعنی آبلوں کا مواد مثلاً خون اور پیپ کی بوندیں گر کر رستے پر جمتی جاتی تھیں۔ اور یہ آبلے بوجہ سوزش زخم اس قدر جلتے اور شعلے مارتے تھے۔ کہ گویا مجھ سے ایک چراغاں صحرائے جنون میں پیدا ہو گئی تھیں۔

(۱۱۸۸) لغت - ہوجو - ہوجیو - یعنی ہووے۔ شبستان۔ رات کے ٹھہرنے کی جگہ۔ یہاں مراد ایک دیوانہ آدمی۔ جہاں کہیں رات آئے وہیں سنسان جنگل میں رہ پڑے - تو گویا وہ اس کا شبستان ہے۔

حل - بحالت بے خودی و مدہوشی میں اپنے شبستان میں پڑا ہوں۔ اور وہاں اس قدر ویرانی سی چھائی ہے۔ کہ گویا میری ہی سنسان حالت کی بدولت میرا شبستان بھی سایہ سے پُر ہو گیا ہے اور میں اسے رات سمجھکر سو گیا ہوں۔ خدا کرے کہ یہ سونا۔ بستر تمہید فراغت ثابت ہو۔ یعنی اسی طرح مدہوش پڑے ہوئے میں ہمیشہ کے لئے سو جاؤں - اور غم عشق سے فراغ پا جاؤں۔

(۱۱۸۹) شوقِ دیدار میں یعنی جس وقت میں تجھ کو دیکھ رہا ہوں - تو اُس وقت میری گردن کاٹ دے۔ تو میری نظر شمع کے گل کی طرح مجھ سے پریشان ہو جائے - یعنی جس طرح موم بتی کا گل کٹے تو اس شمع کے اجزا پریشان و برہم ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح میرا سر کہیں اور دھڑ کہیں بکھر جائے۔ اور پھر نظر بھی کہاں وہ بھی منتشر ہو جائے۔

(۱۱۹۰) لغت - بیکسی ہائے - بے مددگار و غمخوار ہونے کی حالتیں - وحشت - کسی سے دُور بھاگنا۔ خورشید قیامت - آفتاب قیامت - جو انسان کے بالکل نزدیک ہوگا - اور اس میں اتنی حدت ہوگی کہ اس کا سایہ تک بوجہ آتش نہ ہوگا۔

حل - شب فراق کی بے کسی کی حالتوں میں مجھے کون کون بے یار و مددگار چھوڑ کے بھاگ گیا ہے - اس کا سخت افسوس آتا ہے۔ میرا تو

سایہ تک بھی مجھ سے دُور ہو گیا ہے۔ اور آفتاب قیامت میں اس نے پنہاں ہونا یعنی چھپنا قبول کر لیا ہے - اور میرے پاس نہیں رہا ہے اور آفتاب نے بھی اس سایہ کو جگہ دیدی ہے۔ حالانکہ وہ ایسا کبھی نہیں کیا کرتا۔

(۱۱۹۱) لغت - ساغر صد جلوۂ رنگیں - وہ شراب کا پیالہ کہ جس میں سو سو طرح کی شراب رنگین کے جلوے نظر آئیں۔

حل - تجھ سے وہ شراب کا پیالہ تعلق رکھتا اور تیرے ہاتھ سے گردش حاصل کرتا ہے - (یعنی تو محفلوں میں اس کو دور شراب کے وقت استعمال کرتا ہے -) کہ جس میں سو سو طرح کی شرابیں بھری ہوئی اپنا رنگینی جلوہ دکھا رہی ہیں۔ اور مجھ سے اس آئینہ داری کو تعلق ہے۔ کہ جو ایک حیران آنکھ سے (کہ آئینے کی طرح کی ہوا کرتی ہے -) مجھکو سپرد کی ہے۔ مراد یہ کہ تو بزم عیش کا لطف اُٹھاتا ہے۔ اور میں فراق میں پڑا حیران اور پریشان ہو رہا ہوں۔

(۱۱۹۲) اے اسد میری گرم نگہ سے (جو آتش عشق کی بدولت اتنی جل رہی ہے۔ کہ گویا اس سے آگ ٹپکتی ہے۔ یہی آگ ٹپک کر باغ کو لگی - اور اس سے باغ کی خس و خاشاک جل کر اس قدر شعلے اُٹھے کہ ایک چراغاں نظر آنے لگی۔ مراد یہ کہ آتش عشق کا سخت غلبہ ہے۔

غزل

نکتہ چیں ہے غم دل اُس کو سنائے نہ بنے (۱۱۹۳)
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

(۱۱۹۴) میں بلاتا تو ہوں اُس کو مگر اے جذبۂ دل
اُس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

کھیل سمجھا ہے کہیں چھوڑ نہ دے بھول نہ جائے (۱۱۹۵)
کاش یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے

(۱۱۹۶) غیر پھرتا ہے لئے یوں ترے خط کو کہ اگر
کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

اس نزاکت کا برا ہو وہ بھلے ہیں تو کیا (۱۱۹۷)
ہاتھ آویں تو اُنھیں ہاتھ لگائے نہ بنے

(۱۱۹۸) کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے
پردہ چھوڑا ہے وہ اُس نے کہ اُٹھائے نہ بنے

موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بن آئے نہ بنے (۱۱۹۹)
تم کو چاہوں کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے

(۱۲۰۰) بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اُٹھائے نہ اُٹھے
کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ (۱۲۰۱)
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

(۱۱۹۳) نکتہ چیں کو عادت ہوا کرتی ہے۔ کہ وہ ہر بات پر کوئی حجت کھڑی کر دیتا ہے۔ اور کسی کی دال گلنے نہیں دیتا۔ اسی لئے کہتا ہے کہ دوست نکتہ چین ہے۔ یعنی بڑا حجتی آدمی ہے۔ اس کو اپنا دردِ دل سنا کر اپنا مقصد نکالنا چاہوں۔ اور وہ کسی طرح بھی حاصل نہ ہو سکے۔

تو پھر مجبور ہوں۔ کیا کروں۔ (کیا بنے بات یعنی کوئی مطلب کیا حاصل ہو۔)

(۱۱۹۴) اے جذبۂ دل میں اُس کو بلاتا تو ہوں (مگر کیا معلوم وہ آئے یا نہ آئے۔) کاش اس پر کوئی ایسی بن جائے یعنی ایسی آفت ناگہانی پڑے کہ میرے پاس آئے بغیر اُس کی بن نہ پڑے۔ یعنی وہ اس پر مجبور ہو کہ میرے پاس مدد کو ضرور آئے۔

(۱۱۹۵) وہ میرے ستانے کو ایک کھیل سمجھا ہے۔ کہیں اس کو وہ بھول نہ جائے۔ (جیسے کہ کھیل کبھی خیال آتا ہے تو کھیل لیا جاتا ہے۔) اے کاش اس کی وہ حالت ہو۔ کہ مجھکو اس عشق میں ستائے بغیر وہ رہ ہی نہ سکے۔ یعنی اس کی کسی طرح بن نہ پڑے۔

(۱۱۹۶) غیر تیرے خط کو یوں (کھلم کھلا) لئے پھرتا ہے۔ کہ (اُس کا مضمون تو سب پر کھل چکا ہے اور) اگر کوئی اُس سے پوچھے کہ یہ کیا خط ہے یعنی اس میں کیا لکھا ہے۔ تو (چونکہ وہ سب لوگ پہلے ہی اس سے واقف ہیں) اگر غیر اُن سے اب وہ خط چھپانا بھی چاہے۔ تو کیا چھپائیگا۔ وقعت خط تو سب پر روشن ہو ہی چکی ہے۔ (مراد یہ کہ رقیب سے تو اپنی رازداری نہ برتا کر)

(۱۱۹۷) دوست کی اس نزاکت یا نازک مزاجی کا برا ہو۔ کہ اگر وہ بھلا بھی ہے (یہاں مراد۔ اگر کوئی اُسے بلائے۔ تو اُس کے ہاں چلا بھی جاتا ہے) لیکن اس سے فائدہ کیا۔ جب کہ کسی کے وہ ہاتھ چڑھے۔ تو وہ نازک مزاج کسی کو چھونے تک کی بھی اجازت نہیں دیتا۔

(۱۱۹۸) یہ شعر خدا کی خاص ذات کے متعلق ہے۔ کہتا ہے۔ کہ خدا نے ایسا ایک پردہ تان رکھا ہے (مراد پردہ قدرت) کہ اگر اس کو کوئی اُٹھانا چاہے یعنی یہ دیکھنا چاہے کہ قدرت کے پس پشت کیا ہے۔ تو یہ بات ممکن ہی نہیں ہے تو پھر کون بتا سکتا ہے کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے۔ یا یہ ظہور قدرت کس کی بدولت ہے۔

(۱۱۹۹) لغت۔ موت بن آئے نہ رہے۔ یعنی وہ ضرور آ ئے گی خواہ اُسے بلاؤں یا نہ بلاؤں۔ اُس کو بلائے نہ بنے۔ یعنی دوست کبھی بلانے سے بھی نہیں آتا۔

حل۔ میں موت کی انتظار نہیں کرتا۔ کیونکہ وہ بن آئے نہیں رہیگی۔ اسی طرح اگر تم کو چاہوں کہ نہ آؤ۔ مراد یہ کہ تمھاری انتظاری بھی نہ کروں۔ تو موت کی طرح تمھیں بھی بن آئے نہیں رہنا چاہئے۔ مگر تم مثل موت کے کہاں آتے ہو۔ بلکہ تم کو تو اگر بلاؤں بھی تو یہ بات نہیں بنتی۔ یعنی تم ہرگز نہیں آتے۔ حاصل شعر یہ کہ موت بن بلائے آتی ہے۔ اور دوست کو بلائیں بھی تو نہیں آتا۔

(۱۲۰۰) کام وہ آن پڑا ہے۔ یعنی کام اس قدر ضیق میں پڑ گیا ہے یا کام میں ایسی کچھ دقت سی آ پڑی ہے۔ کہ اب یہ بنائے سے بھی نہیں بنتا۔ یہ گویا اس بوجھ کی مانند ہے۔ کہ (سر پر رکھا تھا۔ تو اُٹھائے لئے جاتے تھے) اب سر سے گر گیا تو اسے دوبارہ اُٹھا کے خود سر پر بھی نہیں رکھ سکتے۔ مراد یہ کہ کام چلتے چلتے ایسا رک گیا ہے۔ کہ اب کسیطرح چالو ہی نہیں ہو سکتا۔

(۱۲۰۱) اے غالب ہمیں عشق پر یہ طاقت حاصل نہیں ہے۔ کہ اگر

پڑ نہ گئے۔ تو اس کو کسی طرح ضرور لگا لیں۔ یا اگر لگا ہو۔ تو اس کو کسی طرح دُور کر سکیں۔ کیونکہ اس کا لگنا نہ لگنا ہمارے بس کا نہیں ہے۔ یہ ایک بات قدرتی ہے۔ جیسے کہ آگ کوئی خود کہیں لگانا چاہے۔ تو حوصلہ نہیں پڑتا۔ اور اگر کہیں لگی ہو تو اکثر اوقات وہ جلا ہی کے رہتی ہے۔ کبھی بجھائے نہیں بجھتی۔

غزل

چاک کی خواہش اگر وحشت بہ عریانی کرے (۱۲۰۲)
صبح کی مانند زخم دل گریبانی کرے

(۱۲۰۳) جلوہ کا تیرے وہ عالم ہے کہ گر کیجے خیال
دیدۂ دل کو زیارت گاہ حیرانی کرے

ہے شکستن سے بھی دل نومید یارب کب تلک (۱۲۰۴)
آبگینہ کوہ پر عرض گراں جانی کرے

(۱۲۰۵) میکدہ گر چشم مست ناز سے پاوے شکست
موئے شیشہ دیدہ ساغر کی مژگانی کرے

خط عارض سے لکھا ہے زلف کو الفت نے عہد (۱۲۰۶)
یک قلم منظور ہے جو کچھ پریشانی کرے

(۱۲۰۲) چاک۔ یعنی چاک گریبان کرنا۔ یا کپڑے اتار کر پھینک دینا اکثر انتہائے رنج کی حالت میں کیا جاتا ہے۔ اگر تو وحشت یا رنج دل ایسا چاک کرنے کا ارادہ کرے۔ تو ظاہر ہے کہ یہ انتہائے رنج و غم ہے۔

اس شعر کی حقیقت اسی "چاک" کے مفہوم پر منحصر ہے۔

حل شعر۔ اگر وحشت دل اپنی عریانی کے لئے چاک یعنی کپڑے پھاڑ دینے کی خواہش کرے۔ جیسے کہ انتہائے غم کی حالت میں کیا جاتا ہے۔ تو پھر ہمارا زخم دل یعنی دل کا رنج و غم بھی صبح کی طرح گریبانی کرے۔ یعنی چاک گریباں کرے (صبح کو عموماً چاک گریباں سے نسبت کیا جاتا ہے)

(۱۲۰۳) تیرے حسن و جمال کا وہ عالم ہے۔ کہ اگر اس کا خیال ہی دل میں آ جائے۔ تو دل کی آنکھیں اس قدر حیران ہو کے رہ جاتی ہیں۔ کہ گویا وہ حیرانی کی زیارت گاہ بن جاتی ہیں۔

(۱۲۰۴) یارب اب ہمارا دل ٹوٹنے سے بھی ناامید ہو گیا (حالانکہ دل کا ٹوٹنا تو ایک معمولی سی بات ہے۔ مگر ہمارا محبوب یہ سلوک بھی ہمارے ساتھ گوارا نہیں کرتا۔) گویا وہ محبوب اپنی سنگدلی کی وجہ سے مثل کوہ کے ہے۔ اور ہمارا دل مانند (آبگینہ یا) شیشے کے ہے۔ لہذا یہ شیشہ کب تک پہاڑ پر اپنی گرانجانی یعنی رنج کی حالت کو عرض کیا کریگا۔ اور پہاڑ اس کو کبھی نہیں توڑیگا۔ تاکہ خاتمہ ہو کر وہ غم سے چھوٹ جائے۔

(۱۲۰۵) مست کی آنکھ سرخ اور نشیلی ہوتی ہے۔ گویا وہ ایک میکدے کو مات کیا کرتی ہے۔ مطلب شعر۔ اگر اس کی ناز بیں آنکھ سے شراب خانہ شکست کھا جائے (اور وہاں شراب کے پیالے وغیرہ ٹوٹ جائیں) تو موئے شیشہ یعنی شراب کی بلوریں صراحی میں جو بوجہ اس کے ٹوٹنے کے بال آ جائے۔ وہ شراب کے پیالے کی مژگانی کرے گا۔ یعنے اس میں بطور پلکوں کے لگ جائیگا۔ (کیونکہ صراحی سے پیالہ پڑا

ہوا ہوگا۔ تو اس کا بال اس میں دکھائی دیگا۔) اور ایک عالم حیرت پیدا ہو جائے گا۔

(۱۲۰۶) خط عارض۔ نوجوانوں کے منہ پر روئیں پھوٹنے کا سیاہ نشان عہد لکھا ہے۔ یہاں مراد یہ اقرار کیا ہے۔ کہ زلف دوست جو کرنا چاہے کرے یک قلم۔ تمام تر۔ کلہم۔

مطلب شعر۔ دوست کے منہ پر سیاہ خط آ گیا ہے لہذا ہماری محبت نے سیاہ خط سے زلف دوست کے نام یہ اقرار لکھا ہوا فرض کر لیا ہے۔ کہ وہ دوست کی زلف (جو خط عارض کی حریف ہے) پریشانی کرے یعنی پھیل کر خط عارض پر جسقدر دست تطاول پھیلانا چاہے یعنی جو پریشانی کرنا چاہے کرے ہمیں کلہم منظور ہے۔ حاصل شعر یہ کہ باوجودیکہ دوست کے عارض پہ خط آ گیا ہے۔ ہمیں اس کے ساتھ تعلق خاطر منظور ہے۔ اور خط کو زلف دوست کی محبت کے آگے ہیچ قرار دیتے ہیں۔

غزل

(۱۲۰۷) وہ آ کے خواب میں تسکین اضطراب تو دے
دے مجھے تپش دل مجال خواب تو دے

(۱۲۰۸) کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا
تری طرح کوئی تیغ نگہ کو آب تو دے

(۱۲۰۹) دکھا کے جنبش لب ہی تمام کر ہم کو
نہ دے جو بوسہ تو منہ سے کہیں جواب تو دے

(۱۲۱۰) پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے (۱۲۱۱)
کہا جو اُس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

(۱۲۰۷) وہ مجھ کو خواب میں دکھائی دے کے مجھے تسکین اضطراب تو دے۔ یعنی میرے بیقرار دل کو تسلی تو ضرور دے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ میری تپش دل بھی تو مجھ کو سونے کی مجال یا اجازت دے۔ یعنی میں سو ہی نہیں سکتا۔ تو دوست کا خواب کیسے دیکھوں۔ گویا اس قدر محروم دیدار ہوں۔

(۱۲۰۸) تیغ نگاہ کو آب دینا۔ یعنی معشوق کی نگاہ تو تلوار ہوا ہی کرتی ہے۔ اُسکو آب دیکر یہاں اور پُر اثر کرنا مراد ہے

حل شعر۔ لگاوٹ کے مختلف معنی ہیں۔ مثلاً لگاؤ یا تعلق۔ دوستی۔ ناز و انداز۔ اور چھیڑ چھاڑ وغیرہ۔ یہاں مراد عاشق سے دل لگی یا چھیڑ خانی کرنا۔ اور اس کا جواب پاکر تحمل نہ کرنا۔ اور رو دینا۔ یا اظہار دوستی کے طور پر عاشق سے اوپرے دل کے ساتھ ہمدردی جتانا۔ اور جھوٹ موٹ رو دینا وغیرہ۔ کہتا ہے۔ تیرا لگاوٹ میں رو دینا۔ ہم کو قتل کئے ڈالتا ہے۔ تیری طرح کوئی شمشیر نظر میں کوئی آبداری تو پیدا کرے۔

(۱۲۰۹) اگر تو بوسہ دینا نہیں چاہتا۔ تو منہ سے جواب ہی دیدے۔ تاکہ تیرے انکار کے سبب ہم تیرے ہونٹ ہلتے ہوئے دیکھ کے تمام ہو جائیں یعنی مر جائیں۔

(۱۲۱۰) اوک۔ چُلّو۔ پنجابی "بُک" اے ساقی اگر تو ہم سے نفرت کرتا ہے۔ اور اسی وجہ سے اپنے برتن میں شراب نہیں پلاتا۔ تو ایسا کوئی برتن یا پیالہ نہ سہی۔ ہمیں اپنے اوک ہی میں شراب پلا دے۔ ہم کسی نہ کسی طرح اُسے ضرور رکھیں گے (اوک دونوں چلو ملانا)

(۱۲۱۱) ہاتھ پاؤں پھولنا۔ گھبرا جانا۔ حواس باختہ ہونا۔ اسے اسد خوشی سے میں کچھ گھبرا سا گیا۔ جب دوست نے مجھے یہ کہا کہ میرے پاؤں ذرا داب تو دے۔ (یعنی اُس کی اتنی عنایت پر میں آپے سے باہر ہو گیا)

غزل

تپش سے میری وقف کشمکش ہر تار بستر ہے
مرا سر رنج بالیں ہے مرا تن بار بستر ہے

(۱۲۱۳) سرشک سر بصحرا دادہ نور العین دامن ہے
دل بیدست و پا افتادہ [illegible] ہے

خوشا اقبال رنجوری عیادت کو تم آئے ہو (۱۲۱۴)
فروغ شمع بالیں طالع بیدار بستر ہے

(۱۲۱۵) بہ طوفان گاہ جوش اضطراب شام تنہائی
شعاع آفتاب صبح محشر تار بستر ہے

ابھی آتی ہے بو بالش سے اُسکی زلف مشکیں کی (۱۲۱۶)
ہماری دید کو خواب زلیخا عار بستر ہے

(۱۲۱۷) کہوں کیا دل کی کیا حالت ہے ہجر یار میں غالبؔ
کہ بیتابی سے ہر اک تار بستر خار بستر ہے

(۱۲۱۷) اے غالب دوست کی جدائی میں میرے دل کی کیا حالت ہے اس کی کیفیت کیا بیان کروں۔ کہ بوجہ بیقراری کے مجھے اپنے بستر کا ہر تار خار بستر معلوم ہوتا ہے۔ یعنی اس کا ہر دھاگہ کانٹا بن گیا ہے۔

(۱۲۱۳) سر بصحرا دادہ۔ جنگل کی طرف رُخ کرکے جانے والا میرا آنسو جو کہ جنگل کی طرف رُخ کرکے جا رہا ہے۔ اور ابھی میرے دامن تک پہنچا ہے۔ وہ میرے دامن کی آنکھوں کا نور ہے۔ (یعنی مثل بیٹے کے عزیز ہے۔) اور میرا بیدست و پا یعنی عاجز دل جو افتادہ ہے۔ یعنی بستر پر دھرا ہوا ہے۔ (اور بوجہ عجز بستر سے اُٹھ نہیں سکتا۔) وہ بستر کو مثل برخوردار یا بیٹے کے پیارا معلوم ہوتا ہے۔ مراد یہ کہ آنسو جیسے طفل اشک بھی کہا کرتے ہیں۔ وہ اور میرا دل جس کو یہاں لڑکا فرض کیا ہے۔ مجھے یہ دونوں بہت عزیز ہیں۔ اور کبھی یہ مجھ سے جدا نہ ہوں گے۔

(۱۲۱۴) بیمار ہو کر میں بستر پر پڑا ہوں۔ میری یہ بیماری یا رنجوری گویا اقبال مند ہو گئی ہے۔ (مراد میرا فخر بڑھ گیا۔) کہ آپ میری بیمار پُرسی کو آئے۔ میرے تکیہ کے قریب جو شمع رکھی ہے۔ وہ گویا اس امر کا اظہار کر رہی ہے۔ کہ میرے بستر کا نصیبہ جاگ اُٹھا۔ کہ تم آ کے بستر پر بیٹھے اور بیمار پُرسی کی۔ یا شمع جلتی ہے اور لوگ عیادت کو آتے ہیں تو خود شمع

(۱۲۱۵) شام فراق۔ جو سخت شرمادینے والی ہوتی ہے۔ اس کے جوش اضطراب کے طوفان میں (گویا میری بیقراری میں جو شام فراق کی

وجہ سے ہے۔) ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ روز قیامت کے صبح کے آفتاب کی ہر ایک کرن میرے بستر کی ہر تار بن گئی ہے۔ یعنی قیامت کا آفتاب جیسے سخت تکلیف دہ ثابت ہوگا۔ (جو موجودہ آفتاب سے بھی کئی گنا زیادہ گرم بتایا جاتا ہے۔) میرا بستر بھی اسی طرح مجھ کو یہاں عذاب پہنچا رہا ہے۔

(۱۲۱۶) خواب ہمیشہ ایسی چیز کا آیا کرتا ہے۔ کہ جو نصیب نہ ہو۔

مطلب شعر۔ ہماری دید یعنی دیکھنے اور لطف اُٹھانے کو زلیخا کا خواب (گویا اس کا خواب و خیال یا خواہش) موجب ننگ و عار ہے۔ کیونکہ ابھی ابھی (رات کو وہ ہمارے پاس سوتا تھا۔ اور) اُس کی خوشبودار زلفوں کی بُو ابتک ہمارے تکیہ سے ہم کو پہنچ رہی ہے۔ اور اس کی یاد دلا رہی ہے۔ تو زلیخا کی طرح محض خواب وصال یوسف سے ہمیں عار ہے۔

(۱۲۱۷) اے غالب دوست کے فراق میں میرے دل کی کیا حالت ہو گئی ہے۔ اس کی نسبت کیا کہوں۔ کیونکہ بیقراری کے سبب میرے بستر کا ہر تار گویا ایک ایک کانٹا بن گیا ہے۔ کہ بستر پر پڑا ہوا مجھ کو چبھ رہا ہے۔

(۱۲۱۸) خطر ہے رشتۂ الفت رگ گردن نہ ہو جاوے
غرور دوستی آفت ہے تو دشمن نہ ہو جاوے

(۱۲۱۹) سمجھ اس فصل میں کوتاہیٔ نشو و نما غالبؔ
اگر گل سرو کی قامت پہ پیراہن نہ ہو جاوے

(۱۲۱۸) دوست سے کہتا ہے۔ چونکہ تو یکتائے محبوب ہے۔

اور تیری دوستی کے لئے بڑے بڑے مرتے ہیں۔ مگر مجھ کو یہ تیری دوستی حاصل ہے۔ تو مجھے ڈر ہے۔ کہیں یہ رشتۂ الفت میری رگ گردن نہ بن جائے۔ (رگ گردن مراد غرور سے رنگیں پھول جانا۔) اور میں تجھ سے غرور کرنے لگوں۔ تو میرا یہ غرور دوستی تجھے ناگوار گزرے۔ اور تو میرا دشمن بن جائے۔ اور یہ بات میرے لئے ایک آفت ثابت ہو۔

(۱۲۱۹) موسم بہار میں پودوں کی نشوونما ہوا کرتی ہے۔ اسی سے کہتا ہے۔ اے غالب اگر گل یعنی گلاب کا پھول نشوونما پاکر سرو کے درخت پر بطور پیراہن (چوغہ) نہ پھیل جائے۔ تو اس سے موسم بہار میں تو اس کی نشوونما میں کچھ قصور تصور کر۔

غزل

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے (۱۲۲۰)
نالہ پابند نے نہیں ہے

(۱۲۲۱) کیوں بوتے ہیں باغبان تونبے
گر باغ گدائے مے نہیں ہے

ہر چند ہر ایک شے میں تو ہے (۱۲۲۲)
پر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہے

(۱۲۲۳) ہاں کھائیو مت فریب ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

شادی سے گذر کہ غم نہ ہووے (۱۲۲۴)
اردی جو نہ ہو تو دے نہیں ہے

(۱۲۲۵) کیوں رد قدح کرے ہے زاہد
مے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے

ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالب (۱۲۲۶)
آخر تو کیا ہے اے نہیں ہے

(۱۲۲۰) فریاد یا واویلا مچانے میں کسی لے یا سُر تال نکالنے کی حاجت نہیں ہوا کرتی۔ کیونکہ نالہ یعنی گریہ وزاری پابند نے نہیں ہے یعنی کوئی بانسری لیکر روتا دھوتا نہیں۔ کہ فریاد میں ضرور سُر تال ہی کا وجود ہو۔

(۱۲۲۱) باغبان کیوں باغ میں تونبے بویا کرتے ہیں۔ اگر باغ بھی شراب کا منگتا نہیں ہے۔ مراد یہ کہ باغ جہاں کہیں ہوگا۔ وہ تحریک دلائیگا کہ وہاں میخواری بھی ضرور ہو۔

(۱۲۲۲) باوجودیکہ تو ہر چیز میں موجود ہے۔ مگر اس پر بھی تو سب سے علیحدہ ہے۔ یعنی ایسا نظر آتا ہے۔ کہ تجھ سی تو یہاں کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ یعنی تو قدرت ہے۔ اور پھر ظہور قدرت بھی ہے۔ کہ جس کی یہاں اور کوئی نظیر ہی نہیں۔

(۱۲۲۳) ہاں یعنی تاکیداً کہتا ہوں۔ کہ تو کبھی یہ دھوکا نہ کھائیو کہ ہستی بھی کوئی چیز ہے۔ یعنی یہ دنیا یا تیری زندگی بھی کوئی وجود رکھتی ہے۔ نہیں۔ اگرچہ تجھے بہتیرا کہیں کہ یہ ہے تو یہی سمجھنا کہ نہیں ہے (مراد کائنات فانی ہے۔)

(۱۲۲۴) خوشی سے درگذر کر یعنی اس کا کچھ دھیان ہی دل میں نہ لا۔

تاکہ تجھے اس کی یاد رنجیدہ نہ کرے۔ کیونکہ اُردی یعنی موسم بہار اگر نہیں ہوگا۔ تو وہ یا خزاں کا موسم بھی اُس کے بالمقابل نہیں ہو سکیگا۔ کیونکہ خزاں تو بہار ہی کی اُجڑی ہوئی حالت کا نام ہوتا ہے۔

(۱۲۲۵) مگس کی قے سے مراد شہد۔ زاہد سے اس کا تعلق اس لئے یہاں ظاہر کیا۔ کہ بہشت میں زاہد کو شہد بھی نہریں بھر کے دیا جائیگا۔

مطلب شعر۔ اے زاہد تو شراب کا پیالہ پینے سے کیوں انکار کرتا ہے اس لئے کہ یہ مکھیوں کی قے یعنی وہ شہد نہیں ہے۔ جو تجھ کو جنت میں ملے گی۔ مراد یہ کہ مے جنت کی شہد سے اچھی ہے۔ تو اسس کو بخوشی پی لے۔

(۱۲۲۶) اے غالب نہ تو تُو ہستی ہے۔ (یعنی جیتا ہے) اور نہ کچھ عدم ہے۔ یعنی مرکے معدوم ہو چکا ہے۔ تو پھر تو آخر کیا ہے۔ یعنی کس حالت میں ہے۔ بطور تعجب یا تاسف کہتا ہے۔ اے کیا تو نہیں ہے۔ یعنی اب دنیا سے تو گذر گیا ہے۔ یا ہے تو ایسی حالت میں کہ گویا نہیں ہے ایک بیمار جب قریب المرگ ہو۔ مگر اُس کی زندگی و موت میں کچھ تمیز نہ ہو سکے۔ تو اس وقت کی حالت کا اظہار کیا ہے۔

دوسرے معنی۔ اے غالب انسان کو ہست بھی بتاتے ہیں۔ اور نیست بھی۔ لیکن تجھ میں نہ تو ہستی کے آثار ہیں۔ نہ کچھ نیستی کے۔ تو آخر کیا تو ان دونوں میں سے یعنی ہستی و نیستی میں سے "اے کیا" کچھ بھی نہیں ہے۔ مراد یہ کہ اگر تو ہست ہے۔ تو تیرا یوں بے بقا ہونا قابل افسوس ہے۔ اور اگر تو نیست ہے تو قابل تعجب ہے۔ کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تو یہاں نہیں ہے جبکہ بہر حال انسان کا یہ وجود وانجام ایک معمہ ہے۔

نہ پوچھ نسخۂ مرہم جراحت دل کا (۱۲۲۷)
کہ اس میں ریزۂ الماس جزو اعظم ہے

(۱۲۲۸) بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی
وہ اک نگہ کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے

(۱۲۲۷) دل کی جراحت یعنی چیر پھاڑ کرنے کے بعد جو نسخہ مرہم کا استعمال کیا جا رہا ہے تو اس کا حال نہ پوچھ کہ اس کا جزو اعظم ہیرے کی کنی ہے۔ جو کہ زخم کو دگنا کر دیا کرتی ہے۔ یا جس کے کھانے سے انسان مر جایا کرتا ہے۔

(۱۲۲۸) ہم بہت دنوں تک تیری ایک نگاہ کرم کے منتظر رہے۔ تو تُو نے ہماری طرف کن انکھیوں سے دیکھا۔ گویا پوری طرح نگاہ بھر کے بھی نہ دیکھا۔ کہ جس سے ثابت ہوا ابھی تو ہم سے لاپروا یا نفور ہے۔

غزل

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے (۱۲۲۹)
مرتے ہیں ولے اُن کی تمنا نہیں کرتے

(۱۲۳۰) در پردہ اُنھیں غیر سے ہے ربط نہانی
ظاہر کا یہ پردا ہے کہ پردا نہیں کرتے

یہ باعث نومیدیٔ ارباب ہوس ہے (۱۲۳۱)
غالب کو بُرا کہتے ہو اچھا نہیں کرتے

(۱۲۲۹) تمنا کرنا - یہاں مراد عاشق ہونا۔

حل - ہم بظاہر اُن پر مرے جاتے ہیں۔ یعنی اس کی چاہت کرتے ہیں مگر اس کے عاشق نہیں بن جاتے۔

(۱۲۳۰) جو صورت سب کے سامنے بے پردہ آتی جاتی ہو۔ اس کی نسبت ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔ کہ وہ کس کی آشنا ہے۔ لہذا کہتا ہے کہ دوست نے جو بظاہر پردہ اُٹھا دیا ہے۔ یہ دراصل اپنے راز محبت پر ایک پردہ ڈال دیا ہے۔ کیونکہ اندرونی طور پر وہ غیر سے ربط منافی رکھتا ہے۔ یعنی اسے خفیہ محبت ہے۔ بظاہر وہ سب سے ملتا جلتا ہے۔ کہ کسی کو شک نہ پیدا ہو۔

(۱۲۳۱) تم غالب کو بُرا آدمی خیال کرتے ہو۔ اس لئے کہ وہ تمہارے وصال سے بوجہ اپنی بے انتہا کوشش کے کامیاب ہو گیا ہے۔ تو یہ بات اچھی نہیں۔ کیونکہ یہ امر اہل ہوس کی نا امیدی کا باعث ہو گیا ہے۔ کیونکہ اب وہ سمجھنے لگے ہیں۔ کہ تم غالب کے دوست ہو گئے ہو۔ اور یہ حالت مجبوری۔

دوسرے معنی۔ آپ نے غالب کو بُرا آدمی کہا۔ یا اچھا نہیں جانتے۔ حالانکہ سب اُس کو اچھا آدمی بتاتے ہیں۔ تو آپ کی اس بے انصافی سے اہل ہوس بھی ناامید ہو گئے کہ ایسے بے انصاف انسان سے کسی بات کی توقع رکھنی ہی فضول ہے۔

تیسرے معنی - غالب جو تمہارا اس قدر جاں نثار ہے تم اس کو بھی بُرا بتاتے ہو۔ تو یہ بات اچھی نہیں۔ کیونکہ یہ حال دیکھکر رقیب یا ارباب ہوس بھی تم سے ناامید ہو چکے ہیں۔

غزل

(۱۲۳۲) کرے ہے بادہ ترے لب سے کسب رنگ فروغ
خط پیالہ سراسر نگاہ گلچیں ہے

(۱۲۳۳) کبھی تو اس دل شوریدہ کی بھی داد ملے
کہ ایک عمر سے حسرت پرست بالیں ہے

(۱۲۳۴) بجا ہے گر نہ سنے نالہ ہائے بلبل زار
کہ گوش گل نم شبنم سے پنبہ آگیں ہے

(۱۲۳۵) اسد ہے نزع میں چل بیوفا برائے خدا
مقام ترک حجاب و وداع تمکیں ہے

(۱۲۳۲) تو شراب پیتا ہے۔ تو (باوجودیکہ شراب سرخ ہوا کرتی ہے۔ وہ بھی یعنی) شراب تیرے ہونٹوں سے سرخی حاصل کر کے اپنی سرخی کو اور بڑھا جاتی ہے۔ اور اس سے شراب کے پیالے کا خط مدور۔ تمامتر گلچیں کی نظر بن جاتا ہے۔ یعنی جس طرح مالی کی آنکھوں کو لال لال پھول ہی دکھائی دیتے ہیں۔ ساغر کا وہ خط بھی تیرے ہونٹوں کی سرخی کا اسی طرح جلوہ دیکھتا ہے۔

(۱۲۳۳) سر شوریدہ - دیوانہ سر۔ کہ جس کو جنگلوں میں مارا مارا پھرنا پڑتا ہے۔ اور آرام سے کہیں سو نہیں سکتا۔ داد ملے۔ انصاف دیا جائے۔ حسرت پرست بالیں۔ تکیہ پر آرام کرنے کی حسرت کا خواہش مند۔

حل شعر ۔ کبھی تو میرے اس دیوانے سر کی بھی تو داد دے ۔ یعنی اس کو آرام کرنے کا موقع دے ۔ کہ ایک عرصہ دراز سے یہ تکیہ پر سونے کی حسرت پال رہا ہے ۔ یعنی اس کا آرزومند ہے ۔

(۱۲۳۴) اگر پھول بلبل زار کے نالے نہ سنے تو اس کا ایک سبب ہے ۔ جس کے رو سے یہ درست ہے ۔ یعنی پھول کے کان میں شبنم کی نمی روئی کے گالے کی طرح بھری ہوئی ہے ۔ پھول معشوق ہے ۔ وہ بلبل کی کیوں سنے ۔

(۱۲۳۵) ایک مرد جب مر جاتا ہے ۔ تو پردہ دار عورتیں بھی میت کے قریب آ کے اس کا چہرہ دیکھ سکتی ہیں ۔ لہذا کہتا ہے کہ اسد حالت نزع میں ہے ۔ اب اس وقت تو اے بے وفا دوست اُس کے پاس تو چل ۔ یہ موقع ایسا ہے کہ میت سے ترک حجاب کیا جاتا ہے اور مرنے والے سے غرور و تکبر کرنا بھی چھوڑ دیا جاتا ہے ۔

(۱۲۳۶) کیوں نہ ہو چشم بتاں محو تغافل کیوں نہ ہو
یعنی اس بیمار کو نظارہ سے پرہیز ہے

(۱۲۳۷) مرتے مرتے دیکھنے کی آرزو رہ جائے گی
وائے ناکامی کہ اُس کافر کا خنجر تیز ہے

عارض گل دیکھ روئے یار یاد آیا اسدؔ
جوشش فصل بہاری اشتیاق انگیز ہے

(۱۲۳۶) حل شعر ۔ معشوقوں کی آنکھ کس لئے عاشق سے غفلت برتنے میں مشغول نہ ہو ۔ جبکہ اُن کے اس بیمار یعنی چشم بیمار ۔ مراد آنکھ

کو عشاق کے نظارہ کرنے سے پرہیز لازمی ہے ۔ یعنی بیمار شخص کوئی پرہیز ضرور کیا ہی کرتا ہے ۔

(۱۲۳۷) مرتے مرتے یعنی اس قاتل کے ہاتھ سے قتل ہوتے ہوئے اس کو جی بھر کے دیکھنے کی ہوس دل ہی میں رہ جائیگی ۔ لہذا ہمیں اس ناکامی کا افسوس ہے ۔ کیونکہ اس کافر کا خنجر بہت تیز ہے ۔ جو بہت جلدی ہمیں قتل کر دے گا ۔ ذرا رک رک کر چلے تو ہم اچھی طرح اُسے دیکھ سکیں ۔ (رک رک کر خنجر چلے مراد زیادہ ایذا پہنچائے)

(۱۲۳۸) اے اسد پھول کا رخسار دیکھکر ہمیں دوست کا چہرہ یاد آگیا ۔ تو ہم رو پڑے ۔ کیونکہ موسم بہار میں بہار کا جوش بہت اشتیاق یا شوق وصل پیدا کرنے والا ہوتا ہے ۔

غزل

(۱۲۳۹) دیا ہے دل اگر اُس کو بشر ہے کیا کہئے
ہوا رقیب تو ہو نامہ بر ہے کیا کہئے

(۱۲۴۰) یہ ضد کہ آج نہ آئے اور آئے بن نہ رہے
قضا سے شکوہ ہمیں کس قدر ہے کیا کہئے

(۱۲۴۱) رہے ہے یوں گہ و بیگہ کہ کوئے دوست کو اب
اگر نہ کہئے کہ دشمن کا گھر ہے کیا کہئے

(۱۲۴۲) زہے کرشمہ کہ یوں دے رکھا ہے ہم کو فریب
کہ بن کہے ہی اُنہیں سب خبر ہے کیا کہئے

(۱۲۴۳) بجوم کے کرتے ہیں بازار میں وہ پرسش حال
کہ یہ کہے کہ سرِ رہگذر ہے کیا کہیے

(۱۲۴۴) تمھیں نہیں ہے سرِ رشتۂ وفا کا خیال
ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے مگر ہے کیا کہیے

(۱۲۴۵) اُنھیں سوال پہ زعمِ جنوں ہے کیوں لڑیئے
ہمیں جواب سے قطع نظر ہے کیا کہیے

(۱۲۴۶) حسد سزائے کمالِ سخن ہے کیا کیجے
ستم بہائے متاعِ ہنر ہے کیا کہیے

(۱۲۴۷) کہا کسی نے کہ غالبؔ بُرا نہیں لیکن
سوائے اس کے کہ آشفتہ سر ہے کیا کہیے

(۱۲۳۹) اگر ہمارا نامہ بر دوست پر عاشق ہو کے ہمارا رقیب بن بیٹھا ہے۔ تو اُسے کیا کہئے۔ وہ بھی آخر انسان ہے۔ اگر دوست کو اُس نے دل دیا۔ تو اس امر میں کیا بحث (ہر شخص حسینوں کا عاشق ہو ہی جایا کرتا ہے۔)

(۱۲۴۰) موت ایک دن ضرور آئے گی۔ اور بغیر آئے کے وہ نہیں رہے گی۔ مگر اُس کو ضد ہے۔ کہ آج وہ نہیں آئے گی۔ جب کہ ہم اُس کے خواہاں ہیں۔ لہذا اپنی قضا یا موت سے ہمیں جس قدر شکوہ یا گلا ہے۔ اس کا کیا بیان کریں۔

(۱۲۴۱) گہ و بیگہ۔ وقت بے وقت۔ دشمن ہمارے دوست کے کوچہ میں یوں وقت بے وقت پڑا رہتا ہے۔ کہ اگر اس کو ہم کوا ان کا گھر نہ کہیں تو اور کیا کہہ سکتے ہیں۔

(۱۲۴۲) زہے کرشمہ۔ یہاں مراد عجیب و غریب اشارہ و کنایہ۔ میرے ساتھ وہ دوست کچھ ایسے عجیب و غریب اشارہ و کنایہ برتتا ہے کہ میں سے میں اُس کے فریب میں آ گیا ہوں۔ اور خیال کرتا ہوں۔ کہ اب میرے کہنے کی بھی کچھ حاجت نہیں۔ وہ میرا حال بن کہے ہی سب جانتا ہے

(۱۲۴۳) وہ میری پرسش حال سرِ بازار یہ سمجھ کے (یا اس نیت سے) کرتے ہیں۔ کہ میں انھیں بازار میں ملوں۔ تو مجھے کہنا پڑے۔ کہ اپنا حال (جو حسن و عشق کی باتیں ہیں) ایک ایسے رستے پر کہ سب آتے جاتے ہیں کیسے تم سے کہوں۔

(۱۲۴۴) تمھیں تو رشتۂ وفا کا کچھ خیال ہی نہیں ہے۔ یعنی اس دوستی کے تعلق کی مطلق پروا ہی نہیں کرتے۔ مگر ہمارے ہاتھ میں کوئی چیز ہے۔ آپ فرمائیں وہ کیا ہے۔ مراد رشتۂ وفا ہمارے ہاتھ میں تو ہے مگر تم نے یہ رشتہ توڑ دیا ہے۔ تمھیں کیا خبر کہ کیا ہے؟

(۱۲۴۵) دوست کو کچھ وہم سا ہو گیا ہے۔ کہ مجھے وہ دیوانہ سمجھتا ہے۔ لہذا اُس سے کوئی سوال کر کے میں لڑائی کیوں مول لوں۔ ادھر میرا یہ حال کہ سوال تو اُس سے کر بیٹھتا ہوں۔ مگر پھر جواب سے قطع نظر کر لیتا ہوں۔ یعنی جواب کی کچھ پرواہ نہیں کرتا۔ حاصل شعر یہ کہ میں کچھ خبطی سا آدمی ہوں۔ اپنے ہی خبط میں مست نہ سوال کرنے کا سلیقہ۔ نہ جواب حاصل کرنے کا۔

(۱۲۴۶) ہمارے کمالِ سخن کو دیکھکر لوگ حسد کرتے ہیں۔ تو گویا یہ اپنی شعر گوئی کی ہمیں سزا ملی ہے۔ (آہ) ایسے حاسد لوگوں کا کیا کیجے۔

بھوکے کرتے ہیں بازار میں وہ پرسش حال (۱۲۴۳)
کہ یہ کہے کہ سر رہگذر ہے کیا کہئے

نہیں نہیں ہے سر رشتۂ وفا کا خیال (۱۲۴۴)
ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے مگر ہے کیا کہئے

اُنھیں سوال پہ زعم جنوں ہے کیوں لڑیئے (۱۲۴۵)
ہمیں جواب سے قطع نظر ہے کیا کہئے

حسد سزائے کمال سخن ہے کیا کیجے (۱۲۴۶)
ستم بہائے متاع ہنر ہے کیا کہئے

کہا کسی نے کہ غالب بُرا نہیں لیکن (۱۲۴۷)
سوائے اس کے کہ آشفتہ سر ہے کیا کہئے

(۱۲۳۹) اگر ہمارا نامہ بر دوست پر عاشق ہو کے ہمارا رقیب بن بیٹھا ہے۔ تو اُسے کیا کہئے۔ وہ بھی آخر انسان ہے۔ اگر دوست کو اُس نے دل دیا۔ تو اس امر میں کیا بحث (ہر شخص حسینوں کا عاشق ہو ہی جایا کرتا ہے۔)

(۱۲۴۰) موت ایک دن ضرور آئے گی۔ اور بغیر آئے کے وہ نہیں رہے گی۔ مگر اس کو ضد ہے۔ کہ آج وہ نہیں آئے گی۔ جب کہ ہم اُس کے خواہاں ہیں۔ لہٰذا اپنی قضا یا موت سے ہمیں جس قدر شکوہ یا گلا ہے۔ اس کا کیا بیان کریں۔

(۱۲۴۱) گہ و بیگہ۔ وقت بے وقت۔ دشمن ہمارے دوست کے کوچہ میں یوں وقت بے وقت پڑا رہتا ہے۔ کہ اگر اس کو پوچھو اس کا گھر نہیں تو اور کیا کہہ سکتے ہیں۔

(۱۲۴۲) زہے کرشمہ۔ یہاں مراد عجیب و غریب اشارہ و کنایہ۔ میرے ساتھ وہ دوست کچھ ایسے عجیب و غریب اشارہ و کنایہ برتتا ہے۔ کہ میں سے میں اُس کے فریب میں آگیا ہوں۔ اور خیال کرتا ہوں۔ کہ اب میرے کہنے کی بھی کچھ حاجت نہیں۔ وہ میرا حال بن کہے ہی سب جانتا ہے

(۱۲۴۳) وہ میری پرسش حال سر بازار یہ بھوکے (یا اس نیت سے) کرتے ہیں۔ کہ میں انھیں بازار میں ملوں۔ تو مجھے کہنا پڑے۔ کہ اپنا حال (جو حسن و عشق کی باتیں ہیں) ایک ایسے رستے پر کہ سب آتے جاتے ہیں کیسے تم سے کہوں۔

(۱۲۴۴) تمھیں تو رشتۂ وفا کا کچھ خیال ہی نہیں ہے۔ یعنی اس دوستی کے تعلق کی مطلق پرواہی نہیں کرتے۔ مگر ہمارے ہاتھ میں کوئی چیز ہے۔ آپ فرمائیں وہ کیا ہے۔ مراد رشتۂ وفا ہمارے ہاتھ میں تو ہے مگر تم نے یہ رشتہ توڑ دیا ہے۔ تمھیں کیا خبر کہ کیا ہے؟

(۱۲۴۵) دوست کو کچھ وہم سا ہو گیا ہے۔ کہ مجھے وہ دیوانہ سمجھتا ہے۔ لہٰذا اُس سے کوئی سوال کر کے میں لڑائی کیوں مول لوں۔ ادھر میرا یہ حال کہ سوال تو اُس سے کر بیٹھتا ہوں۔ مگر پھر جواب سے قطع نظر کر لیتا ہوں۔ یعنی جواب کی کچھ پرواہ نہیں کرتا۔ حاصل شعر یہ کہ میں کچھ خبطی سا آدمی ہوں۔ اپنے ہی خبط میں مست نہ سوال کرنے کا سلیقہ۔ نہ جواب حاصل کرنے کا۔

(۱۲۴۶) ہمارے کمال سخن کو دیکھکر لوگ حسد کرتے ہیں۔ تو گویا یہ اپنی شعر گوئی کی ہمیں سزا ملی ہے۔ (آہ) ایسے حاسد لوگ کیا کیجے۔

(افسوس) کسی ہنر یا کمال کے مال و متاع کی قیمت و دستم ہے۔ جو حاسد ہم پہ بپا کیا کرتے ہیں۔ اس کے متعلق اور زیادہ ہم کیا شکوہ گلہ کریں۔

(۱۲۴۷) کسی نے میری نسبت یہ کہا ہے۔ کہ غالب بُرا نہیں ہے یعنی آدمی تو اچھا ہے۔ مگر ذرا سڑی ہے۔ لہذا سوا اس کے اور کیا کہا جائے کہ وہ آشفتہ سر ہے یعنی ضرور سڑی یا دیوانہ ہے)

غزل

دیکھکر در پردہ گرم دامن افشانی مجھے (۱۲۴۸)
کر گئی وابستۂ تن میری عریانی مجھے

(۱۲۴۹) بن گیا تیغ نگاہ یار کا سنگ فسان
مرحبا میں کیا مبارک ہے گرانجانی مجھے

کیوں نہ ہو بے التفاتی اُس کی خاطر جمع ہے (۱۲۵۰)
جانتا ہے محو پرسشہائے پنہانی مجھے

(۱۲۵۰) میرے غم خانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی
لکھدیا منجملہ اسباب ویرانی مجھے

بدگماں ہوتا ہے وہ کافر نہ ہوتا کاشکے (۱۲۵۲)
اس قدر ذوق نوائے مرغ بستانی مجھے

(۱۲۵۳) وائے واں بھی شور محشر نے نہ دم لینے دیا
لے گیا تھا گور میں ذوق تن آسانی مجھے

وعدہ آنے کا وفا کیجے یہ کیا انداز ہے (۱۲۵۴)
تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے

(۱۲۵۵) ہاں نشاط آمد فصل بہاری واہ واہ
پھر ہوا ہے تازہ سودائے غزل خوانی مجھے

دی مرے بھائی کو حق نے از سر نو زندگی (۱۲۵۶)
میرزا یوسف ہے غالب یوسف ثانی مجھے

(۱۲۴۸) عریانی سے مراد برہنگی۔ میری عریانی نے جب یہ دیکھا۔ کہ در پردہ میں دامن افشانی یعنی سب سے دور رہنے اور تجرد میں گرم ہوں۔ تو وہ عریانی بھی مجھ سے رخصت ہوگئی۔ اور مجھ کو صرف میرے تن یعنی جسم ہی کے ساتھ وابستہ یا متعلق چھوڑ گئی۔ مراد یہ کہ اوروں سے بے تعلق ہوتے ہوتے یہ حالت ہوئی۔ کہ اپنے تن کے کپڑوں تک سے بھی معرا ہوگئے فقط ایک ننگا بدن ہمارے ساتھ باقی رہ گیا۔

(۱۲۴۹) میری گرانجانی (سخت جانی یا تکلیف اُٹھا اُٹھا کے زندہ رہنا) مجھے کس درجہ مبارک ہے۔ کہ جب دوست نے پے در پے مجھ پر اپنی تیغ نگاہ کے وار کئے۔ اور میں نہ مرا تو گویا اس کا سنگ فسان بن گیا۔ کہ جس پر تلوار کو صدہا مرتبہ رگڑا جائے۔ تو وہ پتھر ضائع نہیں ہوتا (ایسے ہی میں بھی تیغ نگاہ سے نہیں مرتا ہوں)

(۱۲۵۰) پرسش پنہاں سے۔ مراد خواب میں یا خیال میں آکر حال پوچھنا۔ مطلب یہ کہ دوست کو میرے حال سے بے توجہی کیوں نہو۔ جبکہ اُس کا دل مطمئن ہے۔ یعنی وہ سمجھتا ہے کہ وہ خواب میں یا خیال میں آکر میرے حال کی پرسش کر جایا کرتا ہے۔ اور میں گویا اسی میں محو ہوں۔

(۱۲۵۱) میرے غمخانۂ بربادگھر کی قسمت جب لکھی جا رہی تھی۔ تو بربادی کے تمام ساز و سامان میں ازل سے مجھے بھی شامل کر لیا تھا۔ یعنی اپنے گھر کی تباہی کا میں خود بھی ایک باعث ہوں۔

(۱۲۵۲) مرغ بستانی سے یہاں مراد بلبل ہے۔ جو گل پر عاشق اور اُس کے ترانے گایا کرتی ہے۔

حل شعر۔ وہ کافر بت مجھ سے بدگمان ہوتا ہے۔ کاش مجھ کو بلبل کے ترانے سننے کا اسقدر شوق نہ ہوتا۔ (کہ جس سے وہ شک کرتا ہے کہ میں بھی اسیر مثل بلبل زار فدا ہوں)

(۱۲۵۳) مجھ کو میرا آرام طلبی کا شوق قبر میں لے گیا تھا۔ مگر افسوس ہے کہ وہاں بھی شور قیامت نے دم لینے یعنی آرام نہ کرنے دیا۔

(۱۲۵۴) آپ نے جو میرے ہاں آنے کا وعدہ کیا تھا۔ اُسے پورا کیجئے۔ بھلا یہ کیا انداز ہے کہ مجھے اتنا انتظار دلا رہے ہیں۔ کہ میں گھر سے باہر ہی نہیں جاتا۔ گویا میرے گھر کی تم نے مجھے دربانی سونپ رکھی ہے۔

(۱۲۵۵) ہاں اے موسم بہار کے آنے کی خوشی میں تجھ سے خوش ہوں۔ کیونکہ تجھ سے پھر میرا وہ شعر گوئی کا جنون تازہ ہو گیا ہے۔

(۱۲۵۶) مرزا غالب کا بھائی یوسف نامی تھا۔ جو اکثر مبتلائے دیوانگی رہا کرتا تھا۔

حل شعر۔ میرے بھائی کو خدا نے اچھا کر دیا۔ گویا دوبارہ زندگی بخشی۔ اے غالب یہ میرزا یوسف میرے لئے اسقدر واجب التعظیم

ہے۔ جیساکہ حضرت یوسف۔ بوجہ حسن زیبا جسطرح یوسف کی سب قدر کرتے تھے ایسا ہی یہ بھی مجھے عزیز ہے۔

غزل

(۱۲۵۷) یاد ہے شادی میں بھی ہنگامۂ یارب مجھے
سبحۂ زاہد ہوا ہے خندہ زیر لب مجھے

(۱۲۵۸) ہے کشاد خاطر وابستہ در رہن سخن
تھا طلسم قفل ابجد خانۂ مکتب مجھے

(۱۲۵۹) یارب اس آشفتگی کی داد کس سے چاہئے
رشک آسایش پہ ہے زندانیوں کے اب مجھے

(۱۲۶۰) طبع ہے مشتاق لذتہائے حسرت کیا کروں
آرزو سے ہے شکست آرزو مطلب مجھے

(۱۲۶۱) دل لگا کر آپ بھی غالب مجھی سے ہو گئے
عشق سے آتے تھے مانع میرزا صاحب مجھے

(۱۲۵۷) ہنگامۂ یارب۔ غم کے سبب یارب۔ یارب کا شور مچانا۔ سبحۂ زاہد۔ تسبیح پھیرتے ہوئے یارب۔ یارب کہنا۔ خندہ زیر لب۔ ہونٹوں میں مسکرانا۔ اچھی طرح کھلکر نہ ہنسنا۔

مطلب شعر۔ مجھے یاد ہے کہ خوشی میں بھی میں یارب کا شور مچاتا تھا۔ گویا میرا ہونٹوں میں مسکرانا زاہد کے تسبیح پھیرتے وقت ذکر نفی

(۱۲۵۱) میرے محاسنے یا برباد گھر کی قسمت جب لکھی جا رہی تھی۔ تو بربادی کے تمام ساز و سامان میں ازل سے مجھے بھی شامل کر لیا تھا۔ یعنی اپنے گھر کی تباہی کا میں خود بھی ایک باعث ہوں۔

(۱۲۵۲) مرغِ بستانی سے یہاں مراد بلبل ہے۔ جو گل پر عاشق اور اُس کے ترانے گایا کرتی ہے۔

حلِ شعر۔ وہ کافر بت مجھ سے بدگمان ہوتا ہے۔ کاش مجھ کو بلبل کے ترانے سننے کا اسقدر شوق نہ ہوتا۔ (کہ جس سے وہ شک کرتا ہے کہ میں بھی اسیرِ مثلِ بلبلِ زار فدا ہوں)

(۱۲۵۳) مجھ کو میرا آرام طلبی کا شوق قبر میں لے گیا تھا۔ مگر افسوس ہے کہ وہاں بھی شورِ قیامت نے دم لینے یعنی آرام نہ کرنے دیا۔

(۱۲۵۴) آپ نے جو میرے ہاں آنے کا وعدہ کیا تھا۔ اُسے پورا کیجئے۔ بھلا یہ کیا انداز ہے کہ مجھے اتنا انتظار دلا رہے ہیں۔ کہ میں گھر سے باہر ہی نہیں جاتا۔ گویا میرے گھر کی تم نے مجھے دربانی سونپ رکھی ہے۔

(۱۲۵۵) ہاں اے موسمِ بہار کے آنے کی خوشی میں تجھ سے خوش ہوں۔ کیونکہ تجھ سے پھر میرا وہ شعر گوئی کا جنون تازہ ہو گیا ہے۔

(۱۲۵۶) مرزا غالب کا بھائی یوسف نامی تھا۔ جو اکثر مبتلائے دیوانگی رہا کرتا تھا۔

حلِ شعر۔ میرے بھائی کو خدا نے اچھا کر دیا۔ گویا دوبارہ زندگی بخشی۔ اے غالب یہ میرزا یوسف میرے لئے اسقدر واجب التعظیم

ہے۔ جیساکہ حضرت یوسف۔ یا بوجہ حسن زیبا جسطرح یوسف کی سب قدر کرتے تھے ایساہی یہ بھی مجھے عزیز ہے۔

غزل

(۱۲۵۷) یاد ہے شادی میں بھی ہنگامۂ یارب مجھے
سبحۂ زاہد ہوا ہے خندہ زیرِ لب مجھے

(۱۲۵۸) ہے کشادِ خاطرِ وابستہ دررہنِ سخن
تھا طلسمِ قفلِ ابجد خانۂ مکتب مجھے

(۱۲۵۹) یارب اس آشفتگی کی داد کس سے چاہیئے
رشک آسایش پہ ہے زندانیوں کے اب مجھے

(۱۲۶۰) طبع ہے مشتاقِ لذتہائے حسرت کیاکروں
آرزو سے ہے شکستِ آرزو مطلب مجھے

(۱۲۶۱) دل لگا کر آپ بھی غالب مجھی سے ہو گئے
عشق سے آتے تھے مانع میرزا صاحب مجھے

(۱۲۵۷) ہنگامۂ یارب۔ غم کے سبب یارب۔ یارب کا شور مچانا۔ سبحۂ زاہد۔ تسبیح پھیرتے ہوئے یارب۔ یارب کہنا۔ خندہ زیرِ لب۔ ہونٹوں میں مسکرانا۔ اچھی طرح کھلکر نہ ہنسنا۔

مطلب شعر۔ مجھے یاد ہے کہ خوشی میں بھی میں یارب کا شور مچاتا تھا۔ گویا میرا ہونٹوں میں مسکرانا زاہد کے تسبیح پھیرتے وقت ذکر خفی

کرنے یا منہ ہی میں یا رب یا رب کہنے کی مانند تھا۔ مراد یہ کہ مجھکو خوشی کے ساتھ کچھ نہ کچھ رنج بھی نصیب ہوتا ہے۔

(۱۲۵۸) کشادہ خاطر وابستہ۔ غمگین دل کی کشایش یعنی اُس کی خوشی۔ در۔ بہ معنی درمیان۔ رہن سخن۔ شعر گوئی کے ہاتھ گروے یعنی شعر کہوں تو خوشی حاصل ہوتی ہے۔ طلسم قفل ابجد۔ ایک ایسا جادو کا تالا۔ جس میں پھرکیاں لگی ہوتی ہیں۔ اور ان پھرکیوں سے حروف ملکر جب کوئی لفظ بنتا ہے۔ تو وہ کھل جاتا ہے۔ خانہ مکتب۔ پڑھنے کا گھر۔ یہاں وہ جگہ جہاں شعر لکھتا ہوں۔

حل شعر۔ میری دل کی خوشی شعر گوئی پر منحصر ہے۔ لہذا جہاں میں شعر کہا کرتا تھا۔ وہ گھر میرا قفل ابجد کا طلسم خانہ تھا۔ کہ جس میں حروف سے حروف ملا کر میں لفظ اور لفظوں سے شعر بنا لیا کرتا تھا۔

(۱۲۵۹) اے خدا اس حیرانی و پریشانی کی داد اب کون دے گا۔ کہ مجھ کو قیدیوں کی آسایش پر بھی رشک آتا ہے۔ کیونکہ اس قدر دل کی پریشانی نے مجھے اب تنگ کر رکھا ہے۔ کہ مجھ سے قیدی اچھے ہیں۔

(۱۲۶۰) میری طبیعت حسرت و یاس کے مزوں کی (جو مجھے محسوس ہوتے ہیں۔) اب فدائی ہے۔ لہذا میں ایسا ناچار ہوں کیا کروں۔ گویا آرزو یا امید سے۔ میری (عام لوگوں کی طرح) مراد آرزو نہیں ہوتی۔ بلکہ شکست آرزو۔ یعنی امید کا نہ بر آنا۔ حاصل شعر یہ کہ میں بہت ایذا دوست ہوں۔

(۱۲۶۱) اے حضرت غالب اب تو آپ بھی کبھی ایسے عاشق ہوگئے۔

یعنی کسی سے دل لگا لیا۔ حالانکہ جناب میرزا صاحب (مراد غالب) اس سے قبل تم مجھے منع کیا کرتے تھے۔ کہ عشق و محبت سے کچھ سروکار نہ رکھنا۔ خلاصہ مطلب یہ کہ ؎

ہر کسے ناصح برائے دیگران
ناصح خود یافتم کم در جہان

غزل

حضور شاہ میں اہل سخن کی آزمایش ہے (۱۲۶۲)
چمن میں خوش نوایانِ چمن کی آزمایش ہے

(۱۲۶۳) قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمایش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمایش ہے

کریں گے کوہکن کے حوصلے کا امتحان آخر (۱۲۶۴)
ہنوز اُس خستہ کے نیروے تن کی آزمایش ہے

(۱۲۶۵) نسیم مصر کو کیا پیر کنعاں کی ہوا خواہی
اُسے یوسف کی بوئے پیرہن کی آزمایش ہے

وہ آیا بزم میں دیکھو نہ کہیو پھر کہ غافل تھے (۱۲۶۶)
شکیب و صبر اہل انجمن کی آزمایش ہے

(۱۲۶۷) رہے گر دل میں (چھپا) جگر کے پار ہو بہتر
غرض شست بت ناوک فگن کی آزمایش ہے

نہیں کچھ سبحہ و زنار کے پھندے میں گیرائی (۱۲۶۸)
وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمایش ہے

(۱۲۶۹) پڑا رہ اے دل وابستہ بیتابی سے کیا حاصل
مگر پھر تاب زلف پرشکن کی آزمایش ہے

(۱۲۷۰) رگ و پے میں جب اترے زہر غم تب دیکھئے کیا ہو
ابھی تو تلخی کام و دہن کی آزمایش ہے

(۱۲۷۱) وہ آویں گے مرے گھر وعدہ کیسا دیکھنا غالبؔ
نئے فتنوں میں اب چرخ کہن کی آزمایش ہے

(۱۲۷۲) بادشاہ دہلی (بہادر شاہ ظفر) کے دربار میں یا اُس کے سامنے شعراء کے کمال کا امتحان ہو رہا ہے۔ گویا باغ میں باغ کے اچھے گانیوالوں کی آزمایش ہو رہی ہے۔

(۱۲۷۳) مجنوں اور فرہاد کی آزمایش یہ ہے کہ اُن کے دلوں میں اپنی اپنی معشوقوں کی زلف و قد کی درازی کا خیال جما ہوا ہے۔ حالانکہ ہم جہاں جائیں وہاں دار و رسن کا امتحان ہوتا ہے۔ کہ یہ کس قدر لمبے ہوں۔ تاکہ ہمیں ان سے پھانسی پر چڑھایا جائے۔

(۱۲۷۴) ابھی تو فرہاد خستہ حال کے بدن کی طاقت کا امتحان ہو رہا ہے۔ یعنی وہ دودھ کی نہر بہانے کو ایک پہاڑ کاٹ رہا ہے۔ وہ اس کام میں جب پورا اترے گا تو پھر اُس کے حوصلے کا امتحان ہوگا۔ یعنی اُس کو بتایا جائیگا۔ کہ اُس کی معشوقہ شیریں مرگئی ہے۔ تو وہ بے حوصلہ ہو کر اپنا سر تیشے سے پھوڑ کر مر جائیگا۔ مراد یہ کہ کوہکن بہت کم حوصلہ ثابت ہوگا۔

(۱۲۷۵) حضرت یوسفؑ مصر میں قید ہوگئے تھے۔ اور یعقوب

ان کے باپ ان کی جدائی میں سخت پریشان رہتے تھے۔ دوسرا واقعہ یہ ہے کہ جب یوسفؑ کو ان کے بھائیوں نے بطور غلام بیچ دیا تھا۔ تو باپ کی تسلی کیلئے ایک کرتے کو پھاڑ کر اُس پر خون کے چھینٹے دیدئے تھے۔ اور یہ بہانہ کیا تھا۔ کہ یوسفؑ کو بھیڑیا اُٹھا کر لے گیا ہے۔ انہی ہر دو واقعات کی جزیات پر اس شعر کی بنا ہے۔

حل شعر۔ دیکھو نسیم مصر کو پیر کنعان یعنی حضرت یوسف سے کتنی کچھ ہمدردی ہوگئی ہے۔ کہ وہ اس بات کی آزمایش کر رہی ہے۔ کہ یوسف کے کرتے کی خوشبو آیا مصر سے کنعان تک پہنچتی ہے یا نہیں۔ مراد یہ کہ مصر میں جب حضرت یوسف بادشاہ ہوگئے تھے۔ تو زلیخا کی بدولت وہ اسقدر خوشبوؤں سے تر کرتا پہننے لگے تھے۔ کہ اس کی خبر نسیم مصر کو یعقوب تک پہنچانا منظور ہوئی۔ جو تا ہنوز مذکورہ بالا خونیں پیراہن ہی کو دیکھ دیکھ کر گڑ گڑھا کرتے تھے۔ اب اس خوشبو سے وہ کسقدر مسرور ہو سکتے اس کا اندازہ بیان سے باہر ہے۔

دوسرے عام معنی۔ نسیم مصر کو یعقوب سے کیا ہمدردی ہو سکتی ہے۔ وہ تو اس بات کا امتحان کر رہی ہے۔ کہ یوسف کے پیراہن کی بو (بوجہ اپنی تیزی خوشبو کے) کتنی دور تک پھیل سکتی ہے۔ یہ مفہوم عموماً سب شارحین غالب نے رقم کیا ہے۔

(۱۲۷۶) دیکھو وہ (صبر آزما) دوست محفل میں آگیا۔ خوب ہوشیار ہو جاؤ۔ پھر نہ کہنا کہ ہمیں خبر نہ ہوئی۔ یعنی ہم غافل تھے۔ اب اس اہل محفل کے صبر و تحمل کا امتحان ہوگا۔ یعنی وہ دوست جب آئیگا۔ تو دیکھیں گے۔ کون کون اُس کے حسن کی تاب لا سکتا ہے۔ یا اُس پر

عاشق ہونے سے بچا رہتا ہے۔

(۱۲۶۷) دوست (تیر نظر) چلا رہا ہے۔ یہ تیر ہمارے دل ہی میں رہے تو اچھا اور اس سے اچھا یہ کہ وہ تیر جگر کے پار ہو جائے مختصر کہ ہم اس تیر پھینکنے والے معشوق کے نشانہ کرنے کی خوبی کا امتحان کیا چاہتے ہیں۔

(۱۲۶۸) گیرائی۔ پکڑ۔ مصدر گرفتن سے ہے۔ سبحہ وزنار سے مراد مذہب کفار و اسلام۔ کہتا ہے کفر و اسلام کا مذہب عوام کو اپنے پھندے میں پھنسا کر اُن کے دلوں پر کچھ زیادہ پکڑ یا قبضہ نہیں کر سکتا۔ لہذا اس بارے میں شیخ و برہمن کی وفاداری یا ان کے نباہ کا امتحان کیا جا رہا ہے۔ (ظاہر ہے۔ کہ برہمن بڑھ جائیگا۔ کیونکہ اس کو زنار پوش رہنا کچھ مشکل نہیں ہے۔ حالانکہ سبحہ گردانی ایک مشکل امر ہے)

(۱۲۶۹) دل وابستہ۔ بندھا ہوا دل۔ یہاں مراد زلفوں کے پیچ میں کسا ہوا دل۔ مگر۔ بہ معنی شاید۔ تاب زلف۔ زلف کو مروڑا دینا یا اُس کا پیچ کس دینا۔

مطلب۔ اے زلفوں کے پیچ میں پھنسے ہوئے دل۔ اب اسی طرح پڑا رہ۔ یوں پیچ و تاب کھانے سے کیا حاصل۔ دیکھ شاید پھر وہ معشوق اپنی زلفوں کے مروڑنے یا اُن کے پیچ کسنے کا امتحان کر رہا ہے۔ تو اس سے تیری مصیبت اور بھی بڑھ جائیگی۔ یہی بہتر ہے کہ صبر کا خوگر بنجا۔ مراد یہ کہ وہ محبوب جس قدر زلفیں سنوار کے تیرے دل کو اذیت پہنچائے تو صبر کر۔

(۱۲۷۰) ابھی تو زہر غم منہ اور حلق سے اترا ہے۔ اور اس کی

چکڑواہٹ محسوس ہوئی ہے۔ اُس کی آزمائش ہو رہی ہے۔ پھر یہ غم جب ہر رگ بدن میں سرایت کر جائیگا۔ تو کیا جانئے اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ (یعنی کہ موت واقع ہو جائیگی۔) یعنی ابتدائے عشق ہی تلخ ہے۔ تو انتہا معلوم۔

(۱۲۷۱) غالب اب دوست نے میرے گھر آنے کا وعدہ کیا ہے مگر دیکھنا یہ وعدہ کیونکر پورا ہو۔ آسمان نے گویا یہ ایک نیا فتنہ (وعدۂ یار کا) اُٹھایا ہے۔ ہمارے امتحان کی ٹھانی ہے۔ یعنی روز وعدے ہونگے۔ اور ہم اُن کے انتظار کی مصیبت سہا کریں گے۔

دوسرے معنی۔ یہ کہ آسمان نے یہ نیا فتنہ وعدۂ یار کا اُٹھایا ہے اب کیا جانیں وہ کیا کیا فتنے بپا کرے۔

غزل

(۱۲۷۲) کبھی نیکی بھی اُس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے
جفائیں کرکے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے

(۱۲۷۳) خدایا جذبۂ دل کی مگر تاثیر اُلٹی ہے
کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے

(۱۲۷۴) وہ بدخو اور میری داستان عشق طولانی
عبارت مختصر قاصد بھی گھبرا جائے ہے مجھ سے

(۱۲۷۵) اُدھر یہ بدگمانی ہے ادھر یہ ناتوانی ہے
نہ پوچھا جائے ہے اُس سے نہ بولا جائے ہے مجھ سے

(۱۲۷۶) سنبھلنے دے مجھے اے نا اُمیدی کیا قیامت ہے
کہ دامان خیال یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

(۱۲،۰) تکلف برطرف نظارگی میں بھی سہی لیکن
وہ دیکھا جائے کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے

ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبردِ عشق میں زخمی (۱۲،۸)
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھیرا جائے ہے مجھ سے

(۱۲،۹) قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہمسفر غالب
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

(۱۲،۲) اگر اُس کے دل میں میرے ساتھ کچھ نیک سلوک کرنے یعنی وفا کا خیال آ بھی جاتا ہے۔ تو پھر اپنی وہ اگلی جفائیں جو اس کے ہاتھوں سے مجھ پر ہو چکی ہیں۔ اُن کو یاد کر کے مجھ سے شرما جاتا ہے یعنی میرے پاس نہیں آتا۔ اور نیک سلوک کرنے سے باز رہتا ہے (گویا یہ بھی ایک باعث حرماں ہوا۔) یہ وہی مضمون ہے جو اس شعر کا ہے ؎

جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا
کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا

(۱۲،۳) اے خدا کیا میرے اس دل کی کشش کی تاثیر اُلٹی ہے۔ کہ جتنا میں اُس کو اپنی طرف کھینچتا ہوں۔ یعنی اُس کی آرزو کرتا ہوں۔ اُتنا ہی وہ مجھ سے کھنچتا جاتا ہے۔ یعنی مجھ سے دُور بھاگنے لگتا ہے۔

(۱۲،۴) وہ دوست ایسا بدمزاج ہے۔ کہ ذرا سی بات پر رنجیدہ ہو جاتا ہے۔ اور میری یہ داستانِ عشق (جو دوست تک میں پہنچانا چاہتا ہوں۔) بہت طول طویل ہے۔ لہٰذا یہ کام کیونکر بنے۔

خود قاصد بھی میری اس لمبی کہانی سے اُکتا جاتا ہے۔ بہتر ہے کہ میں اس کو مختصر سی عبارت ہی میں لکھکر اُسکے پاس بھیجدوں۔

(۱۲،۵) اُدھر دوست کو یہ بدگمانی ہے۔ کہ اگر مجھ سے وہ کوئی بات کریگا۔ تو میں جو کچھ بھی کہوں گا۔ سب جھوٹ ہو گا۔ (خصوصًا اظہار محبت کے متعلق) لہٰذا وہ میرا استفسارِ حال کرنے سے مجبور ہیں۔ ادھر مجھ میں یہ ضعف و ناتوانی کہ میں اپنے منہ سے کچھ بول ہی نہیں سکتا۔ گویا عشق کے ہاتھوں عجب کشمکش میں مبتلا ہوں۔

(۱۲،۶) چونکہ حالتِ یاس میں انسان کا دماغ بہت پریشان ہو جایا کرتا ہے۔ اس لئے کہتا ہے۔ اے نا امیدی تو ذرا مجھے سنبھلنے دے یعنی اپنے ہوش و حواس قایم کر لینے دے۔ یہ کیا قیامت ہے۔ کہ بدحواسی میں دوست کے خیال کا دامن میرے ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے یعنی یادِ دوست تک کا بھی ہوش نہیں رہا۔

(۱۲،۷) تکلف برطرف کے یہاں لفظی معنی مراد ہیں۔ کہتا ہے۔ کہ یہ مانا کہ دوست نے اپنی نظارگی یعنی اپنا مشاہدہ جمال کرانے کی غرض سے ہر قسم کا تکلف کرنا (مثلاً منہ پر آنچل ڈالنا یا نقاب اوڑھنا وغیرہ) برطرف کر دیا ہے۔ اور میں خوب جی بھر کے اُسے دیکھ سکتا ہوں۔ مگر ایک ایسے محبوب کو میرے جیسا ناکارہ شخص دیکھے۔ یہ ظلم بھی مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا وہ کیونکر مجھ سے دیکھا جائے۔ (غالب نے آپ اپنے پر رشک کھانے کے متعلق ایسے کئی اشعار تصنیف کئے ہیں)

(۱۲،۸) نبردِ عشق یا عشق کی لڑائی میں سب سے پہلے پاؤں

ہی زخمی ہوگئے ہیں۔ تو ہم اس لڑائی کو جاری کیسے رکھ سکتے ہیں۔ یعنی نہ ہم سے پاؤں کے زخم کی وجہ سے بھاگا جاتا ہے۔ نہ بیقراری سے کہیں پھرا ہی جاتا ہے (مراد یہ کہ ابتدائے عشق ہی اسقدر مایوس کن ثابت ہوئی۔)

(۱۲۷۹) اگر کوئی عزیز رخصت ہوتا ہے۔ تو اس سے کہا کرتے ہیں کہ "اچھا تمھیں خدا کو سونپا وہی حافظ و ناصر ہو" لہذا کہتا ہے۔ کیا قیامت ہے کہ وہ عزیز دوست (بت کافر ا جس کو رخصتی کے وقت میں یہ بھی (بوجہ رشک کے) نہیں کہہ سکتا۔ کہ "اچھا تمہیں خدا کو سونپا" وہ اب میرے مدعی یا رقیب کے ساتھ ہم سفر ہوتا ہے۔ گویا رقیب کو سونپ دیا گیا

غزل

زبسکہ مشق تماشا جنون علامت ہے (۱۲۸۰)
کشاد و بست مژہ سیلیٔ ندامت ہے

(۱۲۸۱) نہ جانوں کیونکہ مٹے داغ طعن بدعہدی
تجھے کہ آئینہ بھی ورطۂ ملامت ہے

یہ پیچ و تاب ہوس سلک عافیت مت توڑ (۱۲۸۲)
نگاہ عجز سر رشتۂ سلامت ہے

(۱۲۸۳) وفا مقابل و دعوائے عشق بے بنیاد
جنونِ ساختہ و فصل گل قیامت ہے

(۱۲۸۰) مشق تماشہ سے مراد سیر و تماشہ اور حسینوں وغیرہ کا

دیکھنا۔ جو اس قدر مرغوب ہوا کرتا ہے۔ کہ بس انسان اس قسم کے شوق میں دیوانہ سا بن جاتا ہے۔

مطلب شعر۔ سیر و تماشا اور حسینوں وغیرہ کا دیکھنا ازبس دیوانہ پن کی علامت ہے۔ یا اس سے دیوانگی لاحق ہوتی ہے۔ لہذا ایسے دیکھنے والے کی آنکھیں ہی خود جبکہ کھلتی اور بند ہوتی ہیں۔ تو اس کی پلکیں اس پر سیلی ندامت یعنی شرم دلانے کو تھپیاں برساتی ہیں۔ مراد یہ کہ سیر و تماشہ سے خود انسان کا دل ہی مانع آتا ہے مگر وہ سمجھتا نہیں ہے۔

(۱۲۸۱) داغ طعن بدعہدی۔ یعنی دوست کا اپنے عاشق کے ساتھ کوئی وعدہ کرکے مکر جانا۔ جو ظاہر ہے کہ بدعہد کے ضمیر کو اکثر ملامت کیا کرتا ہے۔ اس لئے کہتا ہے کہ میں نہیں جانتا تیرا یہ اقرار کرکے مکر جانے کے طعن کا داغ کیونکر مٹے گا۔ اب تو تیرا آئینہ یعنی آئینۂ دل بھی (جو اس بدعہدی کو محسوس کرتا ہے۔) تجھے گویا ملامت کے بھنور میں ڈال چکا ہے۔ یعنی سخت ملامت کرکے نادم کر رہا ہے۔)

(۱۲۸۲) پیچ و تاب۔ مروڑے دینا۔ جیسے رسی کو مروڑے دیکر توڑ دیتے ہیں۔ عجز۔ کسی بات میں کمی کرنا۔

حل شعر۔ دل کی عافیت کی لڑی کو ہوس کے مروڑے دے دیکر مت توڑ۔ کیونکہ (ہوس میں) عجز یا کمی کرنا سلامت رہنے کا دھاگہ ہے۔ حاصل یہ کہ بہت ہوس نہ کر اور سلامت رہ۔

(۱۲۸۳) وفا مقابل۔ یعنی وفا کہیں گم نہیں ہوئی۔ معشوق اس کے کرنے پر آمادہ ہے۔ یعنی یہ اس کے گویا آگے ہی دھری ہے۔ مگر (رقیب کا) دعوائے عشق کسی بنیاد پر کھڑا نہیں ہے۔ یعنی ایک جھوٹا دعویٰ

ہے۔ یہ قیامت ہے۔ مراد یہ کہ عاشق کے لئے کیسی رشک دلانے والی بات ہے۔ کہ اس کے ساتھ دوست کا یہ سلوک دغابازانہ ہو۔ اس امر کی مثال تو گویا ایسی ہے۔ کہ موسم بہار آگیا۔ اور بلبل کا جنون مصنوعی ہے۔ تو موسم بہار ہی گویا ضائع گئی۔ یہ کیا قیامت ہے۔

غزل

(۱۲۸۴) لاغر اتنا ہوں کہ گر تو بزم میں جا دے مجھے
میرا ذمہ دیکھکر گر کوئی بتلا دے مجھے

(۱۲۸۵) کیا تعجب ہے کہ اس کو دیکھکر آجائے رحم
واں تلک کوئی کسی حیلہ سے پہنچا دے مجھے

(۱۲۸۶) منہ نہ دکھلائے نہ دکھلا پہ بہ اندازِ عتاب
کھول کر پردہ ذرا آنکھیں ہی دکھلا دے مجھے

(۱۲۸۷) یاں تلک میری گرفتاری سے وہ خوش ہے کہ میں
زلف گر بنجاؤں تو شانہ میں الجھا دے مجھے

(۱۲۸۴) میں اس قدر دبلا پتلا ہوں کہ اگر تو اپنی محفل میں جگہ دے۔ تو اس بات کا میرا ذمہ کہ کوئی میری صورت دیکھکر مجھے پہچان سکے کہ میں کون ہوں۔

(۱۲۸۵) اگر کوئی شخص کسی بہانے سے مجھے دوست تک پہنچا دے تو کچھ تعجب نہیں ہے۔ کہ میری حالت دیکھکر اس کو مجھ پر ترس آجائے

(۱۲۸۶) اگر تو پردہ اٹھا کے منہ نہیں دکھلاتا۔ تو نہ دکھلا۔ لیکن مجھ پر تیرا یہ غصہ مقتضی ہے۔ کہ تو پردہ اٹھا کر تھوڑی مدت مجھ پر خفا ہی ہوئے یعنی آنکھیں ہی دکھا دے۔ (آنکھیں دکھانا۔ معنی غصہ ہونا)

(۱۲۸۷) وہ میری گرفتاری پر اس قدر خوش ہے۔ کہ اگر میں "زلف" کی صورت اختیار کروں (کیونکہ اکثر پریشان رہتا ہوں۔) تو وہ اس پر بھی مجھ کو اپنی کنگھی میں الجھا دے۔ گویا کسی نہ کسی طرح ضرور مقید رکھیگا۔

غزل

(۱۲۸۸) بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

(۱۲۸۹) اک کھیل ہے اورنگ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے

(۱۲۹۰) جز نام نہیں صورت عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں ہستیٔ اشیا مرے آگے

(۱۲۹۱) ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے
گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے

(۱۲۹۲) مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے
تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

(۱۲۹۳) سچ کہتے ہو خود بین و خود آرا ہوں نہ کیوں ہوں
بیٹھا ہے بت آئینہ سیما مرے آگے

(۱۲۹۴) پھر دیکھئے انداز گل افشانی گفتار
رکھدے کوئی پیمانۂ و صہبا مرے آگے

(۱۲۹۵) نفرت کا گمان گذرے ہے میں رشک سے گذرا
کیونکر کہوں لو نام نہ اُن کا مرے آگے

(۱۲۹۶) ایمان مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

(۱۲۹۷) عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام
مجنوں کو بُرا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے

(۱۲۹۸) خوش ہوتے ہیں پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے
آئی شب ہجراں کی تمنا مرے آگے

(۱۲۹۹) ہو موج زن اک قلزم خوں کاش یہی ہو
آتا ہے ابھی دیکھئے کیا کیا مرے آگے

(۱۳۰۰) گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

(۱۳۰۱) ہم پیشہ و ہم مشرب و ہمراز ہے میرا
غالب کو بُرا کیوں کہو اچھا مرے آگے

(۱۲۸۸) دنیا مرے آگے ایک بچوں کا کھیل ہے۔ یعنی میں اس کی کچھ وقعت نہیں سمجھتا۔ اور یہ تماشا یعنی بچوں کا سا کھیل شب و روز میرے آگے ہوتا ہی رہتا ہے۔ (آئندہ اشعار میں اسی مضمون کی کچھ تمثیلیں پیش کی ہیں)۔

(۱۲۸۹) میرے نزدیک سلیمان کا تخت جو اس قدر قیمتی تھا۔ کہ اُس کو پریاں اٹھائے لئے پھرتی تھیں۔ وہ ایک کھیل ہے۔ اور مسیحا کا یہ معجزہ کہ وہ مُردوں کو زندہ کر دیتا تھا۔ ایک معمولی سی بات ہے۔ (یعنی میں اس کو ایک مضحکہ سا ہی سمجھتا ہوں۔ جیسا کہ سلیمان کا وہ تخت محض ایک فسانہ ہے)

(۱۲۹۰) یہ دنیا کی صورت یا اس کا ظاہری وجود ایسا بے بود ہے کہ میں اس کو برائے نام یا بے بنیاد خیال کرتا ہوں۔ اور ان اشیا کی (جو مجھے نظر آتی ہیں) حقیقت میرے آگے ایک وہم یا فرضی سی ہے۔

(۱۲۹۱) میرے آگے ایک صحرا (جو پہلے اس قدر وسیع اور شاندار معلوم ہوتا ہے۔ پھر) مٹی میں مل جاتا ہے۔ اور دریا تو میرے آگے گویا اپنے عجز کا اقرار ہی کر رہا ہے۔ کہ زمین پر اپنی پیشانی رگڑتا رہتا ہے (گویا یہ اس کے فنا ہو جانے کا ایک ذریعہ ہے۔ خلاصہ مطلب یہ کہ صحرا اور دریا بھی بتدریج ملیامیٹ ہو رہے ہیں۔ اور میں ان کو دیکھ رہا ہوں۔) اس شعر تک دنیا کی بے بود ہستی کا جو ذکر مطلع میں کیا گیا تھا۔ اسی کے ثبوت بہم پہنچائے گئے ہیں۔

(۱۲۹۲) یہ بات مجھ سے نہ پوچھ کہ تجھ سے الگ ہو کے میری کیا حالت ہوا کرتی ہے۔ (یعنی کس قدر گھبرایا سا رہتا ہوں) تو خود دیکھ کہ مجھے دیکھ کے تو کتنا گھبراتا۔ اور ایک رنگ آتا اور ایک رنگ جاتا ہے۔

(۱۲۹۳) یہ سچ ہے کہ میں خود بین یعنی مغرور ہوں۔ اور خود آرا (اپنے آپ ہی کو سجانے والا یا اپنی بات کی پیچ کرنے والا) ہوں۔ یہ کیوں نہ ہو۔ کہ آئینے کی سی پیشانی والا معشوق میرے سامنے بیٹھا ہے۔ (مراد یہ کہ وہ بت خود ایسا ہی ہے۔ اور میں اس کی تقلید کرتا ہوں) یا اس کی وجہ میں اسقدر مغرور ہوں

دوسرے معنی - یہ کہ میں فخر کرتا ہوں کہ میرا ایسا معشوق دوست ہے۔ تو کیوں نہ خود بیں و خود آرا ہوں۔

(۱۲۹۴) کوئی شخص میرے سامنے شراب کی صراحی اور ساغر رکھدے اور پھر دیکھے کہ میرے منہ سے شعر کے پھول کیسے جھڑتے ہیں۔ یعنی شراب پی کر میں خوب شعر گوئی کیا کرتا ہوں۔

(۱۲۹۵) اگر کوئی شخص میرے سامنے اُن کا نام لیتا ہے۔ تو بوجہ رشک کے (کہ نیا اس شخص کو بھی میرے دوست کے ساتھ کچھ تعلق ہے۔) میں اس کا بُرا مناتا ہوں۔ تو ہر کوئی یہ خیال کرتا ہے۔ کہ گویا مجھے دوست سے نفرت ہے لہذا اب میں اس رشک سے درگذر کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

(۱۲۹۶) یہاں "کلیسا میرے آگے" سے مراد۔ خانہ کعبہ جس میں پہلے بت رہا کرتے تھے۔ تو گویا یہ بھی ایک بت خانہ یا کلیسا تھی۔ پھر خانہ کعبہ بنا۔ تو اس کے بعد۔ لہذا کہتا ہے۔ کہ پہلے میں اُسی کلیسا کی طرف دوڑا۔ تو کعبہ جو میرے پیچھے تھا۔ اُس کی بدولت مجھے ایمان یا اعتقاد اسلام نے روکا۔ مگر کلیسا کو تاب کہاں۔ وہاں سے کفر نے بھی مجھے اپنی طرف کھینچا۔ تو گویا میرے مذہب کی ایک دو رنگی سی حالت ہو گئی ہے۔ کبھی کافر ہوں، کبھی مسلمان۔

(۱۲۹۷) میں عاشق ہوں۔ لیکن ایسا مشاق اور متفنی عاشق کہ معشوقوں کو مبتلائے فریب رکھتا ہوں۔ چنانچہ میرے سامنے لیلیٰ بھی اپنے مجنوں کو بُرا بھلا کہتی ہے۔

(۱۲۹۸) "خوش ہوتے ہیں + + + یوں مر نہیں جاتے" اس سے مراد دوست سے مل کے خوش ہوتے ہیں۔ مگر یوں خوش ہو کے یعنی شادی مرگ ہو کے ہم مرتے نہیں ہیں۔ شب ہجراں کی تمنا۔ یہ کہ شب فراق میں میں

چاہتا تھا۔ کہ آہ۔ ایک دفعہ دوست کی صورت دیکھ لوں۔ تو چاہے پھر مر ہی جاؤں۔ "میرے آگے آئی"۔ یعنی جو تمنا شب فراق میں میں نے کی تھی۔ وہ دراصل دل سے نہیں تھی۔ محض خدا کو دھوکا دینے کی نیت سے کہتا تھا۔ کہ آہ ایک بار دوست سے ملکر مر جاؤں۔ سو وہ نیت میرے آگے آئی۔ یعنی مرا نہیں۔

حل شعر - ہم جو دوست سے مل کے خوش ہو رہے ہیں۔ اور یوں خوش ہو کے یا شادی مرگ کی بدولت مر نہیں جاتے۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ شب فراق میں جو اوپرے دل سے مرنے کی ہم نے تمنا کی تھی۔ وہ بدنیتی آئی۔ اور ہم دوست سے مل کے مرے نہیں۔ لہذا ہماری نیت ہمارے آگے آئی۔

(۱۲۹۹) یہ جو ایک خون کا دریا ہمارے جسم سے بہہ رہا ہے۔ کاش اسی پر مصیبتوں کا خاتمہ ہو جائے۔ مگر نہیں۔ ابھی دیکھئے کیا کیا میرے آگے آتا ہے۔

(۱۳۰۰) اگرچہ میرے ہاتھوں کو جنبش نہیں ہے۔ (یعنی اسقدر ضعیف ہوں کہ ہاتھ پاؤں ہلا نہیں سکتا۔) مگر میری آنکھوں میں تو ابھی جان ہے۔ لہذا میرے جی خوش کرنے کو شیشہ و ساغر تو میرے آگے دھرے رہنے دو۔

(۱۳۰۱) غالب میرا ہم پیشہ ہے۔ ہم مذہب ہے۔ اور رازدار بھی ہے۔ اچھا میرے آگے تم اس کو کیوں بُرا کہتے ہو۔ (کیا اسلئے کہ اسکو گالیاں لگا کے بالواسطہ مجھے تم کوسنے دے رہے ہو)

غزل

کہوں جو حال تو کہتے ہو مدعا کہیے (۱۳۰۲)
تمہیں کہو کہ جو تم یوں کہو تو کیا کہیے

(۱۳۰۳) نہ کہیو طعن سے پھر تم کہ ہم ستمگر ہیں
مجھے تو خو ہے کہ جو کچھ کہو بجا کہیے

وہ نیشتر سہی پر دل میں جب اتر جائے (۱۳۰۴)
نگاہِ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہیے

(۱۳۰۵) نہیں ذریعۂ راحت جراحتِ پیکاں
وہ زخمِ تیغ ہے جس کو کہ دل کشا کہیے

جو مدعی بنے اُس کے نہ مدعی بنئے (۱۳۰۶)
جو ناسزا کہے اُس کو نہ ناسزا کہیے

(۱۳۰۷) کہیں حقیقتِ جاں کاہیٔ مرض لکھیے
کہیں مصیبتِ ناسازیٔ دوا کہیے

کبھی شکایتِ رنجِ گراں نشیں کیجے (۱۳۰۸)
کبھی حکایتِ صبرِ گریز پا کہیے

(۱۳۰۹) رہے نہ جان تو قاتل کو خوں بہا دیجے
کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہیے

نہیں نگار کو الفت نہ ہو نگار تو ہے (۱۳۱۰)
روانیٔ روش و مستیٔ ادا کہیے

(۱۳۱۱) نہیں بہار کو فرصت نہ ہو بہار تو ہے
طراوتِ چمن و خوبیٔ ہوا کہیے

سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا غالبؔ (۱۳۱۲)
خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے

(۱۳۰۲) میں تم سے اپنا حال کہتا ہوں۔ (اور ابھی نہیں کہہ چکتا) تو تم کہتے ہو کہ بس اپنا مدعا کہو۔ گویا میری بات نہیں سننا چاہتے۔ اگر اسی طرح تم مجھ سے اپنا حال کہو۔ اور میں بھی اُسے نہ سننا چاہوں تو کہو کہ تم مجھے کیا کیا کچھ نہ کہوگے۔

(۱۳۰۳) مجھے تو تمہارا دل رکھنا منظور ہے۔ اور تم جو کچھ بھی کہو اس پہ ہاں اور بجا کہہ دیا کرتا ہوں۔ گویا یہ میری عادت ہے۔ لہٰذا پھر تم طعن سے یہ نہ کہنا کہ ہم "ستمگر" ہیں۔ تو مجھے کہنا پڑیگا۔ کہ "ہاں" اور تم اس کا بُرا مناؤگے۔ کیونکہ میں حسبِ عادت ہاں کہہ دوں گا۔

(۱۳۰۴) تمہاری نگاہِ ناز نشتر سہی۔ مگر جب دل میں اتر جائے۔ یعنی دل نشین ہو جائے۔ تو پھر اس کو اپنا دوست کیوں نہ کہوں۔

(۱۳۰۵) جراحتِ پیکاں۔ یعنی تیر کی نوک کا گھاؤ۔ ہماری راحت کا باعث نہیں ہوا۔ کیونکہ وہ تیر کا نہیں بلکہ تلوار کا زخم ہوتا ہے۔ کہ جو دلکشا ہوا کرتا ہے۔ (یہاں دل کشا کے دو معنی ہیں۔ دل کو خوشی پہنچانے والا دوسرے دل کو پھوڑ کے کھلا کر دینے والا۔ جیسے تلوار کا زخم!)

(۱۳۰۶) جو شخص مدعی بنے۔ یہاں مراد رقیب ہے اُس کے حریف نہ بنئے۔ یعنی اُس کا مقابلہ نہ کیجئے۔

اور اگر وہ مدعی بن کے کچھ کہے۔ تو اس کے جواب میں اسیطرح برا نہ کہے۔ یعنی حسن اخلاق سے کام لینا چاہیئے۔

(۱۳۰۷ و ۱۳۰۸ و ۱۳۰۹) یہ تین اشعار قطعہ بند ہیں۔ کہتا ہے۔ کبھی تو محبوب کو (خط میں) مرض عشق کی جانگدازی کی حقیقت لکھ بھیجئے۔ اور کبھی دل میں سخت بیٹھ جانے والے غم کا گلہ شکوہ اُس سے زبانی کہئے۔ اور کبھی ایسا ہی شکوہ بہ تکرار کریں تو ساتھ ہی یہ بھی قصہ بیان کر دیجئے۔ کہ اب ہمارا صبر گریز پا ہے۔ یعنی زیادہ صبر نہیں ہو سکتا۔

لیکن اگر دوست مطلق نہ سنے اور عاشق کو قتل ہی کر دے۔ تو اسے چاہیئے کہ اپنی جان دیکر گویا (الٹا اس کو) خون بہا (یعنی اپنے قتل کا معاوضہ) دیکر اس دوست سے اس قدر درگذر کیجئے۔ کہ اگر اس کے خنجر سے اپنی زبان تک بھی کٹ جائے تو اس کو شاباش دیجئے۔

(۱۳۱۰) اُس بنے ٹھنے محبوب کو ہم سے محبت نہیں ہے۔ تو نہ سہی۔ وہ نگار یعنی ہمارا معشوق تو ہے۔ لہذا اس کی چال کی روانی (تیزی) اور ناز و انداز کی مستی یا متوالا پن بیان کیجئے۔ (ایسی باتوں میں بھی دل چسپی کا سامان موجود ہے۔)

(۱۳۱۱) موسم کو فرصت یعنی قیام نہیں یا ہم کو اس سے لطف اندوز ہونے کی فرصت نہیں۔ تو نہ سہی۔ آخر بہار کا موسم تو ہے۔ باغ کی تراوت یعنی شادابی اور ہوائے بہار کی خوبیاں بیان کیجئے۔ (گویا انہی باتوں سے دل بہل جائیگا)

(۱۳۱۲) سفینہ یا کشتی جب کنارے پر پہنچ جائے۔ تو پھر اسے غالب خدا سے ناخدا یعنی ملاح کے ظلم کی شکایت کیا کرنا۔ مراد یہ کہ ملاح نے کسی طرح کنارے تک پہنچا دیا (غرق نہیں کیا) یہی غنیمت جاننا چاہیئے۔

غزل

رونے سے اور عشق میں بیباک ہو گئے (۱۳۱۳)
دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہو گئے

(۱۳۱۴) صرف بہائے مے ہوئے آلاتِ میکشی
تھے یہ ہی دو حساب سو یوں پاک ہو گئے

رسوائے دہر گو ہوئے آوارگی سے ہم (۱۳۱۵)
بارے طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے

(۱۳۱۶) کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر
پردے میں گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے

پوچھے ہے کیا وجود و عدم اہل شوق کا (۱۳۱۷)
آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے

(۱۳۱۸) کرنے گئے تھے اُس سے تغافل کا ہم گلہ
کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

اس رنگ سے اُٹھائی کل اس نے اسد کی نعش (۱۳۱۹)
دشمن بھی جس کو دیکھ کے غمناک ہو گئے

(۱۳۱۳) دھوئے گئے۔ بے شرم اور بے حیا ہو گئے۔ پاک۔

شہدا - یا صد درجے کا غنڈا آدمی۔

حل شعر - آغاز عشق میں ہم روتے نہ تھے۔ کہ کہیں راز عشق ظاہر نہ ہو جائے - مگر صبر نہ ہو سکا۔ تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ اور بالکل بے باک یعنی بے شرم ہو کے روتے۔ اور اپنے عشق کا اظہار کرتے تھے۔ اسی عادت میں ہم پورے بے شرم ہو کے گویا پاک شہدے بن گئے۔

(۱۳۱۴) آلات میکشی - یعنی شراب پینے کا ساز و سامان۔ جو اگرچہ بہت کچھ ہوا کرتا ہے۔ مگر کم از کم شراب رکھنے کا کوئی برتن مثلاً صراحی یا شیشہ اور جام و ساغر یعنی پیالہ ضرور ہونے چاہئیں۔ پس یہی دو حساب ہیں۔ یعنی سامان میکشی محسوب ہو سکتے ہیں۔

مطلب شعر - ہم نے شیشہ و ساغر شراب کی قیمت میں دیکر شراب پی ڈالی - بس یہی دو چیزیں آلات میکشی محسوب ہوتے تھے۔ سو اسطرح اُن کا صفایا کر دیا۔

دوسرے معنی - شراب کی قیمت کا ادا کرنا - اور شراب کے برتنوں کا خریدنا۔ یہ دو حساب یا غلجان تھے۔ بس شراب کے برتن فروخت کرکے ایسے حساب پاک کئے اور خلاصی پائی۔

(۱۳۱۵) اگرچہ آوارہ گردی سے تم دنیا بھر میں بدنام ہو گئے۔ (مگر مطلب کے پورے ہو کر) آخر طبیعت تو چالاک اور بیباک ہو گئی۔ اب جس کو چاہو اپنے ہتھے چڑھا لو۔ کیونکہ چالاک آدمی ہر جگہ کامیاب ہوتا ہے۔

(۱۳۱۶) بلبل کے رونے دھونے کو کون بے اثر کہتا ہے۔ جبکہ پردۂ گل میں یعنی پتیاں وغیرہ جن سے پھول ڈھنکا ہوا تھا۔ وہ پھول

کے کھلنے سے ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئیں۔ یعنی پھول کا پردہ چاک ہو گیا (اور چاک ہونا جسم کے لباس کا اُسی وقت ہوا کرتا ہے۔ کہ انسان کسی غم سے متاثر ہوا ہو) تو پھول بھی بلبل کی فریاد سے متاثر ہوا۔ اور اس کے لاکھوں جگر چاک سے یہاں مراد اس کی بے شمار پتیاں ہیں۔

(۱۳۱۷) اہل شوق - عاشقان الٰہی - مطلب یہ کہ خدا کے عاشقوں کی زندگی اور موت کا حال کیا پوچھنا ہے - وہ تو اپنی آتش عشق ہی کی گھانس پھونس ہو گئے - یعنی اسی میں جلکر رہ گئے - (مراد یہ کہ وہ شوق عشق الٰہی میں خود کو فنا کرتے کرتے فنا فی اللہ ہو گئے)

(۱۳۱۸) ہم اس سے یہ شکایت کرنے گئے تھے۔ کہ تم ہماری طرف سے اتنی غفلت کیوں کرتے ہو - مگر اُس نے ہماری شکایت سننے کو ایک ایسی دل فریب نظر کی۔ کہ بس اسی نگاہ سے ہم خاک ہو گئے - یعنی زیادہ بولنے کا حوصلہ نہ رہا - مراد یہ کہ معشوق کے رعب میں آ گئے۔

(۱۳۱۹) اس نے گل اپنے عاشق اسد کی لاش کچھ ایسے رنگ ڈھنگ یعنی توقیر کے ساتھ اُٹھائی۔ کہ دشمن یار رقیب بھی بوجہ رشک کے غمناک ہو گئے۔

دوسرے معنی مرے پیچھے ایک مردے کی مٹی پلید ہوتی دیکھکر دوست تو دوست دشمن کو بھی رنج آتا تھا

نشہ ہا شاداب رنگ و سازہا مست طرب (۱۳۲۰)
شیشۂ مے سرو سبز جوئبار نغمہ ہے

(۱۳۲۱) ہمنشیں مت کہہ کہ برہم کر نہ بزم عیش دوست

ہے واں تو میرے نالہ کو بھی اعتبارِ نغمہ ہے

(۱۳۲۰) نشے راگ رنگ سے سرسبز و شاداب ہیں۔ یعنی گانے بجانے نے نشوں کو فروغ دے رکھا ہے۔ اور گانا بجانا کا سامان خوشی سے بدمست ہو رہا ہے۔ اور وہ شیشۂ شراب جو نشے کا موجب ہے اس نغمہ یا گانے بجانے کی ندی کا سرسبز سرو بن گیا ہے۔ مراد یہ کہ شراب اور اس کے ساتھ گانے سے خوب سرور حاصل ہو رہا ہے۔

(۱۳۲۱) میرے رفیق مجھے یہ نہ کہو کہ "دوست کی بزم عیش کو آہ و زاری کرکے منغص نہ کر"۔ بلکہ وہاں تو میرا نالہ بھی پہنچکر۔ ایک طرح کی حقارت آمیز ہنسی کا باعث بنتا ہے۔ اور کوئی ہنسی خوشی کسی نغمہ ہی کے اعتبار یا وجود سے ہوا کرتی ہے۔

عرضِ نازِ شوخیٔ دنداں برائے خندہ ہے (۱۳۲۲)
دعویٔ جمعیتِ احباب جائے خندہ ہے
(۱۳۲۳) ہے عدم میں غنچہ محوِ عبرتِ انجامِ گل
یک جہاں زانو تامل در قفائے خندہ ہے
کلفتِ افسردگی کو عیشِ بیتابی حرام (۱۳۲۴)
ورنہ دنداں در دل افشردن بنائے خندہ ہے
(۱۳۲۵) سوزشِ باطن کے ہیں احباب منکر ورنہ یاں
دل محیطِ گریہ و لب آشنائے خندہ ہے

(۱۳۲۲) دعویٔ جمعیتِ احباب۔ یعنی عشاق کا یہ دعویٰ کہ انکا دل جمع ہے یا مطمئن ہے۔ جائے خندہ ہے۔ یعنی اس پر حقارت آمیز ہنسی آتی ہے۔ کیونکہ جو بات محبوب کی اُن کے ساتھ جمعیتِ خاطر کا باعث بن سکتی ہے۔ اس کی تو حقیقت یہ ہے۔ کہ دوست جب اپنے دانتوں کی شوخی یا چمک اپنا مُنہ کھول کر دکھاتا ہے۔ تو اُس کی یہ ادا مسرت کے سبب نہیں ہوتی۔ بلکہ احباب پر ہنسنے کی نیت سے ہوا کرتی ہے۔ کیونکہ اس کے سامنے کسی کا دل جمع کیسے ہو سکتا ہے۔ دوسرے معنی۔ یہ کہ دوست نے اپنے منہ کو کھولکر جو عرضِ نازِ شوخیٔ دنداں کیا ہے۔ یعنی اپنے چمکیلے دانتوں کو دکھا کر ایک طرح کی ادا کی ہے۔ تو یہ اس کی ہنسی کا اظہار ہے۔ کہ جس کے سامنے۔ عشاق کا یہ دعویٰ کہ وہ دل جمع رہیں گے۔ یا اس ہنسی سے وہ بالکل متاثر نہ ہوں گے جائے خندہ ہے۔ یعنی باعثِ تضحیک ہے۔

(۱۳۲۳) ہے عدم میں غنچہ مراد جب تک غنچہ معدوم ہے۔ یا کھلا نہیں ہے۔ وہ پھول کے عبرتناک انجام کے خیال میں محو ہوتا ہے اور "در قفائے خندہ" یعنی جب وہ غنچہ کھل کر پھول بن جاتا ہے۔ تو اس کے بعد وہ یک جہاں زانو تامل ہوتا ہے۔ یعنی بکثرت اس فکر میں رہتا ہے کہ اس موسمِ بہار کے بعد جب خزاں آئیگی۔ تو اس کا حشر کیا ہوگا۔

(۱۳۲۴) دنداں بر دل افشردن۔ یا در جگر افشردن وغیرہ کے معنی زبان فارسی میں تابِ مکروہات آوردن ہے۔ یعنی جسقدر رنج ہو اسکے برداشت کرنے کی طاقت رکھنا۔

حلِ شعر۔ افسردہ دلی کی حالت میں بیقرار ہوکے اپنی بیتابی کو عیش تصور کرنا۔ گویا حرام ہے۔ یعنی ایک خلاف دستور خیال ہے ورنہ

مکروحات زمانہ کی تاب لانا تو حقیقی بنائے خندہ و مسرت ہے۔

(۱۳۲۵) دوست میرے ظاہر حال کو دیکھکر میرے دل کی جلن کے قائل نہیں ہیں۔ ورنہ اصلیت یہ ہے کہ میرے لب بظاہر ہنسی سے لبریز ہیں۔ اور میرا دل زار زار رونے سے سمندر بن گیا ہے۔ اور دوست ایسی خوشی اور غمی کی حالت ایک ہونے کے قائل نہیں۔

حسن بے پروا خریدار متاع جلوہ ہے (۱۳۲۶)
آئینہ زانوئے فکر اختراع جلوہ ہے

(۱۳۲۷) تاکجا اے آگہی رنگ تماشا باختن
چشم واگردیدہ آغوش وداع جلوہ ہے

(۱۳۲۶) حسن بے پرواہ یعنی باوجودیکہ حسن غفلت شعار ہوتا ہے مگر پھر بھی متاع جلوہ یعنی اپنی جلوہ گری کی دولت کا خریدار یا متمنی پایا جاتا ہے۔ لہٰذا وہ آئینہ کہ جس سے وہ حسن اپنی آرائش کیا کرتا ہے، وہ زانوئے فکر اختراع جلوہ ہوتا ہے۔ یعنی نئے نئے جلوے ایجاد کرنے کی فکر میں گویا سربہ زانو یا متفکر رہا کرتا ہے۔ مراد یہ کہ وہ لاپرواہ دوست بھی فکر سے خالی نہیں۔ اس کی فکر اپنی آرائش ہے۔

(۱۳۲۷) رنگ تماشا باختن۔ فارسی زبان میں رنگ کے ۳۵ معنی ہیں۔ منجملہ ان کے ایک قمار یعنی جوا کھیلنا بھی ہے۔ رنگ تماشہ باختن، مراد۔ تماشہ یا استعجاب کا جوا کھیلنا۔ گویا دنیا سے اس کے تبدل حالات کے سبب استعجاب حاصل کرنا۔

مطلب شعر۔ اے واقفیت تو کب تک اس دنیا کے تبدل حالات

کے سبب متعجب ہوا کریگی۔ تیری یہ چشم واگردیدہ یعنی عبرت خیز آنکھ آغوش وداع جلوہ ہے۔ یعنی جلوہ دنیا سے جدا ہونے کی وقت کی گویا بغل گیری ہے حاصل شعر یہ کہ اے واقف حالات تو کب تک یہاں نیرنگیٔ دنیا سے عبرت کا سبق لیا کریگا۔ تیرا تو قیام ہی خود یہاں عارضی ہے۔

غزل

جب تک دہان زخم نہ پیدا کرے کوئی (۱۳۲۸)
مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی

(۱۳۲۹) عالم غبارِ وحشت مجنوں ہے سربسر
کب تک خیال طرۂ لیلےٰ کرے کوئی

افسردگی نہیں طرب انشائے التفات (۱۳۳۰)
ہاں درد بن کے دل میں مگر جا کرے کوئی

(۱۳۳۱) رونے سے اے ندیم ملامت نہ کر مجھے
آخر کبھی تو عقدۂ دل وا کرے کوئی

چاک جگر سے جب رہ پرسش نہ وا ہوئی (۱۳۳۲)
کیا فائدہ کہ جیب کو رسوا کرے کوئی

(۱۳۳۳) لخت جگر سے ہے رگ ہر خار شاخ گل
تا چند باغبانیٔ صحرا کرے کوئی

ناکامیٔ نگاہ ہے برق نظارہ سوز (۱۳۳۴)
تو وہ نہیں کہ تجھکو تماشا کرے کوئی

(۱۳۳۵) ہر سنگ و خشت ہے صدفِ گوہرِ شکست
نقصاں نہیں جنوں سے جو سودا کرے کوئی

(۱۳۳۶) سر بر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے عمر
فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی

(۱۳۳۷) ہے وحشتِ طبیعتِ ایجاد یاس خیز
یہ درد وہ نہیں ہے کہ پیدا کرے کوئی

(۱۳۳۸) بیکاریٔ جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل
جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی

(۱۳۳۹) حسنِ فروغِ شمعِ سخن دور ہے اسدؔ
پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

(۱۳۲۸) دہانِ زخم۔ یعنی دہانِ زخمِ دل مراد کسی رنج کے سبب دکھیارا ہونا۔ راہِ سخن وا کرنا۔ بات چیت کرنے کا کوئی ذریعہ نکالنا۔
مطلب شعر۔ جب تک کوئی شخص تیرے عشق میں دکھیارا نہ ہو نا ممکن ہے کہ تجھ سے بات چیت کرنے کی کوئی سبیل نکال سکے۔ گویا عشق میں سخت مصائب برداشت کریں تو محبوب التفات کیا کرتا ہے۔
(۱۳۲۹) وحشت سے مراد گھبرا کر گھر سے نکل پڑنا۔ کہ کہیں تنہا رہ کے اطمینان قلب حاصل ہو۔ طرۂ لیلیٰ۔ لیلیٰ کی زلف۔
حل شعر۔ غریب مجنوں کب تک لیلیٰ کی یاد میں جان کھپایا کرے۔ دل کی وحشت کے سبب دنیا تو اُس کے لئے مجسم رنج بن گئی ہے مراد یہ کہ آخر عشق کی انتہا ہونی چاہئے۔ کب تک انسان انھیں کھلا کرے۔

(کوئی سے یہاں مراد مجنوں ہی ہے)
(۱۳۳۰) یہاں بھی "کوئی" کے معنی عاشق کے ہیں۔
مطلب شعر۔ عاشق کی افسردہ دلی التفاتِ معشوق کی خوشی پیدا کرنے کا ذریعہ نہیں ہو سکتی۔ مراد یہ کہ افسردہ دلی گویا اس حالت کا نام ہے۔ کہ عاشق معشوق کے وصال سے مطلقاً مایوس ہو چکا ہو۔ تو پھر معشوق کیا ملتفت ہوگا۔ ہاں اگر عاشق کے دل میں درد ہو۔ یعنی معشوق کے لئے تڑپ تو ضرور ہے کہ اس کی دلِ معشوق میں جا پیدا ہو جائے۔ کیونکہ انتہائے امید میں جو بیقراری ہوا کرتی ہے۔ اس سے کچھ ملا کرتا ہے۔ اور معشوق بھی اسی سے متاثر ہوا کرتا ہے۔
(۱۳۳۱) اے ندیم (ہم نشین) مجھے میرے رونے پر ملامت نہ کر۔ آخر کبھی تو اپنے غم کی گتھی کو کوئی سلجھائے۔ یعنی رو کر اپنے دل کا غبار نکالے۔

(۱۳۳۲) جب ہم نے اپنے جگر تک کو چاک کر لیا۔ اور اس سے رہِ پرسش وا نہ ہوئی۔ یعنی کوئی ایسی سبیل پیدا نہ ہوئی۔ کہ وہ دوست ہمارا حال پوچھے۔ تو اب جیب یعنی جیب گریبان پھاڑ کے اس کو رسوا کرنے سے کیا فائدہ۔ مراد یہ کہ اُس کے سامنے جگر تک شق کر دیا تو وہ ملتفت نہ ہوا۔ اب صرف کپڑے پھاڑنے سے بجز اس کے کہ عوام میں ہمارا رازِ عشق کھل جائے۔ اور ہم بدنام ہوں۔ اور کیا حاصل ہوگا۔

(۱۳۳۳) میرے جگر کے ٹکڑے صحرا میں ایک ایک کانٹے کی نوک سے چھدے پڑے ہیں۔ جس سے ہر کانٹا ایسا دکھائی دیتا ہے

کہ گویا شاخ گل (پھولدار ٹہنی) ہے۔ اب وہ جنگل ایسا باغ بن گیا ہے۔ تو میں کب تک اُس کی باغبانی کیا کروں۔ یعنی باغبان کا کام ہے نئے نئے پودے لگانا۔ تو ہر خار صحرا کو تو میں نے شاخ گل بنا دیا۔ اب اور کانٹے ہی میسر نہیں تو میں باغبانی کیا کروں۔

(۱۳۳۴) تو وہ شخص نہیں ہے کہ تجھ کو کوئی دیکھ سکے۔ کیونکہ تیری برق نظارہ سوز۔ یعنی تیرا چندھیا دینے والا جلوہ دیکھنے والے کی ناکامی کا باعث ہوتا ہے۔ مراد یہ کہ اے خدا تجھ کو نظر بھر کے کوئی دیکھ ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ تیری برق نظارہ سوز وجہ ناکامی نگاہ ہے۔ جیسے طور پر کلیم سے یہ واقعہ گذرا تھا۔ کہ حضرت موسیٰ خدا کا دیدار نہ کر سکے۔

(۱۳۳۵) "جنوں سے" کے معنی یہاں عشق کی وجہ سے۔ سودا کے۔ سودائی بنے یا دیوانہ ہو جائے۔

حل شعر۔ اگر کوئی شخص بوجہ عشق دیوانہ ہو جائے۔ تو اس میں کچھ نقصان نہیں ہے۔ کیونکہ اس دیوانہ کے سر پر لڑکے ضرور پتھر ماریں گے۔ اور چونکہ دیوانہ عشق ان پتھروں کو لعل کے برابر قیمتی خیال کیا کرتا ہے۔ تو گویا ایسا ہر پتھر (یا سنگ وحشت) صدف گوہر شکست ہے۔ یعنی صدف سے مراد یہاں سیپی یا ایک حقیر چیز ہے۔ اور گوہر بمعنی قیمتی چیز۔ شکست دراصل شکست قسمت

(۱۳۳۶) عمر سر بسر نہ ہوئی۔ مراد عمر بھر میں یہ کام پورا نہ ہو سکا۔ وعدۂ صبر آزما۔ یعنی معشوق کا اپنے عاشق کو وعدۂ وصال میں منتظر رکھنا۔

اور اس کا ایسا صبر لبریز ہو جانا۔ تیری تمنا۔ یعنی تیرے وصال کی آرزو۔

حل شعر۔ عاشق کی عمر تو معشوق کے صبر آزما وعدہ ہی میں پوری ہو گئی۔ لیکن اس نے وعدہ کبھی پورا نہ کیا۔ تو اب اس وعدۂ وصال کی آرزو کے درپے ہونے کے لئے فرصت یعنی اس کی عمر کے دن ہی کہاں باقی رہے ہیں۔ یعنی کسی کی عمر بس ہو گئی اور اس نے وعدہ پورا نہ کیا۔

(۱۳۳۷) وحشت سے یہاں مراد عام دستوروں سے الگ ہو کر اپنی دھن میں مبتلا ہو جانا۔ طبیعت بمعنی عادت۔ ایجاد۔ کوئی نئی بات نکالنا۔ جو پہلے رائج نہ ہو۔

حل۔ ایجاد کی عادت ایک خاص دُھن یا وحشت مایوسی خیز ہوا کرتی ہے۔ مگر یہ درد یعنی درد شوق ایسا نہیں ہے۔ کہ جسے کوئی پیدا نہ کرے۔ یعنی عوام میں سے کوئی نہ کوئی ایسا خاص شخص جس میں ایجاد کرنے کی عادت ہو۔ پیدا ہو ہی جایا کرتا ہے۔ لیکن پھر وہ اوروں سے وحشت رکھتا ہے۔

دوسرے معنی۔ اگر ایجاد سے مراد عالم ایجاد یعنی دنیا لی جائے تو اس شعر کا مفہوم یہ ہے۔ کہ دنیا یا دنیاداری کی عادت سے جو وحشت یا بیکسی جی رکھتا رہتا ہے۔ وہ یاس خیز ہے۔ مگر وہ کون شخص ہے۔ کہ جس دل میں یہ درد یاد دنیا کی محبت کا رنج نہ ہوگا۔ ؎

اگر دنیا نہ باشد دردمندیم
وگر باشد بمہرش پائے بندیم

(۱۳۳۸) انسان کسی غم سے جب مجنوں سا ہو جاتا ہے۔ تو وُہ دیوانوں کی طرح روتا چلاتا اور اپنا سر پیٹا کرتا ہے۔ اور یہ شغل اُس کی تسلی کا باعث ہوتا ہے۔ لہذا کہتا ہے۔ کہ جنون یعنی غم عشق کی دیوانگی

میں جب انسان بیکار سا ہو جایا کرتا ہے۔ تو اس بیکاری کا اچھا شغل سر کا پیٹنا ہے
کہ اس سے بظاہر اس کی تسلی ہو جاتی ہے۔ لیکن جب سر کو پیٹ پیٹ کے اس
کے ہاتھ رہ جائیں تو پھر وہ کیا کرے۔

(۱۳۳۹) اے اسد شمع سخن کا فروغ حسن یعنی شاعری کا حسن کمال
کبھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ انسان (عاشق ہو کے پہلے) ایک دل گداز
پیدا نہ کرتے۔ (گویا شاعری کوئی آسان کام نہیں ہے۔) اس کیلئے پہلے عاشق
ہونا۔ اور دل کو درد مند بنانا پڑتا ہے۔)

غزل

ابن مریم ہوا کرے کوئی (۱۳۴۰)
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

(۱۳۴۱) شرع و آئین پر مدار سہی
ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی

چال جیسے کڑی کمان کا تیر (۱۳۴۲)
دل میں ایسے کے جا کرے کوئی

(۱۳۴۳) بات پر واں زبان کٹتی ہے
وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ (۱۳۴۴)
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

(۱۳۴۵) نہ سنو گر برا کہے کوئی
نہ کہو گر برا کرے کوئی

روک لو گر غلط چلے کوئی (۱۳۴۶)
بخش دو گر خطا کرے کوئی

(۱۳۴۷) کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند
کس کی حاجت روا کرے کوئی

کیا کیا خضر نے سکندر سے (۱۳۴۸)
اب کسے رہنما کرے کوئی

(۱۳۴۹) جب توقع ہی اٹھ گئی غالب
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

(۱۳۴۰) کوئی ابن مریم یعنی مسیحا ہوا کرے۔ (میری بلا سے
میں تو جب جانوں کہ یہاں کوئی مسیحا بھی اگر میرے اس درد عشق کی
کوئی دوا کریگا۔

(۱۳۴۱) شرع یعنی دین دھرم۔ اور آئین یا قوانین سلطنت
پر (مقدمات کے فیصلے کا) مدار سہی۔ مگر ایسے قاتل معشوق کو جو اپنے
تیر نظر سے ہلاک کر دیا کرتا ہے۔ کوئی کس دین دھرم کے اصول یا قانون
سے پکڑ کے سزا دیگا۔ (مراد یہ عشق ہر روز قتل کرایا کرتا ہے۔ اور ایسے قاتل
معشوق کبھی پکڑے نہیں جاتے)

(۱۳۴۲) کڑی کمان کا تیر۔ جو کمان سخت ہو اور ڈھیلی ڈھالی
نہ ہو۔ اس کا چلا ہوا تیر بہت کارگر ہوا کرتا ہے۔
حل شعر۔ اس دوست کی چال کڑی کمان کا تیر ہے۔ وہ
بہت موثر ہے۔ چاہئے کہ ایسے (مغرور معشوق) کے دل میں کوئی جا کرے

یعنی گھر کرے۔ (اسی قبیل کا ایک شعر ذوق نے بھی لکھا ہے) ؎

انسان وہ کیا جو نہ دل دلبر میں گھر کرے
کیڑا ذرا سا اور وہ پتھر میں گھر کرے

(۱۳۴۳) بات پر زبان کٹنے سے یہ مراد ہے۔ کہ اگر کوئی بولے
تو اس کی زبان کاٹ دی جائیگی۔ گویا بولنے کی مطلقاً اجازت نہیں ہے
حل شعر۔ وہاں (دوست کی محفل میں) بات کرنے کی اجازت
ہی نہیں ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا۔ کہ بس وہ بولا کریں۔ اور اہل محفل
چپ سنا کریں۔

(۱۳۴۴) میں حالتِ جنون میں کیا کیا کچھ بک رہا ہوں۔ (یعنی اپنا
راز عشق۔ دوست کی بیوفائی کی شکایت اور غیروں کی رقابت وغیرہ
کا حال خود بخود کہہ رہا ہوں۔ کہ جس کو پوشیدہ رکھنا چاہیے تھا) خدا
کرے۔ کہ کوئی شخص میری بات ہی کچھ نہ سمجھے۔ یا دیوانہ جان کے ان
باتوں کو دیوانے کی بڑ ہی جانے۔ ورنہ اس سے تو وہ دوست مجھ
سے خفا ہو جائیگا۔

(۱۳۴۵) اگر کوئی شخص تم کو بُرا کہے مثلاً گالی دے تو اس پر اس
طرح مدعجبر کرو۔ کہ گویا سنا ہی نہیں ہے۔ اور اسی طرح اگر تمہارے
ساتھ کوئی بُرا سلوک کرے تو اس پر کچھ نہ کہو۔ یعنی اس شخص کی کچھ شکایت
نہ کرو۔

(۱۳۴۶) اگر کوئی شخص غلط رستہ پر چل رہا ہو۔ تو اس کو اپنی زندگی
اور درست راہ پر ڈال دو۔ اور اگر کوئی کچھ قصور کرے تو اس سے بدلہ نہ لو
بلکہ اس کو وہ قصور ہی معاف کر دو۔

(۱۳۴۷) یہاں کون شخص ہے جو خود ہی حاجتمند نہ ہو۔ تو پھر کو
دوسرے کسی کی حاجت کو کیا پورا کریگا۔ (مراد۔ یہاں کوئی کسی کا مدد
نہیں ہوسکتا

(۱۳۴۸) خضر اور سکندر کا قصہ مختصراً یہ ہے۔ کہ خواجہ خضر
بادشاہ سکندر کو آب حیات پلوانے کے لئے چشمہ آب حیات پر
لے گئے تھے۔ وہاں بُڈھے بُڈھے آدمیوں کو دیکھا کہ آب حیات پی کر
گو مرتے تو نہیں تھے۔ مگر ان کی حالت سخت خراب ہو رہی تھی۔ لہٰذا
سکندر نے آب حیات نہ پیا اور محروم چلا آیا۔

مطلب شعر۔ خواجہ خضر نے سکندر بادشاہ کے ساتھ جو سلوک کیا
تو وہ سکندر کو منفعت رساں ثابت نہ ہوا۔ لہٰذا اب کوئی کسی کو اپنا
رہنما کیا بنائے۔ (سب سے بڑا رہنما تو خضر ہے۔ اور اسی کی رہنمائی
کچھ کام نہ آئی)

(۱۳۴۹) اے غالب جب ہمارے دل میں کسی سے کوئی امید
ہی نہیں ہے۔ تو پھر ہم کسی کا گلہ شکوہ بھی کیوں کریں۔ مطلب یہ کہ کسی
سے شکوہ تو جب ہو۔ کہ حسب منشا کوئی کام پورا نہ ہوسکے۔ مگر جب کوئی
منشا یا توقع ہی (بوجہ صبر یا انتہائے یاس کے) نہ ہو تو شکوہ و شکایت
کی کوئی صورت ہی کس طرح پیدا ہو۔ حاصل شعر یہ کہ توقع ہی موقع شکایت
پیدا کیا کرتی ہے۔ یہ نہیں تو پھر شکایت کیا ہے؟

بست سہی غم گیتی شراب کم کیا ہے (۱۳۵۰)
غلام ساقی کوثر ہوں مجکو غم کیا ہے

(۱۳۵۱) تمھارے طرز روش جانتے ہیں ہم کیا ہے
رقیب پر ہے اگر لطف تو ستم کیا ہے

سخن میں خامۂ غالبؔ کی آتش افشانی (۱۳۵۲)
یقیں ہے ہم کو بھی لیکن اب اُس میں دم کیا ہے

(۱۳۵۰) دنیا کا غم بکثرت سہی۔ جب میں ساقیٔ حوض کوثر کا غلام ہوں پھر مجھ کو اس بات کی فکر کیا۔ یعنی دنیا میں رنج بہت ہے۔ تو وہ ساقی مئے شراب بھی تو بہت سی پلا دیتا۔ تاکہ یہ غم دنیا بہت کم محسوس ہو۔ یعنی اگلے جہان کی نعمتوں کی توقع میں اس دنیا کا غم مجھے بھول جائیگا۔

(۱۳۵۱) ہم تمھاری طرز روش یعنی خو بُو سے بخوبی واقف ہیں۔ یہ کس طرح کی ہے۔ لہذا اگر رقیب پر تمھارا لطف ہے۔ یا تم اس پر مہربان۔ تو اس میں ستم کی یعنی اچنبے کی کونسی بات ہے۔ دوست ہمیشہ عاشق پر رقیب کو ترجیح دیا ہی کرتا ہے۔

دوسرے معنی ہم تمھاری عادت سے بخوبی واقف ہیں۔ کہ یہ کس طرح کی ہے۔ یعنی اگر رقیب پر تم نظر لطف کرتے ہو۔ تو پھر ہم پہ تمھارا ستم پیشتر کیا ہوگا۔ یہی تو ہمارے حق میں ستم ہے۔ اور یہی تمھاری طرز روش ہے۔ کہ عشاق پر جور و ستم کرنا۔ اور اس سے ہم بخوبی واقف ہیں۔

(۱۳۵۲) شعر و سخن میں غالب کی جادو نگاری یا اس کے پرسوز طرز کلام سے ہم واقف ہیں۔ مگر اب اس میں وہ لطف ہی کہاں رہا ہے زمانے کے اثر سے اب وہ رنگ سخن پھیکا ہو گیا۔) یعنی اپنی زوال پذیر حالت کا بیان کیا ہے۔

غزل

باغ پاکر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے (۱۳۵۳)
سایۂ شاخ گل افعی نظر آتا ہے مجھے

(۱۳۵۴) جوہر تیغ بہ سر چشمۂ دیگر معلوم
ہوں میں وہ سبزہ کہ زہر آب اُگاتا ہے مجھے

مدعا محو تماشائے شکست دل ہے (۱۳۵۵)
آئینہ خانے میں کوئی لئے جاتا ہے مجھے

(۱۳۵۶) نالہ سرمایۂ یک عالم و عالم کف خاک
آسمان بیضۂ قمری نظر آتا ہے مجھے

زندگی میں تو وہ محفل سے اُٹھا دیتے تھے (۱۳۵۷)
دیکھوں اب مر گئے پر کون اُٹھاتا ہے

(۱۳۵۳) مجھ کو باغ بھی وہمی یا خفقانی سا دیکھکر اس قدر ڈراتا ہے۔ کہ ایک پھولدار ٹہنی کا سایہ بھی مجھے کالا رنگ دکھائی دیتا ہے۔ (گویا باغ سے راحت پانے کے بجائے مجھے بوجہ اپنی خفقانی ہونے کے الٹا عذاب پہنچتا ہے۔

(۱۳۵۴) جس طرح تلوار کا جوہر دوسرے کسی چشمہ آب سے آبداری نہیں حاصل کرتا۔ بلکہ تلوار ہی کی آب اس کو چمکاتی ہے۔ اسی طرح میں بھی وہ سبزہ ہوں۔ کہ مجھے زہر آب نشو و نما لاتا ہے۔ حاصل یہ کہ میری زندگی کی تلخی اس لئے ہے۔ کہ میں پیدا ہی ایسا کیا گیا ہوں۔

غزل

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے (۱۳۶۱)
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

(۱۳۶۲) ڈرے کیوں میرا قاتل کیا رہیگا اُس کی گردن پہ
وہ خوں جو چشم تر سے عمر بھر یوں دمبدم نکلے

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن (۱۳۶۳)
بہت بے آبرو ہوکر ترے کوچے سے ہم نکلے

(۱۳۶۴) بھرم کھلجائے ظالم تیری قامت کی درازی کا
اگر اس طرۂ پُر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

مگر لکھوائے کوئی اُس کو خط تو ہم سے لکھوائے (۱۳۶۵)
ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھکر قلم نکلے

(۱۳۶۶) ہوئی اس دور میں منسوب مجھ سے بادہ آشامی
پھر آیا وہ زمانہ جو جہاں میں جامِ جم نکلے

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی (۱۳۶۷)
وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے

(۱۳۶۸) محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا
اُسی کو دیکھکر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

(۱۳۶۹) کہاں میخانہ کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

(۱۳۶۱) ہماری ہزاروں ایسی خواہشیں ہیں کہ ہر خواہش پر جان نکلی جاتی ہے۔ گو وہ ہم کو ایسی ترسا رہی ہیں۔ اور اگرچہ ایسی اور بہت سی خواہشیں اور ارمان ہمارے پورے بھی ہو چکے ہیں۔ لیکن پھر بھی کچھ زیادہ خواہشات پوری نہیں ہوئیں۔ یعنی حسب منشا کامیابی کبھی حاصل نہیں ہوتی کوئی نہ کوئی آرزو باقی رہتی ہے۔

(۱۳۶۲) اگرچہ عشق میں اُس معشوق قاتل ہی کے ہاتھوں سے میں اب تک خون کے آنسو رو رہا ہوں۔ اور یہ خون میری آنسو بھری آنکھوں سے عمر بھر یوں ہی دمبدم نکل رہا ہے۔ مگر اس سے وہ قاتل کیوں ڈرنے لگا۔ کیونکہ اگر وہ کوئی یکدم مجھے قتل کریگا تو اُس سے نہیں ہو سکا کہ جو اُس کی گردن پر رہیگا اور وہ اُس کا ذمہ وار گردانا جائیگا۔

(۱۳۶۳) اس شعر میں وہ قصہ تلمیح کیا گیا ہے۔ کہ نافرمانی کی وجہ سے آدم کو ذلیل کرکے بہشت سے نکالدیا گیا تھا۔ مگر جیسے ذلیل ہوکر تیرے کوچے سے (جو بہشت کی طرح کا ہے) ہم نکالے گئے ہیں۔ ایسا بُرا حال آدم کا بھی نہیں ہوا تھا۔

(۱۳۶۴) ہر معشوق میں زلفوں کی درازی اور اُس کے قد کی درازی یہ دونوں باتیں بھلی معلوم ہوا کرتی ہیں۔ کہتا ہے۔ کہ اگر تیری پُرپیچ و خم زلف کا پیچ و خم یعنی مروڑا نکل جائے۔ اور وہ بالکل ہموار ہوجائے۔ تو اس کے بال اس قدر لمبے دکھائی دیں گے۔ کہ اس کے سامنے اے ظالم محبوب تیرے اس لمبے ترے قد کا بھرم یعنی اصل حقیقت کھلجائیگی۔ کہ وہ اتنا دراز نہیں ہے۔ جتنی کہ تیری زلفیں دراز ہیں۔ مراد یہ زلف کی لمبائی سے قد کی خوبصورتی۔ اور بناؤ سنگار ثابت کرتا ہے۔

یعنی اگر پہاڑ کی گود میں ہوں تو کوہ کے لئے بار ہوں۔ تو کیا پھر یا تا لِ شرار جستہ ہو کے سنگ کوہ سے نکل جاؤں۔ مگر یہ قابل توجہ امر ہے۔ یعنی اے کیا؟ ایسا بن جاؤں۔

(۱، ۱۳) انڈے میں مرغ کے بال و پر تو ہوا کرتے ہیں۔ مگر جب وہ ان سے اڑ نہیں سکتا۔ تو گویا وہ اس کے لئے موجب ننگ و عار ہیں۔

حل شعر۔ میں اس مرغ اسیر کی طرح ہوں۔ کہ جو ایک قفس کے کسی گوشے میں اس طرح بند ہو۔ جیسا کہ انڈے کے اندر کوئی مرغ بچہ۔ جس کے اگر انڈے میں پر بھی نکلے ہوں۔ تو گویا وہ اس کے لئے موجب عار ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہ ان سے اڑ کر باہر نہیں جا سکتا۔ لہٰذا اگر میں اس مرغ کی طرح اس انڈے سے یعنی قفس سے چھوٹ جاؤں۔ تو گویا دوبارہ زندگی حاصل ہو جائے۔

غزل

مستی بذوقِ غفلتِ ساقی ہلاک ہے (۲، ۱۳)
موجِ شراب یک مژۂ خوابناک ہے

(۳، ۱۳) جز زخمِ تیغِ ناز نہیں دل میں آرزو
جیبِ خیال بھی ترے ہاتھوں سے چاک ہے

جوشِ جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں اسدؔ (۴، ۱۳)
صحرا ہماری آنکھ میں یک مشتِ خاک ہے

(۲، ۱۳) ساقی کی غفلت کے شوق یا اُس کی غفلت شعاری

کی وجہ سے ہماری مستی یعنی نشہ ہلاک ہو گیا ہے۔ (مراد یہ کہ ساقی نے نہیں پلایا تو پھر ہمارا نشہ کہاں۔) گویا ہمارے لئے ساقی کی خواب آلود پلکیں ہی لمبی لمبی پانی کی لہر کی مانند ہوا کرتی ہیں۔) شراب کی لہریں بن گئی ہیں۔ جن کو دیکھ کر ہم رہ جاتے ہیں۔ (چونکہ ساقی غفلت شعار ہے۔ اس کی آنکھوں کو خوابناک قرار دیا ہے)

(۳، ۱۳) چونکہ ہمارے خیال کا گریبان بھی تیرے ہاتھوں سے چاک ہو چکا ہے۔ یعنی ہم کچھ خیال تک بھی دوڑا نہیں سکتے۔ (مراد کوئی ہوس۔ آرزو یا کسی کی یاد وغیرہ تک سب باتیں دل سے مٹ مٹا گئی ہیں) لہٰذا۔ ہمارے دل میں تیری آرزو صرف ایک زخمِ تیغِ ناز ہے۔ یعنی تیری ناز کی تلوار کا وہ اثر جو کہ ہمارے دل میں ہوا تھا۔ صرف وہی اب باقی ہے۔ (زخم کے مختلف معنی ہیں۔ یہاں مراد اثر)

(۴، ۱۳) اے اسد صحرا میں پھرتے پھرتے جوشِ جنوں اتنا بڑھ گیا ہے۔ کہ اب صحرا ہماری آنکھ میں کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ بجز ایک مشتِ خاک کے یعنی وہ اسقدر تنگ کم وسعت دکھائی دیتا ہے۔

دوسرے معنی۔ جوشِ جنوں میں ہم اتنے بھر گئے ہیں کہ کچھ سجھائی ہی نہیں دیتا۔ کہ کیا کریں۔ گویا صحرا بطور ایک مشتِ مٹی کے ہماری آنکھ میں پڑ گیا ہے۔ کہ جس سے ہمیں کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا۔

(۵، ۱۳) لبِ عیسیٰ کی جنبش کرتی ہے گہوارہ جنبانی
قیامت کشتۂ لعلِ بتاں کا خوابِ سنگیں ہے

(۱۳۷۵) لبِ عیسیٰ کی جنبش سے مراد ہے کہ جو دم پھونکا کرتے تھے اور اس سے مردے اُٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ گہوارہ جنبانی: گہوارہ ہلانا جس سے بچے کو نیند آ جاتی ہے۔ کُحلِ جہاں سے مراد حسینوں کے ہونٹ۔ خوابِ سنگین: پتھر کی طرح کا سخت خواب، گہری نیند۔

حل شعر۔ مسیحا کے دم پھونکنے سے مردے بھی زندہ ہو جاتے ہیں مگر حسینوں کے ہونٹ کے کشتہ (مارے ہوئے) کچھ ایسی غضب کی نیند سوئے ہوئے ہیں کہ اگر مسیحا ان پر دم پھونکیں تو وہ دم گویا گہوارہ جنبانی کرتا ہے یعنی اُن نیند کے ماتوں کو اور زیادہ سُلا دیتا ہے۔

(۱۳۷۶) آمدِ سیلابِ طوفانِ صدائے آب ہے
نقشِ پا جو کان میں رکھتا ہے انگلی جادہ سے

(۱۳۷۷) بزمِ مے وحشت کدہ ہے کس کی چشمِ مست کا
شیشہ میں نبضِ پری پنہاں ہے موجِ بادہ سے

(۱۳۷۶) نقشِ پا: کو کان سے اور جادہ یعنی پگڈنڈی کو اوپر رکھی انگلی سے یہاں تشبیہ دیا ہے۔

حل شعر۔ پانی کی طوفانی صدا یعنی خوب گرجنے والی آواز کا طوفان آ رہا ہے۔ جس سے نقشِ پا نے جادہ کی راہ سے انگلی اپنے کانوں میں دے رکھی ہے۔ کیونکہ اس کو اس قدر شور برداشت کرنا غیر ممکن ہے۔ مراد یہ کہ سیلاب بشدت آ رہا ہے۔ اور رستے پر جو نقشِ پا ہے اُس کی جان کی خیر نہیں ہے وہ اس لئے پناہ مانگ رہا ہے۔

(۱۳۷۷) وحشت کدہ۔ اس سے یہاں مراد ڈر کا گھر۔ شیشہ میں نبضِ پری پنہاں ہے۔ یعنی پری کو اپنے رعب سے مغلوب کر کے شیشہ میں بند کر لیا ہے۔ اور اُس کی نبض چلتی نظر آتی ہے۔

مطلب شعر۔ کس کی متوالی آنکھ سے بزمِ مے ڈر کا یا خوف و ہیبت کا گھر بن گئی ہے۔ اور اس بزمِ مے میں جو پری شیشہ میں اُتاری گئی ہے۔ موجِ شراب اس کی نبض وہ شراب کی لہر ہے۔ جو خوف سے متحرک ہو گئی ہے۔ کیونکہ ڈر کے وقت نبض زور سے پھڑکنے لگتی ہے۔ مراد یہ کہ معشوق کی متوالی آنکھ سارے میخانے پر چھائی ہوئی ہے۔

(۱۳۷۸) ہوں میں بھی تماشائی نیرنگِ تمنا
مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی بر آوے

(۱۳۷۸) قاعدہ ہے کہ جو شخص اپنا مطلب نکالنے کی ترکیبیں نہیں جانتا۔ وہ کسی ایک مطلب کو بھی پوری طرح حاصل نہیں کر سکتا۔ اور ہمیشہ اپنی تجویزیں اور نکتہ نظر بدلتا رہتا ہے۔ اسی بنا پر کہتا ہے کہ میں بھی اپنی تمنا کے نیرنگ یعنی طلسم کی طرح بدلنے والی آرزوؤں کا محض ایک تماشائی یا دیکھنے والا ہوں۔ اور اس سے کچھ غرض نہیں ہے کہ کوئی مقصد ضرور پورا ہو۔

(۱۳۷۹) سیاہی جیسے گر جاوے دمِ تحریر کاغذ پر
مری قسمت میں یوں تصویر ہے شب ہائے ہجراں کی

پاس روپیہ پیسہ وغیرہ کچھ نہیں ہے۔) تو اپنے دل و دین ہی کو بطور نقد پیش کر اور ساقی سے شراب خرید کرے۔ کیونکہ اس بازار میں یعنی بازار عشق و خرابات میں سائر متاع دست گرداں ہے۔ (متاع دست گرداں وہ چیز کہ جس کو ایک ہاتھ میں لیکے دوسرے ہاتھ سے اُس کی قیمت فی الفور ادا کرنی پڑتی ہو) گویا اس کا اُدھار نہیں ہوا کرتا۔ مراد یہ کہ شراب کے لئے اپنے ضمیر اور ایمان تک کو بھی فروخت کر دے۔

(۱۳۸۴) قلزم صرصر۔ ایک تند ہوا کا دریا۔ مراد بکثرت تیز ہوا یا زور کی آندھی۔ مرجان۔ مونگا۔ جو سُرخ ہوتا ہے۔ اور ایک دیے کی روشنی بھی سرخی مائل ہوا کرتی ہے۔

حل شعر۔ ہمارا روشن دیا ایک زور کی آندھی کے دریا کا گویا مونگا موتی ہے۔ (یعنی اس کو ہوا بجھانے پر تلی ہوتی ہے۔ اور وہ ہر دم خوف کھاتا ہے۔ اسطرح مجھ عاشق کو غم ایک خوف و خطر کی آغوش میں لیکے پرورش کرتا ہے۔ یعنی ہر وقت مرنے کا خوف لگا رہتا ہے۔

(۱۳۸۵) نہ آئی سطوت قاتل بھی مانع میرے نالوں کو
لیا دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہ نیستاں کا

(۱۳۸۵) قاتل کا رعب یعنی سطوت بھی میرے نالوں کو مانع نہ آئی۔ یعنی میرا آہ و فریاد کرنا وہ بند نہ کر سکی۔ چنانچہ جو تنکا دانتوں میں لیا یعنی میں خس بدنداں ہوا (خس بدنداں ہونا۔ مراد عاجز ہونا) وہ ایک نیستاں (بانسری کے جنگل) کا ریشہ بن گیا۔ یعنی اس سے بکثرت شور برآمد کرنے لگا

ساز و ساماں بہم پہنچ گیا ہے۔ مطلب یہ کہ صیاد کی سیاست سے میں نہیں ڈرتا بلکہ زیادہ شور بپا کرتا ہوں۔

غزل

خموشیوں میں تماشا ادا نکلتی ہے (۱۳۸۶)
نگاہ دل سے ترے سُرمہ سا نکلتی ہے

(۱۳۸۷) فشارِ تنگیٔ خلوت سے بنتی ہے شبنم
صبا جو غنچہ کے پردے میں جا نکلتی ہے

شہید مجھ سینۂ عاشق سے آپ تیغ نگاہ (۱۳۸۸)
کہ زخم روزنِ در سے ہوا نکلتی ہے

(۱۳۸۶) خموشیوں سے یہاں مراد عاشق کو چپ سی لگ جانا۔ کہ وہ یہاں کہیں بیٹھتا ہے حیران و پریشان۔ خیال دوست میں محو۔ کسی سے بات نہیں کرنا چاہتا۔ چونکہ ایسے موقع بکثرت اس کو پیش آتے ہیں۔ اسی لئے جمع کہا ہے۔ دل سے نگاہ کا نکلنا۔ مراد۔ کسی کی آنکھوں کا خیال دل میں بیٹھا ہونا۔ اور اس کے دیکھنے کے انداز کا تصور رہنا۔

حل شعر۔ میری خموشیوں میں بھی ایک عجب انداز پیدا ہوتا ہے۔ کہ تیرے نگاہ کی تصور کی وجہ سے تیری سرمہ آلود نظر گویا تیری طرف سے نہیں۔ بلکہ میرے ہی دل سے نکل رہی ہے۔ اور وہ میرے سامنے مجھے دکھائی دیتی رہتی ہے۔ حاصل شعر یہ کہ ہم چپ چاپ ہر جگہ بیٹھے

ہوئے تیری سرمہ آلود نظر ہی کا تصور کرتے رہتے ہیں۔

دوسرے معنی۔ جب تیری نگاہ عاشق کو گویا سرمہ کھلا رہی ہے۔ (ادل سرمہ سے آواز بند ہو کے عاشق خاموش ہو جاتا ہے۔) تو اس کی خاموشیوں میں تیری نگاہ ایک تماشا ادا نکلتی ہے۔ یعنی ایک عجیب انداز کی ادا پیدا ہوتی ہے۔ کہ وہ جب دل عاشق سے نکلتی ہے یا گویا اس کو ایسی نکلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ تو وہ بالکل سرمہ آلود دکھائی دیتی ہے۔ گویا یہ سرمہ عاشق ہی کے دل سے اس محبوب کی نگاہ و ناز کو حاصل ہوتا ہے۔

(۱۳۸۷) فشار۔ کسی چیز پر دباؤ ڈال کے اس کو نچوڑنا۔ نچوڑ دینا۔ دباؤ۔

حل شعر۔ صبا جو غنچے کے پردے میں جا کر گھس جاتی ہے۔ وہاں تنگی خلوت یعنی غنچے کی تنگ کوٹھڑی میں اس پر اتنا دباؤ پڑتا ہے۔ کہ وہ صبا۔ ہوا نہیں رہتی۔ بلکہ منجمد ہو کر شبنم بن جاتی ہے۔ (دباؤ سے کسی چیز کے ذرے پیوست ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ہوا کے اندر کی رطوبت بھی اسی طرح منجمد ہو کے پانی بنتا ہے۔ جو کہ پھر شبنم بن جاتی ہے۔) فشار تنگی خلوت تنگی جا کی وجہ سے جسم پر دباؤ پڑنا۔

(۱۳۸۸) اس شعر کی تمہید یہ ہے۔ کہ عاشق کے سینے کو دوست نے اپنی نظر کی تلوار سے چیر ڈالا ہے۔ اور وہ شگاف روزن در کی صورت سے نظر آ رہا ہے۔ لہذا کہتا ہے کہ عاشق کے سینے سے اپنی تیغ نگاہ کی آب (جو تیغ نظر چلاتے وقت سینے پر لگ کر باقی رہ گئی ہے۔) ہرگز نہ پونچھ۔ یعنی اس کو وہیں لگا رہنے دے۔ کیونکہ اب اس تلوار سے جو زخم کا شگاف وہاں پیدا ہو گیا تھا۔ اور وہ زخم گویا روزن در کی طرح فراخ تھا۔ اس سے ہوا نکلنے لگی ہے۔ زخم سے ہوا نکلنا اس کی حالت کا سخت ردی

ہونا مراد ہے) لیکن عاشق کو جو ایذا دوست ہوتا ہے۔ ایسے ہی خراب زخم کی اس کو خواہش رہا کرتی ہے۔

شاعر کا مختصر مفہوم یہ ہے۔ کہ عاشق اپنے دوست کی نگاہ کا گھائل ہے اور وہ چاہتا ہے کہ دوست کی نگاہ کا تصور جس نے دل میں ناسور ڈال دئے ہیں۔ کبھی دل سے زائل نہ ہونے پائے۔ خواہ اس میں اسے سخت اذیت برداشت کرنی پڑے۔

غزل

(۱۳۸۹) جس جا نسیم شانہ کش زلف یار ہے
نافہ دماغ آہوئے دشت تتار ہے

(۱۳۹۰) کس کا سراغ جلوہ ہے حیرت کو اے خدا
آئینہ فرش شش جہت انتظار ہے

(۱۳۹۱) ہے ذرہ ذرہ تنگی جائے غبار شوق
گر دام یہ ہے وسعت صحرا شکار ہے

(۱۳۹۲) دل مدعی و دیدہ بنا مدعا علیہ
نظارہ کا مقدمہ پھر روبکار ہے

(۱۳۹۳) چھڑکے ہے شبنم آئینۂ برگ گل پہ آب
اے عندلیب وقت وداع بہار ہے

(۱۳۹۴) پچ آ پڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے
وہ آئے یا نہ آئے پہ یاں انتظار ہے

بے پردہ سوئے وادیٔ مجنوں گذر نہ کر (۱۳۹۵)
ہر ذرہ کے نقاب میں دل بے قرار ہے

(۱۳۹۶) اے عندلیب یک کفِ خس بہرِ آشیاں
طوفانِ آمد آمدِ فصلِ بہار ہے

دل مت گنوا خبر نہ سہی سیر ہی سہی (۱۳۹۷)
اے بے دماغ آئینہ تمثال دار ہے

(۱۳۹۸) غفلت کفیلِ عمر و اسدؔ ضامنِ نشاط
اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

(۱۳۸۹) جس جگہ باغ کی ہوا اس دوست کی زلف کے بالوں میں کنگھی کرتی ہے۔ وہاں ایسی خوشبو پیدا ہوتی ہے۔ کہ جس سے وہ نافہ بنتا ہے۔ کہ جو تتار کے جنگل کے ہرن کا دماغ یعنی اُس کے سونگھنے کی چیز ہوتی ہے۔ گویا آہوئے تتار بھی جس سے مشک نکلتی ہے۔ دوست ہی کی خوشبوئے زلف سے مستفیض ہوتا ہے

(۱۳۹۰) سراغِ جلوہ۔ اُس کے نظارے کی جستجو۔ حیرت کو۔ ہمارے حیران کرنے کے لئے۔ آئینہ۔ یہاں مراد آئینۂ دل۔ فرش ہے۔ اس کا مفہوم یہ کہ کس کے لئے فرشِ راہ ہے۔ گویا اس کے لئے بچھا ہوا ہے جس طرح کسی کے آنے پر راستے میں مخمل کا فرش بچھا دیا جاتا ہے۔
ششجہت انتظار۔ شمال۔ جنوب۔ مشرق۔ مغرب۔ اوپر نیچے۔ یعنی ششجہت انتظار کرنا۔

حلِ شعر۔ اے خدا ہمارے حیران کرنے کے لئے آج کس کے

نظارے کی جستجو ہے۔ کہ ہمارا آئینہ دل ششجہت سے اس کے انتظار میں گویا فرشِ راہ بن گیا ہے۔

(۱۳۹۱) غبارِ شوق۔ شوق سے یہاں مراد شوق صحرا نوردی غبارِ شوق۔ صحرا نوردی کے شوق کے پورا نہ ہونے سے دل میں غبار یا کدورت آنا۔ دام۔ یہاں مراد پھیلاؤ۔ شکار ہے۔ یعنی ایک صید کی طرح فنا ہو چکا ہے۔

حلِ شعر۔ صحرا تنگیٔ جا یعنی کمی وسعت کی وجہ سے ذرہ ذرہ غبارِ شوق ہے۔ یعنی سرتاپا ہمارے شوقِ صحرا نوردی کے پورا نہ ہونے کے باعث دل کی کدورت بن گیا ہے۔ لہٰذا اگر صحرا کا پھیلاؤ یہی ہے۔ تو پھر اس کی وسعت گویا (ہمارا غبارِ شوق بن کے) فنا ہو چکی ہے مراد یہ کہ ہمارے لئے صحرا اور زیادہ وسیع ہونا چاہئے۔ موجودہ صحرا تو بوجہ تنگی کے ہماری صحرا نوردی کو کافی نہیں ہے۔ بلکہ اس صحرا کی سمت تک ہمارا غبارِ شوق بن کے فنا ہو گئی ہے۔

(۱۳۹۲) دوست کے نظارے کا مقدمہ پھر رو بکار ہے۔ یعنی پیش ہو چکا ہے۔ جہاں دل مدعی ہے کہ آنکھوں نے اس کو دوست کا نظارہ کرا کے آفت میں مبتلا کیا۔ لہٰذا دیدہ یعنی آنکھیں مدعا علیہ ہیں۔

(۱۳۹۳) چھڑکے ہے۔ ایران میں کسی عزیز کی رخصت کے وقت ایک شیشہ اس عزیز کی پشت پر رکھ کے پھر اس آئینہ پر پانی چھڑکتے ہیں۔ اور یہ دعا کیا کرتے ہیں۔ ؎

بسلامت روی و باز آئی

حلِ شعر۔ اے عندلیب موسم بہار کے جدا ہونے کا وقت

آگیا ہے۔ (اب تو ذرا سنبھل اور مستی بہار کو چھوڑ۔) دیکھ شبنم پھولوں کی پتیوں کے آئینہ پر پانی چھڑک رہی ہے۔ یعنی پھول کے رخصت ہونے کی رسم ادا کر رہی ہے۔ اور اسے کہہ رہی ہے۔ ؎

بسلامت روی و باز آئی

(چونکہ خزاں کے آغاز میں برف باری ہوتی ہے۔ یا رات کو شبنم پڑا کرتی ہے۔ اسی لئے پھول کی رخصتی شبنم ہی کی وساطت سے عمل میں آتی ہے۔)

(۱۳۹۴) ٹیک آپڑی ہے۔ یعنی جنبہ داری یا طرفداری کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی ہے۔

حل شعر۔ مجھ کو دوست کے وعدے کی جنبہ داری منظور ہے لہٰذا وہ آئے یا نہ آئے۔ میں حسب وعدہ اس کا انتظار کرتا ہی رہوں گا۔

(۱۳۹۵) لیلیٰ سے کہتا ہے۔ چونکہ تجھ کو مجنوں سے پرہیز ہے۔ کیونکہ معشوق اپنے عاشق سے جلد (خلا ملا نہیں کیا کرتا) تو یہ مجنوں کی وادی ہے۔ یعنی وہ جنگل ہے جس میں مجنوں پھرا کرتا ہے۔ اس میں بے پردہ گزر نہ کر۔ کیونکہ اس وادی مجنوں کے ہر ذرے کے پردے میں مجنوں کا دل بیقرار ہو رہا ہے۔ لہٰذا ممکن ہے تجھ کو دیکھ کے وہ دل مجنوں کو خبر کر دے۔ اور وہ تیرے پاس پہنچ جائے۔

(۱۳۹۶) اے بلبل فصل بہار کے آنے کی خبر اب طوفان کی طرح بسرعت آ رہی ہے۔ یعنی بہار آ ہی پہنچی ہے۔ (اور تو بالکل بیخبر ہے۔ کہ اپنا گھر گھونسلا تک بھی نہیں بنایا ہے۔) بہتر ہے کہ تو ایک مٹھی تنکے اپنے گھونسلے کے لئے جمع کر لے۔ کہ موسم بہار تک تیرا

ایک گھونسلا تو تیار ہو جائے۔ اور پھر تو بہار کا لطف اُٹھائے۔

(۱۳۹۷) اے بے دماغ۔ یعنی اے بے التفات یا لاپرواہ آدمی۔ آئینہ۔ مراد آئینہ دل۔ تمثال دار۔ جس میں کوئی تصویر موجود ہو۔

حل شعر۔ اے بے التفات یا لاپرواہ انسان تیرا آئینہ دل تصویر دار ہے۔ یعنی اس میں کسی بت کا نقشہ جما ہوا ہے۔ تو اسی کی سیر کیا کر۔ یعنی اس سے جی بہلایا کر۔ اگر تجھ کو کسی معشوق حقیقی کی خبر نہیں ہے۔ پس اس صورت میں تو اپنے دل کو غنیمت سمجھ۔ اور اسے ضائع نہ ہونے دے۔

(۱۳۹۸) غفلت نے اسد کی عمر کی کفالت کر لی ہے۔ یعنی ذمہ لے لیا ہے۔ کہ وہ ہمیشہ غافل ہی رہیگا۔ اور اسد خود اپنی خوشی کا گویا ضامن بن گیا ہے۔ یعنی اسے کامل یقین ہے۔ کہ وہ کبھی ناخوش نہیں ہوگا۔ اسے ناگہانی موت اپنے وقت (جبکہ اسد بالکل غفلت میں پڑا ہے۔ وغیرہ وغیرہ) آجانے میں کس کا انتظار ہے۔ یعنی کونسی چیز مانع ہے۔ مراد یہ کہ انسان جب بالکل غفلت میں پڑا انجام سے بیخبر عیش کی زندگی بسر کیا کرتا ہے۔ موت بھی اکثر اسی وقت میں آیا کرتی ہے۔ لیکن مصنف کے ساتھ چونکہ ایسا نہیں ہوا۔ تو وہ دریافت کرتا ہے۔ کہ اسے مرگ ناگہاں تو کس لئے نہیں آجاتی۔ اور میرا خاتمہ نہیں کر دیتی۔ اتو میں بالکل آرام و عیش میں محو ہو رہا ہوں۔

غزل

(۱۳۹۹) آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

(۱۴۰۰) حسرت نے لا رکھا تری بزم خیال میں
گلدستۂ نگاہ سویدا کہیں جسے

(۱۴۰۱) پھونکا ہے کس نے گوش محبت میں اے خدا
افسونِ انتظار تمنا کہیں جسے

(۱۴۰۲) سر پر ہجوم درد غریبی سے ڈالیے
وہ ایک مشتِ خاک کہ صحرا کہیں جسے

(۱۴۰۳) ہے چشم تر میں حسرت دیدار سے نہاں
شوق عناں گسیختہ دریا کہیں جسے

(۱۴۰۴) درکار ہے شگفتنِ گلہائے عیش کو
صبح بہار پنبۂ مینا کہیں جسے

(۱۴۰۵) غالبؔ برا نہ مان جو واعظ برا کہے
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

(۱۳۹۹) میں ایسا حسین کہاں سے لاؤں۔ کہ جس کو لوگ تجھ سا کہہ سکیں۔ (مراد یہ کہ تو بے مثل ہے۔) لہذا مناسب ہے۔ کہ میں لوگوں کو ایک آئینہ ہی دیدوں۔ کہ جس پہ تیری فوٹو کھنچی ہو۔ اور لوگ اسے دیکھکر ایک نئی چیز یا اچنبا سمجھیں۔ کہ کس طرح تیری شکل اس پر

بن گئی۔ جو بالکل تیرے مثل ہے۔ (غالب کے زمانے تک فوٹو کا رواج ہوگیا تھا۔ اور ممکن ہے کہ اس کی مراد آئینہ سے یہاں آئینہ فوٹو ہی ہو)

دوسرے معنی۔ آئینہ سے مراد آئینہ دل ہے۔ یعنی تیری تصویر میرے آئینہ دل پر ہو بہو کھنچی ہوئی ہے۔ لوگوں کو ایسا حسین نہیں ملتا۔ جو کہ تیرے جیسا ہو۔ تو وہ میرے آئینہ دل کو لیکر دیکھ لیں۔ اور وہ اسے ایک تماشا یا عجیب چیز تصور کریں گے۔ کہ کس طرح میرے دل میں تو ہو بہو موجود ہے۔

تیسرے معنی۔ عام شرحوں میں پہلے مصرعہ کا مفہوم یہ لکھا ہے۔ کہ آئینہ کیوں نہ تیرے روبرو رکھدوں کہ تیری ہو بہو تصویر اس میں آئے تو لوگ اسے دیکھ کے تعجب کریں۔ سوال یہ ہے کہ آئینے میں ہمیشہ ہو بہو عکس کھنچ جایا کرتا ہے۔ ایک ایسی معمولی بات کو تماشا ہی کون کہہ سکتا ہے بلکہ غالب ایک ایسے پا افتادہ مضمون کو نظم ہی کب کرنے لگا تھا۔ تاہم اگر شارحین موصوف کے یہی معنی قایم رکھے جائیں۔ تو یوں کہنا چاہیئے۔ کہ تیرے بے مثل ہونے میں کیا شک ہے۔ کہ کوئی حسین تجھ سا پیش نہیں کرسکتے۔ لیکن پھر ایک معمولی سا آئینہ بھی اگر تیرے سامنے رکھدیا جائے۔ تو وہ تیری طرح کا ایک حسین سامنے لاکھڑا کردیتا ہے۔ لہذا یہ امر باعث استعجاب ہے۔ کہ کس طرح تیری نظیر پیدا ہوگئی۔

(۱۴۰۰) سویدا۔ وہ کالا نشان ہے۔ کہ دل پر ہوا کرتا ہے۔ شعرا کا خیال ہے۔ کہ اسی کے ذریعہ انسان میں جذبات پیدا ہوتے ہیں

حل شعر۔ حسرت یا غم دیا اس نے تیری بزم خیال یعنی میرے دل میں وہ گلدستۂ نگاہ (یا معشوق کی نظروں کو گویا خیرہ کرنے کا

آلہ) لا رکھا ہے۔ کہ جسے بظاہر دل کا سویدا کہا جاتا ہے۔ مراد یہ کہ عاشق اپنے محبوب کی شکل و صورت یاد کیا کرتا ہے۔ اور اپنی ناکامی کے باعث سخت رنج میں ہے۔

(۱۴۰۱) افسوں۔ طلسم یا جادو۔ یہاں مراد ایک ایسی بات جو بظاہر کچھ نظر آئے۔ اور اثر اُس کا کچھ ہو۔ جیسے انتظار دوست کہ جس کی نسبت مصنف کہتا ہے۔ کہ وہ انتظار دوست ہی آخر ہماری آرزو بن گیا۔

حل شعر۔ اے خدا ہمارے گوش محبت میں کس نے انتظار دوست کا جادو پھونکا تھا۔ کہ رفتہ رفتہ (امید وصال وغیرہ کے بجائے) یہی ہماری خاص تمنا بن گیا (یہاں کس نے کا مفہوم دوست ہے)

(۱۴۰۲) رنج مسافرت یا غم افلاس کے باعث وہ ایک مٹھی خاک کہ جسے ہم صحرا سمجھتے ہیں۔ ہم کو اپنے سر پر ڈال لینی چاہئے۔ مراد یہ کہ ہم کو وطن چھوڑ کر شدت رنج کی وجہ سے تنہا جنگل میں زندگی بسر کرنی چاہئے۔ صحرا کو اس لئے مشت خاک تصور کیا گیا ہے۔ کہ جس قدر مٹی سر پہ ڈالنا مد نظر ہے۔ اُس کے مقابل صحرا محض ایک مٹھی بھر خاک ہے۔ گویا جتنا رنج ہے اُسی کے اندازے سے خاک بسر ہونا چاہئے۔ لیکن صحرا میں اتنی خاک موجود نہیں۔

(۱۴۰۳) قاعدہ ہے کہ پانی جب بافراط جمع ہو کے بہتا ہے۔ تو وہ زمین کو جو مٹی ہے۔ نظر سے اوجھل کر دیا کرتا ہے۔ لہٰذا کہتا ہے کہ دوست کے دیدار کی حسرت کی وجہ سے ہماری رونے والی آنکھ میں اس قدر گریہ ہوا۔ کہ وہ صحرا جو ایک مشت خاک ہے۔ آب گریہ میں

پنہاں ہو گیا۔

(۱۴۰۴) صبح بہار۔ یعنی موسم بہار کی صبح۔ یہاں صبح کو پنبہ (روئی) سے مشابہ کیا ہے۔ کہ دونوں کی رنگت سفید ہوا کرتی ہے۔ اور عموماً پو پھٹتے ہی پنبۂ مینا (یعنی شیشۂ شراب کے اوپر جو روئی وغیرہ دیکے اس کا منہ بند کر دیتے ہیں۔) الگ کر کے شراب انڈیلی جاتی ہے۔

حل شعر۔ گلہائے عیش کے کھلنے کے لئے (یعنی میکشی اور بھرخوشی کے واسطے) موسم بہار کی صبح درکار ہوا کرتی ہے۔ کیونکہ وہ پنبۂ مینا سے مشابہ ہے۔

(۱۴۰۵) اے غالب اگر واعظ تجھ کو ایک بُرا آدمی بتائے۔ تو تو اس کا کچھ خیال نہ کر۔ یعنی بُرا نہ مان۔ بھلا دنیا میں ایسا بھی آدمی کوئی ہے کہ جس کو ساری دُنیا ہی بھلا سمجھے اور اس میں کوئی عیب نہ بتائے۔

غزل

شبنم بہ گل لالہ نہ خالی ز ادا ہے (۱۴۰۶)
داغ دل بیدرد نظر گاہ حیا ہے

(۱۴۰۷) دل خوں شدۂ کشمکش حسرت دیدار
آئینہ بدست بت بدمست حنا ہے

شعلے سے نہ ہوتی ہوس شعلے نے جو کی (۱۴۰۸)
جی کس قدر افسردگئ دل پہ جلا ہے

(۱۴۰۹) تمثال میں تیری ہے وہ شوخی کہ بصد ذوق
آئینہ بہ انداز گل آغوش کشا ہے

قمری کف خاکستر و بلبل قفس رنگ (۱۴/۱۰)
اے نالہ نشانِ جگر سوختہ کیا ہے

(۱۴/۱۱) خو نے تری افسردہ کیا وحشتِ دل کو
معشوقی و بے حوصلگی طرفہ بلا ہے

مجبوری و دعوائے گرفتاریِ الفت (۱۴/۱۲)
دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے

(۱۴/۱۳) معلوم ہوا حال شہیدانِ گزشتہ
تیغِ ستم آئینہ تصویر نما ہے

اے پرتو خورشید جہاں تاب ادھر بھی (۱۴/۱۴)
سایہ کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

(۱۴/۱۵) ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

بیگانگیِ خلق سے بیدل نہ ہو غالب (۱۴/۱۶)
کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے

(۱۴/۰۶) شبنم بہ گل لالہ۔ یعنی لالے کے پھول پر اوس پڑنا۔ چونکہ کسی چیز پر اوس پڑنا منحوس سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا لالے پر اس کا گرنا اس کی نحوست پر دال ہے۔ خالی ازادا۔ یعنی اس میں ضرور کوئی حرکت ہوئی ہے۔ مراد کوئی معیوب بات یا فیہ پائی جاتی ہے۔ داغِ دل بیدرد۔ جو شخص درد یا رنج سے خالی ہو۔ اس کے دل میں داغ یعنی داغِ غم کا نہ ہونا۔ نظر نگاہ۔ وہ کیفیت کہ جو سب کی نظروں کے سامنے ہو۔ اچھی

بُری۔ حیا۔ شرم۔

حلِ شعر۔ گل لالہ پر جو اوس گری ہے۔ اُس میں یہ فیہ ہے۔ کہ یہ لالے کی نحوست پر دال ہے۔ یعنی وہ کچھ زیادہ قابلِ اعتنا نہیں۔ (باینکہ وہ اسقدر خوبصورت پھول ہے) کیونکہ اس کے دل میں یعنی وسط میں جو داغ پایا جاتا ہے، وہ داغِ غم نہیں ہے۔ لہٰذا سب کی نظروں میں یہ داغ بے درد اُس کے لئے باعث شرمندگی خیال کیا گیا ہے۔ (یعنی گل لالہ میں کسی کا غمِ عشق تو ہے نہیں۔ اور وہ داغِ دل لئے پھرتا ہے۔ لہٰذا اس پر اوس پڑ گئی ہے۔ تاکہ سب پر روشن ہو۔ کہ لالہ باوجود اس قدر خوبصورتی کے قابلِ پذیرائی نہیں ہے۔ کیونکہ وہ اپنی اس شرم کو سب کی نظروں سے چھپاتا ہے۔ عام شرحوں میں شبنم سے یہاں مراد وہ پسینہ ہے جو کہ لالہ اپنی حالت پر شرم کھا کے محسوس کرتا ہے۔ کیونکہ اس کو داغِ دل بیدرد ہونے کی وجہ سے سب اچھا خیال نہیں کرتے۔ مگر اعتراض یہ ہے۔ کہ شبنم لالے کی پیشانی پر نہیں گرا کرتی۔ اور عرق شرم کے لئے لازم ہے۔ کہ وہ کسی کی پیشانی پر ہی سے ظاہر ہو۔ خلاصہ یہ کہ یہاں گل لالہ پہ شبنم بھیج کر اسے اُس کو شرمندہ کرایا گیا ہے۔ کہ اس کو تو ایسا نہیں ہونا چاہئے۔

(۱۴/۰۷) یہاں دل کے خون کو دوست کے رنگتِ حنا کی سرخی سے مقابلہ کر کے گویا اپنی کشمکشِ دل کا اظہار کیا گیا ہے۔

حلِ شعر۔ وہ محبوب جو اپنے ہاتھ میں آئینہ لے کے بناؤ سنگھار کر رہا ہے۔ اور ہاتھ پاؤں میں مہندی لگا کے اس قدر بدمست یعنی محو آرائش ہو کے غافل ہے۔ کہ ہمیں آگے اپنا دیدار تک (بوجہ مہندی لگے ہونے کے) نہیں دکھا سکتا۔ اور اس سے ہمیں گونہ حسرت نصیب ہوئی۔

کہ آہ اس کے مہندی رنگے ہاتھ پاؤں کیوں نہیں دکھائی دیتے۔ اور جس سے
سرخی کی سرخی ہمارے دل میں سما گئی ہے۔ اور وہ ہمارے خون دل کی
سرخی سے کشمکش کرتی ہے۔ پس اسی کشمکش حسرت دیدار سے ہم سخت
آفت میں مبتلا ہیں۔ (دل خوں شدہ سے مراد مبتلائے رنج ہونا)

(۱۴۰۸) پہلے شعلہ سے مراد آگ کی لو ہے۔ جو کہ ہر چیز کو جلا کے
خاک کر ڈالتی ہے۔ دوسرے شعلہ سے مراد عشق ہے۔ افسردگی۔ دل
کا بیٹھ جانا۔ پژمردگی۔

مثل شعر۔ ہوس شعلہ یعنی ہوس عشق میں (جو محض ہوا و ہوس ہوا کرتی
ہے۔ اور سچا جذبہ عشق نہیں ہوتا) ایسی اسقدر افسردگی (پژمردگی) حاصل
ہوئی۔ کہ اگر شعلہ ہوتا۔ یعنی سچا جذبہ عشق تو ہماری یہ کیفیت! افسردگی نہ ہوتی
لہذا اس افسردگی دل پر جو حقیقی جذبہ عشق کی محرومی سے حاصل ہوئی۔ ہمارا
جی کیسا جلتا ہے۔ (مراد یہ کہ رقیب کی ہوس پرستی پر ہمارا دل
کیسا جلتا ہے)

(۱۴۰۹) تیری تصویر میں اس قدر شوخ رنگت یعنی سرخی و شوخی
بھری ہوئی ہے۔ کہ بڑے چاؤ سے آئینہ تصویر بھی اسی طرح تیری تصویر کے
لئے آغوش کشا ہے۔ جیسا کہ گل یعنی گلاب کا لال لال پھول۔ مطلب یہ
کہ باوجودیکہ گل گلاب اتنا سرخ سرخ اور شوخ رنگت کا ہوا کرتا ہے
مگر وہ بھی تجھ کو بغل میں دبا کے تجھ سے کچھ شوخ رنگت (مراد سرخی) کسب کیا
چاہتا ہے یعنی لیا چاہتا ہے۔ تاکہ وہ زیادہ خوشنما معلوم ہو۔ اور یہی حال
آئینہ کا ہے۔ کہ تجھ کو اپنی آغوش میں یعنی اپنے آئینہ تصویر میں بصد شوق لے
لیا چاہتا ہے۔ تاکہ وہ آئینہ خوبصورت نظر آئے۔ حاصل شعر یہ کہ تیرا چہرا اسقدر

[illegible]شنا اور زیبا ہے۔

(۱۴۱۰) مجھے یاد پڑتا ہے کہ مصنف نے اس شعر کو اردوئے معلیٰ یا کہیں
[illegible] ہندی میں حل کیا ہے۔ اور وہی معنی شارحین نے (بہ شمولیت مولانا حالی
مرحوم) اپنی شرحوں میں درج کر دئے ہیں۔ کہ یہاں "اے" کا مفہوم "بجز"
ہے۔ حالانکہ فارسی یا اردو کسی لغت میں بھی "اے" کے معنی "بجز" کے نہیں
ہیں۔ دراصل یہ "اے" جس کے اظہار کے چند ایسے موقعے ہیں کہ جن
[میں] تعجب یا افسوس پایا جاتا ہے۔ وہاں مستعمل کیا جاتا ہے۔ اور مصنف نے
[اس] کو کئی جگہ برتا ہے۔ مثلاً ؎

ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالب
آخر تو کیا ہے "اے" نہیں ہے

دوسری مثال ؎

کوہ کے ہوں بار خاطر گر صدا ہو جائیے
بے تکلف "اے" شرار جستہ کیا ہو جائیے

یعنی اے کیا۔ الخ۔

حل شعر۔ اس شعر کی نثر یوں ہے۔ جبکہ قمری کف خاکستر ہے۔ اور
بلبل قفس رنگ۔ "اے کیا"۔ (یعنی متعجب یا افسوس ہوں۔ کہ کیا) نشان
[جگر] (بس نالہ ہی ہے) گویا دوسرا مصرعہ اس طرح ہے۔ اے کیا
[نشان جگر] سوختہ نالہ ہی ہے

مطلب شعر۔ قمری بوجہ خاکی رنگت اور سرو پر فدا ہونے کے (کہ جس
[کے] ہجر میں گریاں رہتی ہے۔) محض ایک راکھ کی مٹھی بن گئی ہے۔ اور
[بلبل] بھی محض رنگوں کا ایک مجموعہ ہے۔ (ورنہ اس میں کچھ طاقت

تی ہی نہیں رہی۔ وہ فقط رونا ہی جانتی ہے) تو کیا عشق میں جب جان و جگر
ل جاتے ہیں۔ تو اس کا نشان یعنی بقیہ کیا صرف ایک نالہ ہی رہ جایا کرتا ہے
جیسا کہ بلبل یا قمری میں موجود ہے۔) اور چونکہ واقعہ ایسا ہی ہے۔ تو "ایسا"
بی سخت تعجب یا افسوس کا مقام ہے۔ کہ نشان جگر سوختہ نالہ ہے

(۱۴۱۱) وحشت سے یہاں مراد کسی بات میں نااہل ہو کے اس سے
گھبرا اٹھنا۔ جیسے کہ مبتدی عشق تکالیف عشق سے اول اول بہت پریشان
ہوا کرتا ہے۔

حل شعر۔ تیری معشوق مزاجی یعنی تلون طبیعت نے ادھر مجھ کو
بے حوصلہ کر دیا ہے۔ کہ کبھی وعدہ وصال کرتا ہے۔ اور کبھی اس کا حوصلہ نہیں
پاتا۔ اسی طرح ادھر ہم بھی مبتدی عشق ہیں۔ اور تیرے اس تلون مزاج
سے گھبرا اٹھتے ہیں۔ کیونکہ اس نے ہماری اس وحشت دل کو بالکل بجھا سا
دیا ہے۔ لہذا یہ کشمکش عشق ایک بری بلا ہے۔ (تیرے لئے بھی اور ہمارے
لئے بھی۔)

دوسرے معنی۔ خوے مراد۔ بدمزاجی۔ افسردہ کیا۔ جوش و خروش
زائل کر دیا۔ وحشت دل۔ عاشق کے دل کا جنون۔

حل شعر۔ تیری بدمزاجی نے میرے جوش جنون پر گویا اوس سی
ڈالدی ہے۔ یعنی اس کا جوش ٹھنڈا کر دیا ہے۔ (اور میں بے حوصلہ ہو گیا
ہوں۔) لہذا یہ تیری معشوقی یعنی دلفریبی۔ جس کے باعث میں تیری بدمزاجی
کے ظلم سہتا ہوں۔ اور اس سے اتنا بے حوصلہ سا ہو گیا ہوں (کہ تمام جوش
جنون ٹھنڈا ہو گیا ہے۔) میرے لئے سخت مصیبت ہے۔ کیونکہ جب تک
بے حوصلہ نہیں ہوا تھا۔ تیری بدمزاجی کی مطلق پرواہ نہیں کیا کرتا تھا۔ اور

تیرے ظلم سہے جاتا تھا۔

(۱۴۱۲) مجبوری۔ وہ حالت مجبوری کہ جو اپنے بس کی نہ ہو۔ مثلاً
ہر شخص چاہتا ہے۔ کہ بیمار نہ ہو۔ مگر مجبور ہے یعنی وہ کبھی نہ کبھی علیل ہو ہی
جاتا ہے۔ دعوائے گرفتاری الفت یعنی یہ دعویٰ کہ ہم کسی کے اسیر محبت ہیں
یا عاشق ہیں۔ یا دوسرے الفاظ میں عاشق ہو کے مصائب عشق جھیلا کرتے
ہیں۔ دست تہ سنگ آمدہ یعنی پتھر کے نیچے (اپنی خواہش کے سراسر خلاف)
ایک ہاتھ کا دب جانا۔ پیمان وفا۔ دوست سے وفا نباہنے کا اقرار۔

حل شعر۔ ہماری وہ حالت ہے۔ کہ عشق کی سختیاں برداشت کرتے
کرتے مجبور و معذور ہو گئے ہیں۔ اس پر بھی دعوئ عشق ہے۔ یعنی گویا ہمارے
قرار وفا کے نباہ کی صورت ہے۔ کہ جیسے کسی کا ہاتھ (سراسر اس کی مرضی کے
خلاف) ایک بھاری پتھر کے نیچے دب گیا ہو۔ اور وہ اس کو وہاں سے نکال
نہ سکتا ہو۔ (مراد۔ ہم مبتلائے عشق ہیں۔ اور اس سے اب بھاگنا تو چاہتے ہیں۔
مگر راہ فرار نظر نہیں آتی۔) تو فخر کرتے ہیں۔ کہ ہم عاشق ہیں۔

(۱۴۱۳) ہم جب یہ سنتے ہیں۔ کہ فلاں شخص ظالم تھا۔ تو اس کے صریح
ظلم یعنی تیغ ستم کی کارگزاریاں سن سن کر ہمیں معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ اس کے
ہاتھ سے کون کون شہید ہوا تھا۔ لہذا یہ تیغ ستم ایک ایسا آئینہ ہے۔ کہ جس
کے اندر سے کوئی تصویر نظر آیا کرتی ہے۔ جو اپنا سارا حال اپنی زبانی بیان
کر رہی ہے۔ (گویا تیغ ستم کے تصور سے مظلوم کی طرف خیال منتقل ہوا
کرتا ہے۔) اور ہم ظالموں کا حال جان لیتے ہیں

(۱۴۱۴) سایہ کی طرح۔ یعنی جس طرح سایہ پا افتادہ اور سنسان
تاریک نظر آیا کرتا ہے۔ مراد یاس انگیز۔ عجب وقت پڑنا۔ یعنی ایسا وقت آنا۔ کہ

ہر طرف مصیبت ہی مصیبت نظر آئے۔

حل شعر۔ اے دنیا بھر کو روشن کرنے والے آفتاب سے عکس تو ادھر بھی کچھ توجہ کر۔ اور ہم سے اس سایہ کو دور کر۔ یعنی ایک ایسی حالت یاس انگیز۔ کہ جس کی بدولت ہم عجب عجب مصائب میں مبتلا ہیں۔

(۱۴۱۵) چونکہ انسان سے جتنے افعال بد سرزد ہوتے ہیں۔ وہ ان سے کچھ زیادہ افعال بد سرزد کرنے کا متمنی ہوا کرتا ہے۔ لہذا ناکردہ گناہ والے گناہ جن کو عمل میں نہیں لایا گیا۔) کردہ گناہوں سے ضرور زیادہ ہوتے ہیں اسی لئے کہتا ہے۔ اے خدا اگر تو مجھ کو ان کردہ گناہوں کی سزا دینا چاہتا ہے اور بخشتا نہیں ہے۔ تو پھر (اس سے زیادہ) جو ناکردہ گناہ مجھ کو مبتلائے حسرت کرکے (اس تیری سزا سے بھی پہلے) میرے عذاب دل کا باعث بن چکے ہیں۔ اس عذاب کا بھی کچھ انصاف کر۔ یعنی محض اسی خیال سے مجھے (رحم کرکے) بخشدے۔

دوسرے معنی۔ خدا کو طنزاً کہتا ہے۔ کہ اول تو تو غفور الرحیم ہے۔ مجھے میرے گناہوں پر ضرور بخشدے۔ اور اگر تو ایسا نہیں کرتا۔ اور اپنے اوصاف کے خلاف مجھے سزا دینے ہی پر تلا ہوا ہے۔ تو مجھے ان گناہوں کا بھی معاوضہ دیدے۔ کہ جن کے ارتکاب کی میرے دل میں صرف آرزو ہی آرزو موجود تھی اور وہ ناکردہ گناہ ہیں۔ یعنی وہ گناہ کئے نہیں ہیں۔ اور ان سے مجھے حسرت پہنچی ہے۔ جس کی تلافی ہونا ضروری ہے۔

(۱۴۱۶) بیگانگی۔ وہ حالت کہ جب کسی کا کوئی یگانہ یعنی اپنا نہ ہو۔ بیگانگی خلق۔ عام لوگوں کی بے مروتی۔ اے غالب عام لوگوں کی بے مروتی سے تو مایوس نہ ہو جا۔ اگر تیرا کوئی (رفیق و ہمدرد) نہیں ہے۔ تو میری جان آخر تیرا اللہ

تو ہے وہ تیری مدد کریگا۔

غزل

(۱۴۱۷) منظور تھی یہ شکل تجلی کو نور کی
قسمت کھلی ترے قد و رخ سے ظہور کی

(۱۴۱۸) اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

(۱۴۱۹) واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی

(۱۴۲۰) کہتا ہے مجھ سے حشر میں قاتل کہ کیوں اٹھا
گویا ابھی سنی نہیں آواز صور کی

(۱۴۲۱) آمد بہار کی ہے جو بلبل ہے نغمہ سنج
اڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی

(۱۴۲۲) گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں
کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

(۱۴۲۳) کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی

(۱۴۲۴) گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر
کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی

غالب گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں (۱۴۲۵)
حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

(۱۴۱۷) تجلی - چمک دمک دکھانا۔

حل شعر - تجلی (یہاں مراد تجلی الٰہی) کو اپنے نور کی شکل دکھانی منظور ہوئی تھی۔ اسی لئے اس قسم کے ظہور کی قسمت تیرے قد اور رخ کو پیدا کرکے گویا کھل گئی۔ یعنی تو ہی مظہر نور تجلی بن گیا۔ (یہ شعر نعت میں ہے کیونکہ آنحضرتؐ کے نور اور اس کے ظہور کے متعلق نعتیہ دیوانوں میں اکثر ایسے اشعار پائے جاتے ہیں)

(۱۴۱۸) چونکہ قبر میں ان لوگوں پر جو تیرے کشتہ ناز ہیں۔ حور کی آنکھ پڑتی ہے۔ یعنی بہشت سے کوئی حور اُن کی منتظر دیکھ رہی ہے۔ لہٰذا ان کے کفن پر جس سے گویا خون ٹپکا پڑتا ہے۔ کروڑوں بناؤ سنگار یعنی زیبائشیں پائی جاتی ہیں۔ (سفید سفید کفن پر لال لال خون کے داغ گویا ایک قسم زینت ہیں۔ اور اس زینت سے حور کی آنکھ مناسبت رکھتی ہے)

(۱۴۱۹) شراب طہور وہ شراب جو بہشت میں پلائی جائے گی اور اس دنیا میں نہیں ہوتی۔ اس لئے کہتا ہے۔ اے واعظ۔ تیری شراب طہور کا کیا کہنا۔ نہ تو تو اسے یہاں خود پی سکتا ہے۔ اور نہ کسی کو وہ پلا سکتا ہے مگر اس پر اتنی تعریفیں اس کی کیا کرتا ہے۔

(۱۴۲۰) قیامت برپا ہو گئی۔ صور پھونکا گیا۔ اور جب مردے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ تو میں بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔ مگر مجھ سے وہ قاتل معشوق لڑتا جھگڑتا ہے۔ کہ میں کیوں اُٹھا۔ گویا صور قیامت کی ابھی آواز ہی نہیں

سُنی گئی۔ یعنی وہ محبوب اس قدر غافل ہے۔ کہ اتنے زبردست واقعات گذر گئے۔ اور اس کو خبر ہی نہیں ہوتی۔ مراد یہ کہ اس کو قتل کرنے سے مطلب وہ قیامت سے کیا ڈرتا ہے۔ کہ وہاں اُس کے ظلم کا انصاف کیا جائیگا۔

(۱۴۲۱) موسم بہار کی آمد آمد ہے۔ جو بلبل باغ میں گا رہی ہے یہ بلبل کا گانا گویا بہار کی ایک اُڑتی سی خبر یعنی افواہ ہے۔ جو کہ جانوروں کی زبان سے سُنی گئی ہے۔ مراد یہ کہ بہار آ رہی ہے۔ اور اس کے آثار بلبل کی نغمہ سنجی ہے۔

(۱۴۲۲) خانہ کعبہ میں اسلام سے قبل بت پوجے جاتے تھے۔ لہٰذا اسلام کو بتوں سے ایک دور کا تعلق ہے۔ یہی اس شعر کا مضمون ہے۔ کہ اگرچہ بت اب کعبہ میں نہیں ہیں۔ اور وہاں سے نکالے جا چکے ہیں۔ مگر پھر بھی ان کو کعبہ سے ایک دور کا واسطہ ہے۔ (گویا اسلام اور کفر ایک دوسرے کے ساتھ ضرور تعلق رکھتے ہیں۔)

(۱۴۲۳) کوہ طور کی سیر الخ۔ اس تلمیح سے یہ مراد ہے کہ حضرت موسیٰ طور پر خدا سے کلام کرنے گئے تھے۔ مگر دیدار کے متحمل نہ ہو سکے تھے۔

حل شعر - یہ کیا ضرور ہے کہ سب کو ایک ہی سا جواب ملے۔ آؤ ہم بھی کوہ طور کی سیر کرکے خدا سے ہم کلام ہوں۔ شاید کامیابی حاصل ہو جائے (مراد یہ کہ دوسروں کی ناکامی پر اپنا حوصلہ نہیں ہارنا چاہیئے)

(۱۴۲۴) کلام میں گرمی یعنی شوخی و تیزی ہو تو کچھ مضائقہ نہیں ہے۔ لیکن یہ گرمی بہ حد اعتدال ہونی چاہیئے۔ تاکہ ایسا نہ ہو کہ سننے والا برہم ہو جائے اور شوخی زبان کی ضرور شکایت کرے۔

(۱۴۲۵) مسلمانوں کا دستور ہے۔ کہ کسی غریب آدمی کو حج کرا کے حج کا ثواب

اُس سے خود لے لیا کرتے ہیں۔

مطلب شعر۔ غالب اگر بادشاہ مجھ کو اپنے سفرِ حج میں ہمراہ لے چلیں تو حج کا ثواب حضور کی نذر کر دوں گا۔ اس شعر میں شوخی یہ ہے۔ کہ بادشاہ تو خود حج کر کے اس کے ثواب سے گویا مستغنی ہو جائیگا۔ اور غالب کے ثواب حج کی اسے چنداں ضرورت نہیں رہیگی۔ لہذا اس سے غالب کو ایک تو مفت کا حج نصیب ہوگا۔ دوسرے بادشاہ کا احسان بھی سر پر نہیں رہیگا

(مولانا حالی فرماتے ہیں۔ کہ اس شعر میں شوخی یہ ہے۔ کہ ایک طرف تو حج کے ثواب کی غالب کو اتنی آرزو ہے۔ دوسری طرف یہ بیقدری کہ اس کو بادشاہ کے نذر کئے دیتا ہے۔ مگر سوال یہ ہے۔ کہ ایسا تو عام دستور ہی ہے۔ پھر غالب سے کیا خصوصیت کہ ایسا حج اُس کی شوخی میں شامل سمجھا جائے۔ دراصل شوخی یہ کہ وہ بادشاہ کے ہمراہ جانا چاہتا ہے۔ کہ اسکو حج کا حج اور حج کا حج یہ دونوں فائدے حاصل ہوں)

غزل

(1426) غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے
یہ رنج کہ کم ہے مے گلفام بہت ہے

(1427) کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ
ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے

(1428) نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

(1429) کیا زہد کو مانوں کہ نہ ہو گرچہ ریائی
پاداشِ عمل کی طمعِ خام بہت ہے

(1430) ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں
پابستگیِ رسم و رہِ عام بہت ہے

(1431) زمزم ہی پہ چھوڑو مجھے کیا طوفِ حرم سے
آلودہ بہ مے جامۂ احرام بہت ہے

(1432) ہے قہر گر اب بھی نہ بنے بات کہ ان کو
انکار نہیں اور مجھے ابرام بہت ہے

(1433) خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ
رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے

(1434) ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غالب کو نہ جانے
شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے

(1426) چونکہ میرا دل غم کھانے میں بہت بودا یعنی ہیٹا ہے یہ غم کہ مے گلفام (یعنی خوش رنگ شراب میرے پاس پینے کو) کم ہے۔ یہ (غم) میرے لئے بہت تکلیف دہ ہے۔ کیونکہ میرا بودا دل اس کو برداشت نہیں کر سکتا۔

(1427) ساقی سے کچھ کہتے ہوئے (یہ بد ابتی مزاج و مرنجان طبع کے) مجھے شرم آتی ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مجھے شراب کی تلچھٹ یعنی دُردِ تہِ جام ہی کافی ہے۔

دوسرے معنی یہ کہ ساقی کا لحاظ کرکے میں اُسے کچھ نہیں کہتا۔ ورنہ

اُس سے خوش ہوا کرتے ہیں۔

مطلب شعر۔ غالب اگر بادشاہ مجھ کو اپنے سفرِ حج میں ہمراہ لے چلیں تو حج کا ثواب حضور کی نذر کر دوں گا۔ اس شعر میں شوخی یہ ہے۔ کہ بادشاہ تو خود حج کر کے اس کے ثواب سے گویا مستغنی ہو جائیگا۔ اور غالب کے ثواب حج کی اسے چنداں ضرورت نہیں رہیگی۔ لہٰذا اس سے غالب کو ایک تو مفت کا حج نصیب ہوگا۔ دوسرے بادشاہ کا احسان بھی سر پر نہیں رہیگا۔

(مولانا حالی فرماتے ہیں۔ کہ اس شعر میں شوخی یہ ہے۔ کہ ایک طرف تو حج کے ثواب کی غالب کو اتنی آرزو ہے۔ دوسری طرف یہ بیقدری کہ اس کو بادشاہ کے نذر کئے دیتا ہے۔ مگر سوال یہ ہے۔ کہ ایسا تو عام دستور ہی ہے۔ پھر غالب سے کیا خصوصیت کہ ایسا حج اُس کی شوخی میں شامل سمجھا جائے۔ دراصل شوخی یہ کہ وہ بادشاہ کے ہمراہ جانا چاہتا ہے۔ کہ اسکو حج کا حج اور رنج کا رنج یہ دونوں فائدے حاصل ہوں)

غزل

غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے (۱۴۲۶)
یہ رنج کہ کم ہے مے گلفام بہت ہے

(۱۴۲۷) کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ
ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں (۱۴۲۸)
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

(۱۴۲۹) کیا زہد کو مانوں کہ نہ ہو گرچہ ریائی
پاداشِ عمل کی طمعِ خام بہت ہے

ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں (۱۴۳۰)
پابستگیِ رسم و رہِ عام بہت ہے

(۱۴۳۱) زمزم ہی پہ چھوڑو مجھے کیا طوفِ حرم سے
آلودہ بہ مے جامۂ احرام بہت ہے

ہے قہر گر اب بھی نہ بنے بات کہ ان کو (۱۴۳۲)
انکار نہیں اور مجھے ابرام بہت ہے

(۱۴۳۳) خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ
رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے

ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غالب کو نہ جانے (۱۴۳۴)
شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے

(۱۴۲۶) چونکہ میرا دل غم کھانے میں بہت بودا یعنی ہیٹا ہے یہ غم کہ مے گلفام (یعنی خوش رنگ شراب میرے پاس پینے کو) کم ہے۔ یہ (غم) میرے لئے بہت تکلیف دہ ہے۔ کیونکہ میرا بودا دل اس کو برداشت نہیں کر سکتا۔

(۱۴۲۷) ساقی سے کچھ کہتے ہوئے (بوجہ اپنی مرنج و مرنجان طبع کے) مجھے شرم آتی ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مجھے شراب کی تلچھٹ یعنی دُردِ تہِ جام ہی کافی ہے۔

دوسرے معنی یہ کہ ساقی کا لحاظ کرتے ہیں اُسے کچھ نہیں کہتا۔ ورنہ

مجھے جو جام شراب اُس نے دیا ہے۔ اس میں اوروں کی نسبت تلچھٹ بہت زیادہ ہے۔

(۱۴۲۸) مجھ کو پنجرے کے کونے میں زبا وجود اسیری کے) بہت اطمینان اور آرام حاصل ہے۔ کیونکہ جو جانور قفس میں ہو۔ اُس کے لئے نہ تو کوئی تیر کمان میں لگاتا ہے۔ کہ اس پر چلائے۔ اور نہ اس کے پکڑنے کو صیاد کبھی گھات میں بیٹھا کرتا ہے۔ (مراد یہ کہ گمنام آدمی کے دشمن بہت کم ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ امن چین سے رہتا ہے)

(۱۴۲۹) اگرچہ میرے دل میں ریائی یعنی فریب و دغا کی عبادت کرنے کا خیال نہ ہو۔ پھر بھی میں زہد یعنی عبادت کے اُس عقیدے کو کیا مانوں۔ کہ جس پر عبادت کی بنا ہے۔ یعنی زاہد کو اگلے جہان میں حوریں ملیں گی۔ دراصل اس پاداش عمل یعنی اعمال نیک کے معاوضے میں طمع خام بہت ہے یعنی یہ کسی یقینی عقیدے پر مبنی نہیں ہے۔ کیونکہ ممکن ہے وہاں حوریں ملیں یا نہ ملیں۔ جیسے مصنف کا ایک اور شعر اسی مضمون پر ہے۔ ؎

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت ساری
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

دوسرے معنی۔ یہ کہ مجھ کو تو خدا کی عبادت محض اسی کی عقیدت کے خیال سے کرنی چاہیے۔ یہ زاہد جو بہشت کو حاصل کرنے کے لئے زہد و عبادت کرتا ہے۔ اور ما نا کہ وہ فریب کی نماز بھی نہیں پڑھتا۔ تاہم اس کے مدعا کو میں ایک طمع خام خیال کرتا ہوں۔ کیونکہ میرے نزدیک ؎

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ

دوزخ میں ڈالدو کوئی لیکر بہشت کو

(۱۴۳۰) جس حالت میں عوام و خواص یعنی سب کے سب عام طور پر رسم و رواج ہی کی پابندی کرتے ہیں۔ تو پھر وہ کونسی خاص روش ہے۔ کہ جس پر اہل دانش چلتے ہیں۔ اور اس کا فخر جتاتے ہیں۔ (مراد یہ کہ رسم و رواج کی پابندی میں اہل دانش بھی مبتلا ہیں۔ تو وہ مُنہ سے کیا کہتے ہیں کہ ہم ایسا نہیں کیا کرتے۔ یا نہیں کرنا چاہئے)

(۱۴۳۱) مجھے زمزم ہی پر (جو کعبہ میں ایک میٹھے پانی کا چشمہ ہے۔ اور بہت مقدس ہے) بیٹھا رہنے دو۔ مجھے خانہ کعبہ کے چکر کاٹنے سے کیا تعلق۔ میرا جامہ احرام (یعنی وہ کپڑا جسے میں باندھ کے حج کیا جاتا تھا) شراب سے بہت آلودہ ہو گیا ہے۔ اور میں اس کو آب زمزم سے اب دھوؤنگا۔ (حاصل شعر یہ کہ میں ایسا رند ہوں۔ کہ خانہ کعبہ میں بھی میخواری کو میں نے ترک نہیں کیا۔ گویا انسان ثواب کرتے کرتے بھی ارتکاب گناہ کرنے لگتا ہے۔)

(۱۴۳۲) اُن کو تو میرا کوئی مقصد پورا کرنے سے انکار نہیں ہے۔ اور مجھے بھی اپنے مقصد برآری پر بہت ابرام یعنی اصرار ہے۔ تو قہر ہو گا۔ کہ اگر اس صورت میں بھی میری کوئی بات یا غرض پوری نہ ہو۔ (ایک حدیث ہے کہ بندہ جب خدا کی بہت تلاش کرتا ہے۔ تو وہ گویا اس کے قریب آجاتا ہے۔ مراد۔ جویندہ یابندہ۔ مراد یہ کہ خدا تو دیتا ہے۔ اگر دلی شوق ہو

(۱۴۳۳) ابھی میرا جگر خون کے آنسو بن کے آنکھ سے بہ شکل گریہ نہیں ٹپکا۔ لہذا اے موت مجھے ابھی یہاں زندہ رہنے دے۔ کیونکہ مجھے ابھی بہت سا کام کرنا باقی ہے۔ حاصل شعر یہ کہ انسان کے تفکرات

سلسلہ تو کبھی ختم نہیں ہوتا۔ اور یہ آرزو پر آرزو کئے جاتا۔ یعنی خون جگر کھانے کا ہمیشہ مشغلہ رہتا ہے۔ لہٰذا شاعر موت سے ملتجی ہے۔ کہ مجھے تھوڑی مدت اور جیتا رہنے دے۔

(۱۴۳۴) کیا ایسا کوئی شخص بھی ہے جو غالب کو نہ جانے۔ مگر افسوس۔ وہ شاعر تو اچھا ہے۔ (گو جس کی وجہ سے اس کی شہرت ہے) مگر بدنام بہت ہے۔ (یعنی اس کے اشعار سنکر لوگ کچھ سمجھ نہیں سکتے۔ تو اس کو کسی نہ کسی طرح بدنام بھی کرتے رہتے ہیں یا آدمی تو وہ قابل قدر ہے مگر مے گساری وغیرہ کی وجہ سے بدنام ہے۔ یا اس کے مخالفوں نے اسے بدنام کر رکھا ہے۔

غزل

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے (۱۴۳۵)
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

(۱۴۳۶) کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کئے ہوئے

پھر وضعِ احتیاط سے رکنے لگا ہے دم (۱۴۳۷)
برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کئے ہوئے

(۱۴۳۸) پھر گرم نالہ ہائے شرربار ہے نفس
مدت ہوئی ہے سیرِ چراغاں کئے ہوئے

پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق (۱۴۳۹)
سامانِ صد ہزار نمکداں کئے ہوئے

(۱۴۴۰) پھر بھر رہا ہوں خامۂ مژگاں بخونِ دل
سازِ چمن طرازیِ داماں کئے ہوئے

باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب (۱۴۴۱)
نظارہ و خیال کا سامان کئے ہوئے

(۱۴۴۲) دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویران کئے ہوئے

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب (۱۴۴۳)
عرضِ متاعِ عقل و دل و جان کئے ہوئے

(۱۴۴۴) دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال
صد گلستاں نگاہ کا سامان کئے ہوئے

پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا (۱۴۴۵)
جان نذرِ دلفریبیِ عنوان کئے ہوئے

(۱۴۴۶) مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
زلفِ سیاہ رخ پہ پریشان کئے ہوئے

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو (۱۴۴۷)
سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کئے ہوئے

(۱۴۴۸) اک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کئے ہوئے

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں (۱۴۴۹)
سر زیرِ بارِ منتِ درباں کئے ہوئے

(۱۴۵۰) جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن

بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے
غالبؔ ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے (۱۴۵۱)
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کئے ہوئے

(۱۴۳۵) بہت مدت ہوئی کہ دوست کی مہمانداری نہیں کی گئی۔ اور شراب کے پیالے بھر بھر کے محفل نہیں سجائی۔ تاکہ لبریز پیالے چھلکتے دکھائی دیتے۔ اور ان پیالوں میں جبکہ شراب گلو تک بھری ہوتی۔ تو وہ تمام پیالے گویا ایک بزمِ چراغاں کی طرح دکھائی دیتے یا خوب روشنی کرتے اور شراب کا دور چلتا۔

(۱۴۳۶) عرصہ ہوا کہ اپنے جگر کے ٹکڑوں سے یار کی مژگاں کی دعوت نہیں کی۔ لہٰذا پھر جگر کے ٹکڑے جمع کر رہا ہوں۔ کہ دعوت مژگاں کروں۔

(۱۴۳۷) وضعِ احتیاط۔ احتیاط یا ضبط کی صورت۔ یا طریقہ۔ پھر میرا دم وضعِ احتیاط سے رکنے لگا ہے۔ کیونکہ برسوں ہوئے اپنا گریبان ہی چاک نہیں کیا۔ (گویا عشق میں اب تک ضبط سے کام لیا گئے۔) حالانکہ عاشق کو گریبان چاک کرتے رہنا چاہیے۔

(۱۴۳۸) پھر میرا نفس یعنی میری سانس آگ برسانے والی آہوں میں سرگرم ہے۔ کیونکہ مدت ہوئی کہ ایسی چراغاں کی سیر یا زیارت نہیں کی۔ (آہِ شرربار کو بوجہ شرارہ یا لو کے چراغاں سے نسبت دی ہے)

(۱۴۳۹) پھر میرا عشق۔ دل کی جراحت یعنی اس کی مرہم پٹی

کرنے کو تیار ہوا ہے۔ اور ہزاروں نمکدانوں کا سامان کر لیا گیا ہے۔ (تاکہ ان سے نمک بکھیر کر زخمِ دل پر چھڑکا جائے۔

(۱۴۴۰) پھر میری پلکوں کے قلم خونِ دل میں گویا ڈبوئے جا رہے ہیں کیونکہ ان سے دامن پر چمن طرازی یعنی گل بوٹے ڈالنے کا ساز و سامان کیا گیا ہے۔ یعنی رو رو کر دامن پر گلفشانی کرنا چاہتا ہوں۔

(۱۴۴۱) پھر میرے دل و دیدہ ایک دوسرے کے رقیب بن گئے ہیں۔ چنانچہ آنکھوں نے تو نظارہ یعنی معشوق کے دیکھنے کا ساز و سامان کر لیا ہے۔ اور دل نے خیالِ دوست کا یا اس کے جمال کے تصور کو پیشِ نظر رکھنے کا۔

(۱۴۴۲) پندار یعنی غرور و تکبر کا صنم کدہ (بتکدہ) ویران کرکے (مراد ہے نیک کرداری کے زعم و غرور کو ترک کرکے) میرا دل (عشق کے) کوچۂ ملامت کے ارد گرد چکر لگانے کو جانے لگا ہے۔ اس لئے کہ عشق میں کوئی ملامت تو کرتا ہے۔ لیکن چونکہ خاکساری اختیار کرنی پڑتی ہے۔ جو اس بتکدۂ پندار سے بہتر ہے۔ کہ جس میں غرور و تکبر بھرا جائے۔ مطلب یہ کہ مجھے خود بینی و تکبر نہیں درکار ہے۔ تو عاشق بن کے بدنام ہوا چاہتا ہوں۔

(۱۴۴۳) پھر میرا شوق یعنی شوقِ عشق عقل اور دین اور جان کے مال و متاع کو کسی خریدارِ دل یعنی محبوب کے پیشِ نظر کرنے کے لئے ایسے خریدارِ دل کا طالب ہوا ہے۔ گویا وہ شوقِ عشق پھر رہا ہے۔ جس میں جان اور عقل و دین سب کو محبوب کے حوالے کر دینا پڑتا ہے۔

(۱۴۴۴) پھر میرا خیال ہر ایک گل و لالہ پہ دوڑ رہا ہے۔ یعنی میرے تصور میں گل و لالہ (جو دوست کے رخسار سے مشابہ ہیں۔ [illegible]

پھر رہے ہیں۔ اور ان سے میری آنکھوں کے سامنے گویا سیکڑوں گل و لالہ کے باغ دکھائی دے رہے ہیں۔ مراد یہ کہ میرے دوست کے رخسار اسقدر خوبصورت ہیں اور میں اُنکو یاد کر رہا ہوں۔

(۱۴۴۵) پھر مجھے گویا دوست کا خط پہنچا ہے۔ اور میں اسے کھول کر پڑھنا چاہتا ہوں۔ اور اس میں جو عنوان ہوگا۔ یعنی دوست کے ہاتھ سے میرا نام و نشان وغیرہ۔ میں اس کی دلاویزی کے صدقے میں اپنی جان تک کو قربان کر دینا چاہتا ہوں۔ یعنی اس نے عنوان میں مجھے "میرا پیارا دوست وغیرہ" ایسے الفاظ سے مخاطب کیا ہوگا۔

(۱۴۴۶) میری ہوس بادل کی آرزو پھر چاہتی ہے۔ کہ کوئی (حسین) اپنی سیاہ زلفوں کو (خوبصورت) چہرے پر ڈال کے کوٹھے پر آئے (اور مجھے جھانکے تو اس سے میں اظہار ہوس کروں)

(۱۴۴۷) پھر مجھ کو یہ آرزو اُٹھی ہے۔ کہ کوئی حسین میرے سامنے آ جائے۔ کہ جس نے مژگان کے خنجر (مراد اپنی لمبی اور تیز پلکوں) کو سرمہ لگا کے خوب سجایا ہوا ہو۔ (تاکہ وہ مجھ کو خنجر سے قتل کر دے)

(۱۴۴۸) پھر میری نگاہ ایک ایسے نوبہار ناز کو یعنی کسی ایسے خوش ادا نوجوان نازنین کو تاک رہی ہے۔ کہ جس کا چہرہ مئے ریاب کے پینے سے جو فروغ یعنی سُرخی منہ پر آیا کرتی ہے۔ اُس سے وہ مثل گلستاں دکھائی دیتا ہو۔

(۱۴۴۹) پھر میرے جی میں یہ تمنا ہے۔ کہ اپنا سر زیر بار منت درباں کئے ہوئے۔ یعنی کسی دربان کی منت سماجت کر کے اور اس کا احسان اٹھا کے کسی (محبوب) کے در پہ پڑے رہیں۔

(۱۴۵۰) ہمارا دل پھر یہ چاہتا ہے۔ کہ گذرے ہوئے زمانے کی طرح پھر کچھ فرصت مل جائے۔ تو اپنے محبوب کا تصور اپنے دل میں رات دن جمائے بیٹھے رہیں۔

(۱۴۵۱) غالب ہمیں تو دق نہ کر۔ کیونکہ ہم پھر اپنے جوش اشک سے ایک طوفان برپا کرنے کا ارادہ کئے ہوئے بیٹھے ہیں۔ (اگر یہ طوفان برپا ہوا تو اس میں تو بہہ جائیگا)

غزل

(۱۴۵۲) نوید امن ہے بیداد دوست جاں کے لئے
رہی نہ طرز ستم کوئی آسماں کے لئے

(۱۴۵۳) بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے
رکھوں کچھ اپنی بھی مژگان خونفشاں کے لئے

(۱۴۵۴) وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لئے

(۱۴۵۵) رہا بلا میں بھی میں مبتلائے آفت رشک
بلائے جاں ہے ادا تیری اک جہان کے لئے

(۱۴۵۶) فلک نہ دور رکھ اُس سے مجھے کہ میں ہی نہیں
دراز دستی قاتل کے امتحاں کے لئے

(۱۴۵۷) مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے

(١٤٥٨) گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے
اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

(١٤٥٩) بقدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے

(١٤٦٠) دیا ہے خلق کو بھی تا اُسے نظر نہ لگے
بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے

(١٤٦١) زباں پہ بارِ خدا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

(١٤٦٢) نصیر دولت و دیں اور معین ملت و ملک
بنا ہے چرخ بریں جس کے آستاں کے لئے

(١٤٦٣) زمانہ عہد میں اُس کے ہے محو آرائش
بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لئے

(١٤٦٤) ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لئے

(١٤٦٥) ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

(١٤٥٢) اب آسمان کے لئے کوئی نیا طریقہ ہمارے ستانے یا ہم پر ظلم کرنے کا باقی نہیں رہا ہے۔ لہٰذا اس کے ستم سے جو ہمیں کچھ دلپسند بھی نہیں تھا۔ ہماری گلو خلاصی ہوئی۔ اور ایک دوست کا ظلم ہماری جان کے لئے اب برقرار ہے۔ مگر یہ ہم کو اس قدر پسند ہے۔ کہ یہ گویا ظلم نہیں ہے

بلکہ نوید امن یعنی امن و اماں کا مژدہ ہے۔ (ظلم اور امن ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ لہٰذا کہتا ہے۔ کہ آسمان کا ظلم تو ظلم ہے۔ مگر دوست کا ظلم ایسا نہیں ہے۔ وہ تو امن ہے۔ کیونکہ دوست کی ہر بات عاشق کو بیحد پسند ہوا کرتی ہے)۔

دوسرے معنی۔ شعرا کا خیال ہے کہ جتنے ظلم انسان پر ہوا کرتے ہیں ان کا بانی آسمان ہوتا ہے۔ لہٰذا جب آسمان اور سب قسم کے ظلم ہم پر کر کے ہار چکا اور صرف ایک ستم ہم پر اس نے روا رکھا۔ یعنی بیداد دوست۔ تو یہ ہمارے لئے نوید امن ہے۔ یعنی آسمان کے اور ظلموں سے نجات پا کے ایک صورت اطمینان یہ پیدا ہوئی۔ کہ صرف دوست ہی کا ظلم اب ہم پر ہوگا۔ اور وہ ہمیں دل پسند ہے۔

(١٤٥٣) اگر دوست کی پلک میرے خون مراد خون دل کی پیاسی ہے تو میں کیا کروں۔ کیونکہ جو خون اس میں باقی رہ گیا ہے۔ وہ اس حصہ رسدی دینے کے لئے ہے جو میری خون بہانے والی یعنی خون کے آنسو بہانے والی پلکوں کے لئے بھی ضروری ہے۔ تاکہ وہ خون بہایا کریں۔ مراد یہ کہ اس کی پلکوں کا تصور گویا دل میں کانٹے چبھو رہا ہے۔ اور اس کا سلسلہ ختم ہی نہیں ہوتا۔ مجھے اس کو بند کر کے کچھ اپنے دل کی کیفیت کا بھی اظہار تو کرنا چاہئے۔ یعنی چشم خونفشاں ہو کے اپنے دل کی بھڑاس بھی نکال لینا ضروری ہے)

(١٤٥٤) خواجہ خضر کی نسبت مشہور ہے۔ کہ انھوں نے آبحیات پیا ہے۔ اور وہ تنہا جنگلوں میں پھرا کئے اور ہمیشہ تک زندہ رہیں گے۔

مثل شعر۔ اے حضرت خضر آپ کی یہ کیا زندگی ہے۔ کہ دنیا سے چور کی طرح منہ چھپائے پھرتے ہیں۔ اور یہ زندگی آپ کی ابدالآباد تک

اسی طرح گذر جائیگی. کہ کسی سے کبھی ملنے جلنے کے نہیں. مگر دیکھئے ۔ وہ زندہ ہم ہیں کہ تمام خلق اللہ سے ملتے جلتے ہیں ۔ اور حتی المقدور سب کے کام بھی آتے ہیں. (مراد یہ کہ ایک لمبی عمر سے فایدہ کیا ۔ اپنی تھوڑی سی ہی عمر میں مفید خلائق ہونا چاہیے)

(۵۵۔۱۴) تیری ادا یعنی تیرا انداز ایک جہان (مراد تمام اہل جہان) کے لئے بلائے جان ہے۔ اس کا مطلب یہ کہ سب لوگ تیرے عاشق ہیں۔ اور تیرے ناز سہہ رہے ہیں۔ (جس سے مجھے رشک آتا ہے۔) گویا اس آفت رشک میں جتلا ہو کے میں ہمیشہ بلا یعنی مصیبت ہی میں گرفتار رہا۔ کیونکہ لوگ تجھ پر عاشق ہونا نہیں چھوڑیں گے ۔ اور مجھ سے یہ رشک کبھی برداشت نہ ہو سکیگا ۔

(۵۶۔۱۴) دست درازی سے لوٹ مار یا غارت کرنا مراد ہے۔ مگر یہاں مصنف درازدستی لکھتا ہے ۔ اور اس کے لفظی معنی لیکر کہتا ہے. کہ اے فلک تو نے مجھ کو دوست سے الگ کرکے بہت دور ڈال رکھا ہے ۔ اور یہ امتحان کیا چاہتا ہے۔ کہ دیکھیں دوست کا دراز دست کہاں تک پہنچکر غارت گری کر سکتا ہے ۔ یعنی اُس کی درازدستی کا امتحان کر رہا ہے ۔ مگر کیا اس امتحان کے لئے بس ایک میں ہی رہ گیا ہوں ۔ خلاصہ مطلب یہ کہ مجھ کو اے آسمان دوست سے دُور نہ رکھ ۔ اور اپنے ظلم کچھ میرے ہی لئے مخصوص نہ کر دے ۔

(۵۷۔۱۴) میری کوشش کی مثال یہ ہے ۔ کہ جیسے کوئی قیدی جانور اپنے پنجرے ہی میں تنکے جمع کرکے اپنے گھونسلے کے بنانے کی فکر میں ہو یعنی ایک نکمی اور بیکار کوشش کر رہا ہو ۔ (مراد یہ کہ قید

عشق میں جو شخص اسیر ہو ۔ وہ اپنے آرام و آسایش کی کوشش پھر کیا کر سکتا ہے)

(۵۸۔۱۴) میں دوست کی دہلیز پر گیا ۔ اور وہاں جاکر بیٹھ گیا۔ دوست کا دربان مجھے فقیر جان کے چپ رہا ۔ لیکن میری شامت آئی. تو میں وہاں اُٹھ کے کھڑا ہو گیا ۔ اور اُٹھکر پاسبان یعنی دربان کے قدموں پر گر پڑا ۔ اس سے وہ بدظن ہو گیا ۔ کہ میں دوست کے گھر کے اندر داخل ہونے کی اجازت چاہتا ہوں ۔ یا وہ شک کرنے لگا ۔ کہ یہ بھی اسی دوست کا کوئی عاشق ہے ۔ لہذا مجھ پر ملامت کرنے لگا ۔ اور مار کے نکال دینے کو مستعد ہوا ۔

(۵۹۔۱۴) تنگنائے ۔ تنگ کوچہ یا بالکل تنگ جگہ

حل شعر ۔ غزل کی تنگنائے کا یہ ظرف یا حد وسعت میرے مزید شوق شعر گوئی کے انداز سے کم ہے ۔ یعنی بقدر شوق نہیں ہے ۔ لہذا میرے اس بیان کے لئے (جو اب بصورت مدح سرائی کرنیوالا ہوں ۔) کچھ اور وسعت چاہئے ۔ یعنی غزل کا انداز ترک کرکے اب قصیدے کی روش اختیار کرتا ہوں ۔

قطعہ بند

(۶۰۔۱۴) دنیا کا عیش دراصل (نواب) تجمل حسین خان (والی فرخ آباد) کے لئے بنایا گیا ہے ۔ مگر کچھ کچھ عام لوگوں کو بھی دیا گیا ہے تاکہ کسی کی نظر نہ لگ جائے ۔

(۶۱۔۱۴) اے اللہ میری زبان پر یہ کس کا نام آیا ۔ (مراد تجمل حسین خان

کا نام) کہ میری نطق یا قوت گویائی (بوجہ اشتیاق ممدوح) میری زبان کے بوسے لینے لگی۔ (حاصل شعر یہ کہ ممدوح کا نام سنتے ہی اس کی تعریف گویا میری زبان سے نکل پڑتی ہے)

(۱۴۷۲) وہ دولت و دین یعنی دنیا و دین کا نصیر (مددگار) اور قوم و ملک کا معین یعنی حامی ہے۔ یہ بلند آسمان اس کے لئے بنایا گیا ہے۔ کہ اس کی دہلیز ہی پہ پڑا رہے۔ (مطلب یہ کہ اُس کی شان اس قدر ارفع ہے۔)

(۱۴۷۳) زمانہ اس کے عہد میں محو آرایش ہے۔ یعنی کچھ نئے سامان کر رہا ہے۔ چنانچہ یہ ستارے بھی (جن سے کبھی کبھی کسی کی قسمت پلٹ جایا کرتی ہے۔) اب اور طرح کے بنائے جائیں گے۔ (تاکہ ان سے کسی کو اپنی بدقسمتی کا خدشہ باقی نہ رہے۔)

(۱۴۷۴) ممدوح کی تعریف لکھتے لکھتے ورق یعنی صفحہ کاغذ کا ختم ہو گیا۔ اور اس کی مدح ابھی باقی ہے۔ دراصل اس بحر کے کنار کے عبور کرنے کے لئے ایک کشتی چاہئے۔ مراد یہ کہ اُس کی تعریف لکھنے کو ایک دفتر چاہئے۔

(۱۴۷۵) ادائے خاص۔ یعنی یہاں غالب نے جو ایک خاص طرح کی نکتہ سرائی یا شعر گوئی شروع کی ہے۔ مثلاً غزل میں قصیدے کا راگ چھیڑ دیا ہے یہ ان شعرا احباب کے لئے جو کہ نکتہ شناس ہیں گویا ایک صلائے عام یا اذن عام کے ہے۔ یعنی اب سب کو اجازت ہے۔ کہ غزل میں قصیدہ گوئی کی طرز اختیار کریں۔ (صلا کے لغوی معنی دعوت ضیافت پر بلانا ہے۔)

متفرقات

نسخہ حمیدیہ دیوان غالب

جس میں مرزا کا مکمل اردو کلام طبع ہوا ہے۔ وہ جب تک بھوپال سے دریافت نہیں ہوا تھا بعض متفرق غزلیں اور اشعار جو ادھر اُدھر سے دستیاب ہوتے تھے۔ بعض نسخہ جات دیوان غالب کے ساتھ وہ بطور ضمیمہ شائع کئے جاتے تھے۔ چنانچہ کچھ ایسے اشعار نسخہ دیوان غالب مطبوعہ مطبع نولکشور میں بھی بطور ضمیمہ نظر آتے ہم انکو معہ شرح درج ذیل کرتے ہیں۔

(۱۴۷۶) فضائے خندۂ گل تنگ و ذوق عیش بے پروا
فراغت گاہ آغوش وداع دل پسند آیا

(۱۴۷۶) فضائے خندۂ گل۔ پھول کا کھلنا۔ یا بہار کا موسم۔ ذوق عیش بے پروا۔ لذت عیش ہماری طرف سے غافل ہے۔ یعنی ہمارے نصیب ہی میں نہیں ہے۔ آغوش وداع۔ جدا ہوتے وقت گلے ملنا۔

حل۔ چونکہ موسم بہار تنگ یعنی کم مدت رہتی ہے۔ اور عیش کرنا ہماری قسمت ہی میں نہیں ہے۔ لہذا دل سے وداع ہو کے جو فراغت ہمیں حاصل ہوئی وہ ہمیں پسند آتی ہے۔ کہ بہار کے جانے کا کھٹکا تو مٹ گیا

(۱۴۷۷) ہوئی جس کو بہار فرصت ہستی سے آگاہی
برنگ لالہ جام بادہ بر محمل پسند آیا

لالہ یعنی پوست کا پھول محمل کی صورت لئے ہوئے کچھ کھڑا

کھڑا دکھائی دیتا ہے۔ اس لئے کہتا ہے۔ جس شخص کو زندگی کی کم عرصہ رہنے والی بہار کا علم ہوگیا۔ (وہ سب کام عارضی طور پر کیا کرتا ہے۔ چنانچہ) وہ اپنے آپ کو اونٹ کے کجاوے پر سوار تصور کرکے جیسا کہ گل لالہ ہوا کرتا ہے۔ جام شراب نوش کرنا پسند کرتا ہے۔ اور یہ تکلف نہیں کیا چاہتا۔ کہ کہیں قیام کرکے عیش اڑائے۔

(۱۴۶۸) سواد چشم بسمل انتخاب نقطہ آرائی
خرام ناز بے پروائی قاتل پسند آیا

سواد چشم بسمل۔ مقتول کی آنکھ کی سیاہی یعنی پتلی جو بوجہ مرگ ایک غافل معشوق کی طرح بے پرواہانہ انداز میں پھر جایا کرتی ہے۔ انتخاب نقطہ آرائی۔ ایک کتاب میں کوئی مضمون پسند آئے۔ تو اس پر نشان کر دینا۔

حل۔ مقتول کی آنکھ کی پتلی کا بوقت مرگ معشوق بے پرواہ کی طرح پھر جانا اس لئے انتخاب نکتہ آرائی ہے۔ یعنی پسندیدہ ہے۔ کہ مقتول عاشق کو قاتل کے بے پرواہانہ انداز سے ناز کرنا پسند آگیا ہے۔ یہ شعر کچھ صحیح نہیں تھا۔ اس لئے مصنف نے اس کو اصلی نسخہ دیوان سے محذوف کرکے اس کے عوض مندرجہ ذیل شعر درج کر دیا تھا۔

(۱۴۶۹) روانی ہائے موج خون بسمل سے ٹپکتا ہے
کہ لطف بے تحاشا رفتن قاتل پسند آیا

حل۔ مقتول عاشق کے خون کی لہریں (جو بلا تامل) ٹپکتی ہیں۔ یعنی متواتر زور سے بہہ رہی ہیں۔ یہ اس لئے کہ عاشق مقتول اپنے قاتل کے بے تحاشا یعنی بلا روک ٹوک منہ اٹھائے ہوئے چلے جانے

کا لطف پسند کرتا ہے۔

(۱۴۷۰) اسد ہر جا سخن نے طرح باغ تازہ ڈالی ہے
مجھے رنگ بہار ایجادیٔ بیدل پسند آیا

غالب ابتدا میں بیدل کا مقلد تھا۔ اسی لئے کہتا ہے کہ اے اسد ہر جا یعنی ہر شعر میں سخن مراد۔ میری شاعری نے ایک نئے باغ کی بنیاد ڈالی ہے۔ کیونکہ مجھ کو بیدل کی بہار ایجاد کا رنگ ڈھنگ بہت پسند آیا ہے۔ یعنی وہ جدت طراز ہے۔ تو میں اس کا ویسا ہی مقلد ہوں۔

(۱۴۷۱) خور شبنم آشنا نہ ہوا ورنہ اے اسد
سرتا قدم گذارش ذوق سجود تھا

قاعدہ ہے کہ آفتاب چمکتا ہے۔ تو شبنم فنا ہو جاتی ہے۔ گویا دونوں میں کچھ آشتی نہیں ہے۔

حل۔ اس شعر میں خور (آفتاب) سے مراد معشوق ہے اور عاشق اپنے آپ کو شبنم فرض کرتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ وہ محبوب میرے ساتھ کچھ آشنائی نہیں کرتا۔ یعنی التفات ورنہ میں اسی طرح سرتاپا اپنے معشوق کے سامنے ذوق سجود یعنی سجدہ کرنے کے شوق کی گذارش ہوں۔ یعنی ایک صورت حال جیسے کہ آفتاب کے سامنے شبنم سر بسجود ہو کے فنا ہو جایا کرتی ہے۔

(۱۴۷۲) ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا پایا

حل۔ انسان کے پاؤں دو ہوتے ہیں۔ اس لئے اسکا پیر

بھی دو ہی ہوا کرتے ہیں۔ مگر یہاں پاؤں سے مراد تمنا کے پاؤں ہیں اور تمنا گویا انسان ہی کی طرح اس جہان سے دوسرے جہان کی طرف سفر کر رہی ہے۔ اب اس کے ایک پاؤں نے اس وشتِ امکان یعنی کل کائنات کو عبور کر لیا ہے۔ اور اسے معلوم ہو گیا۔ کہ یہ کیا چیز ہے۔ لہذا اب سوال یہ ہے کہ وہ دوسرا جہان کہاں ہے۔ کہ جس پر ہماری تمنا کا دوسرا قدم پڑ چکا ہے۔ (یعنی اس کی خواہش میں ہم گویا اس کو بھی عبور کر چکے ہیں۔) مراد یہ کہ دوسرے جہان کا حال معلوم کرنے کی خواہش ہے۔ کہ وہ ایک معما ہی سا معلوم ہوتا ہے۔ حالانکہ اس جہاں کا تو حال کھل چکا ہے۔

(۱۴۷۳) فکرِ نالہ میں گویا حلقہ ہوں ز سر تا پا
عضو عضو جوں زنجیر یک دل صدا پایا

زنجیر کو ہلاؤ تو اس میں سے جو آواز نکلتی ہے۔ وہ ایسی معلوم ہوتی ہے۔ کہ گویا سب کڑیاں زنجیر کی مل کر ایک ہی آواز پیدا کر رہی ہیں۔

حل۔ میں روتے وقت کچھ اس طرح کی صدا نکالتا ہوں۔ کہ گویا ایک ہی مجسم زنجیر ہوں۔ اور اس زنجیر کا عضو عضو یعنی تمام کڑیاں یک دل صدا یعنی باہم متفق ہو کے صدا کرتی نظر آتی ہیں۔

(۱۴۷۴) شب نظارہ پرور تھا خواب میں خیال اس کا
صبح موجۂ گل کو نقشِ بوریا پایا

یہاں اس سے مراد گلاب کے ایسا حسین و خوبصورت محبوب۔ نظارہ پرور۔ نظر میں خوب سمایا ہوا۔ موجۂ گل۔ قطار در قطار

پھول۔ حل۔ رات اس حسین دوست کا خواب آنکھوں میں سمایا ہوا تھا۔ صبح کو دیکھا تو قطار در قطار پھول ہمارے اس بوریا پر (جس پر ہم سوئے ہوئے تھے) بطور نشان نظر آتے تھے۔

(۱۴۷۵) کارخانے سے جنوں کے بھی میں عریاں نکلا
میری قسمت کا نہ ایک آدھ گریباں نکلا

حل۔ میں جنون کے کارخانے یعنی اس کے ساز و سامان کے لحاظ سے ننگا منگا ثابت ہوا۔ یعنی اس قدر محروم کہ میری قسمت میں ازل نے ایک آدھ گریبان بھی ودیعت نہیں رکھا۔ کہ جس کو میں اپنے جنون میں پھاڑ دوں۔

(۱۴۷۶) کچھ کھٹکتا تھا میرے سینے میں لیکن آخر
جس کو دل کہتے تھے سو تیر کا پیکاں نکلا

حل۔ میرے سینے میں کچھ چیز کھٹکتی تھی۔ آخر وہ نکل آئی یعنی وہ میرا دل تھا۔ جو اسقدر خلش کرتا تھا۔ کہ صد عدد تیروں کی بھال جسقدر خلش کرتی یا تکلیف دیا کرتی ہے

(۱۴۷۷) کسقدر خاک ہوا ہے دلِ مجنوں یارب
نقش ہر ذرہ سویدائے بیاباں نکلا

حل۔ مجنوں کا دل خاک ہو کے کس قدر مٹی میں مل گیا ہے۔ کہ دشت نجد کا ہر ذرۂ ریگ جو سیاہ سا ایک نشان دکھائی دیا کرتا ہے گویا وہ مجنوں ہی کے خاک شدہ دل کا ایک سویدا تھا۔ مراد مجنوں کی مٹی کس قدر پلید ہوئی ہے۔

(۱۴۷۸) شوخیٔ رنگ حنا خون وفا سے کب تک
آخر اے عہد شکن تو بھی پشیماں نکلا

اے عہد شکن یعنی بے وفا معشوق جو آنے کا اقرار کرکے نہیں آتا۔ اور یہ بہانہ کیا کرتا ہے۔ کہ پاؤں کو مہندی لگا رکھی ہے۔ آخر یہ عہد شکنی تیری تجھ کو پشیمان کرکے رہی۔ یعنی تو جو شوخیٔ رنگ حنا یعنی اپنے پاؤں کی اس مہندی کے لئے میرے خون وفا کا رنگ لیا کرتا تھا۔ آخر وہ مہندی کا رنگ مٹ گیا۔ جیسا کہ دستور ہے۔ کہ وہ ہمیشہ نہیں رہا کرتا۔ تو آخر کب تک کے لئے تو ایسی بہانہ بازی سے پشیمان نہ ہوتا۔ کیونکہ مہندی کا رنگ آخر زائل ہونا ہی تھا۔ اور تیرا فریب کھلنا ہی تھا۔

(۱۴۷۹) وسعت رحمت حق دیکھ کہ بخشا جاوے
مجھ سا کافر کہ جو ممنون معاصی نہ ہوا

شعرا کہا کرتے ہیں کہ خدا اگر چاہے تو گنہگاروں کو بھی اپنی رحمت سے بخشدیا کرتا ہے۔ کیونکہ وہ جس قدر کسی کو عاجز اور گناہوں میں پھنسا ہوا دیکھتا ہے۔ اُتنا ہی زیادہ رحم کیا کرتا ہے۔ لہذا کہتا ہے کہ خدا کی رحمت کی یہ وسعت دیکھ کہ اُس نے مجھ جیسے کافر کو بھی بخشدیا کہ جس نے اُن معاصی یعنی گناہوں کا احسان بھی نہیں مانا۔ کہ جو اُس کی بخشش کا باعث ہوئے۔ گویا یہ خیال تک بھی میں اپنے دل میں نہیں لایا۔ کہ میں عاصی و گنہگار ہوں۔ حالانکہ عوام اکثر اقرار معاصی کرکے برسوں اپنی مغفرت کے لئے دعائیں مانگا کرتے ہیں۔ اور پھر بھی ناکام رہتے ہیں۔

(۱۴۸۰) اصطلاحات اسیران تغافل مت پوچھ
جو گرہ آپ سے کھولی اُسے مشکل باندھا

حل۔ جو لوگ تغافل کے اسیر یعنی بے پرواہی کے خوگر ہیں۔ اُن کی اصطلاحات یعنی طرز تکلم کی بنسبت کیا پوچھتا ہے۔ وہ تو اگر کسی گرہ کو آپ کھول بھی چکے ہیں۔ تو آپ ہی اس کو بوجہ خوئے تغافل وفراموشی ایک گرہ بستہ یعنی ایک امر حل طلب ہی تصور کرتے رہیں گے۔ لاپرواہی اور تغافل کی یہ انتہا ہے۔ کہ خود ہی ایک مشکل حل کریں۔ اور پھر خود ہی خیال کریں۔ کہ وہ مشکل ابھی حل ہی نہیں ہوئی۔

(۱۴۸۱) مطرب دل نے مرے تار نفس سے غالب
ساز پُر رشتہ پئے نغمۂ بیدل باندھا

حل۔ غالب طرز بیدل کا شیدائی تھا۔ اسی نے کہتا ہے۔ کہ میرے گویے دل نے میری سانس کے تار سے ایک باجا جس میں بہت سے تاگے لگے ہیں۔ یعنی پر رشتہ سے باندھا ہے۔ اور اس باجا یا ساز سے نغمہ بیدل یعنی بیدل کے اشعار گایا چاہتا ہے۔

(۱۴۸۲) نہ بھولا اضطراب دم شماری انتظار اپنا
کہ آخر شیشۂ ساعت کے کام آیا غبار اپنا

شیشہ ساعت وہ شیشہ کا ایک آلہ ہوتا ہے۔ کہ ایک شیشہ ریت سے بھر کے کسی اور خالی شیشہ پر اوندھا کرکے لگا دیتے ہیں۔ اسی میں سے ریت کے ذرے آہستہ آہستہ گرکے اس خالی شیشے کو کسی خاص مدت میں جو معلوم ہوتی ہے۔ بھر دیتے ہیں۔ یہی شیشہ ساعت ہوتا ہے۔

حل - ہمارا انتظار وقت نزع کی دم شماری (سانس گننا) نہ بھولا۔ چنانچہ ہم مرگئے۔ تو ہمارا غبار شیشہ ساعت کے کام آیا۔

(۱۴۸۳) اسد کا قصہ طولانی ہے لیکن مختصر یہ ہے
کہ حسرت کش رہا عرض ستمہائے جدائی کا

اسد کا قصہ یا داستان عشق تو بہت لمبی ہے۔ مختصر یہ کہ وہ ہمیشہ جدائی کے دکھوں کو دوست کے آگے پیش کرنے ہی کی حسرت میں مبتلا رہا۔

(۱۴۸۴) اسد یہ عجز و بے سامانیٔ فرعون توام ہے
جسے تو بندگی کہتا ہے دعویٰ ہے خدائی کا

بندگی سے یہاں مراد وہ عبادت ہے۔ کہ جس کے بھروسے پر یہ خدائی دعویٰ کیا جاتا ہے۔ کہ جو شخص عبادت کرتا ہے۔ وہ ضرور بالضرور بخشا جائیگا۔ گویا یہ خدائی دعویٰ یا کامل اعتقاد انسان میں ایک فرعونیت پیدا کر دیتا ہے۔ لہذا شاعر کہتا ہے۔ کہ اے اسد تیرا یہ عجز یعنی اس قسم کی عبادت اور فرعون کی بے سامانی یعنی اُس کا خدا ہونے کا دعویٰ کرنا اور پھر اس کا زک کھانا یعنی بے سامان اور عاجز ہو کے خدا کے آگے بے حقیقت ثابت ہونا۔ یہ دونوں باتیں توام ہیں۔ یا ایک ہی ساتھ پرورش پاتی ہیں۔ لہذا تو اپنی عبادت پر مغرور ہے۔ اور اس بندگی یا عبادت کو گویا ایک خدائی دعوے اپنی مغفرت کا قرار دے رکھا ہے۔ ایسا ہی فرعون اپنے ساز و سامان اور دولت پہ گھمنڈ کرکے دعوے اپنے خدا ہونے کا کر بیٹھا تھا۔

تو ذلیل ہوا تھا۔ لہذا تو اس طرح کا کوئی خدائی دعویٰ نہ کر۔ اسی مضمون کا وہ شعر ہے (غالب) ؎

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

(۱۴۸۵) ہم نے وحشت کدہ بزم جہاں میں جوں شمع
شعلہ عشق کو اپنا سر و ساماں سمجھا

حل - جس طرح شمع کا سامان زندگی ایک شعلہ ہے کہ جلتا ہے اور زندگی گویا برقرار معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح ہم نے شعلہ یعنی عشق کی بدولت جو جلن دل کو حاصل ہوتی ہے۔ اس کو اس دنیا کے غم کدے میں اپنا سر و سامان سمجھ رکھا ہے۔

(۱۴۸۶) نہ پائی وسعت جولان یک جنوں ہم نے
عدم کو لے گئے دل میں غبار صحرا کا

ہم نے ایک جنون بھر کی جولان یا دشت نوردی کی وسعت کو حاصل نہ کیا۔ یعنی مجنوں ہو کے تا عرصۂ جنون صحرا نوردی نہ کر نے پائے تھے۔ کہ مرگئے۔ صحرا میں چلنے پھرنے کا غبار۔ مراد۔ اس کی حسرت دل ہی میں لے کے عدم کی راہ لی۔

(۱۴۸۷) مرا شمول ہر اک دل کے پیچ و تاب میں ہے
میں مدعا ہوں تپش نامۂ تمنا کا

تپش نامہ۔ رنج و بے تابی کی کتاب۔

حل - چونکہ میں تمنا یا آرزو کی رنج و بے تابی کی کتاب کا

مدعا یعنی حاصل حصول ہوں۔ لہذا ہر ایک دل کے پیچ و تاب میں (جو کہ بوجہ تمنا و آرزوئے دل ہوا کرتا ہے) میں ضرور شامل ہوتا ہوں۔

(۱۴۸۸) مجھے راہِ سخن میں خوفِ گمراہی نہیں غالبؔ
عصائے خضرِ صحرائے سخن ہے خامہ بیدل کا

اے غالب مجھ کو شعر گوئی کی راہ میں گمراہی کا اس لئے ڈر نہیں ہے کہ صحرائے سخن میں میرا عصائے خضر یعنی رہنمائی کرنے کو لاٹھی بیدل کا قلم ہے۔ مراد یہ کہ میں بیدل کا مقلد ہوں۔ لہذا شاعری میں کبھی میں بے راہ نہیں ہو سکتا۔

مؤلف - دراصل یہ بات خلافِ واقع ثابت ہوئی۔ کہ غالب ابتدا میں جتنا عرصہ بیدل کی تقلید کرتا رہا، عموماً مہمل کہتا رہا، چنانچہ اردوئے معلیٰ میں وہ خود معترف ہے۔ کہ اس روش کو جو گمراہی کی تھی۔ اُس نے مابعد ترک کر دیا۔ اور اسد کا تخلص چھوڑ کر غالب اختیار کر لیا۔ اور جو غزلیں بہ تخلص اسد مرتب کی تھیں۔ اُن کا اکثر حصہ اپنے مطبوعہ دیوان سے خارج کر دیا۔

(۱۴۸۹) بصورت تکلف بہ معنی تاسف
اسدؔ میں تبسم ہوں پژمردگاں کا

بصورت یعنی ظاہر میں تکلف اور بہ معنی یعنی در باطن تاسف اور افسوس کرنا۔ اے اسد یہ میرا شیوہ ہے۔ گویا میں ان پژمردگاں یعنی غمزدوں کا تبسم ہوں۔ کہ لب پہ تو محض ظاہر داری کے خیال سے ہنسی کرتے ہیں۔ اور دل میں رنج بھرا ہوا ہے۔

(۱۴۹۰) ضعفِ جنوں کو وقتِ تپش در بھی دور تھا
اک گھر میں مختصر سا بیاباں ضرور تھا

جنون سے جو کمزوری ہوئی اس کے اضطراب میں (یعنی وقت تپش) میں زمین سے ہل بھی نہیں سکتا تھا۔ لہذا مجھے گھر کے دروازے تک پہنچنا بھی دور نظر آتا تھا۔ یعنی مشکل معلوم ہوتا تھا۔ البتہ میرے گھر میں ایک چھوٹے سے بیابان کیسی کیفیت تھی۔ کہ بیابان میں کوئی در و دیوار نہیں ہوتا۔ لہذا ضعف کی حالت میں مجھے گھبرا کر گھر سے نکلنے اور اپنے دروازے تک پہنچنے ہی کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔

(۱۴۹۱) درسِ تپش ہے برق کو اب اس کے نام سے
وہ دل ہے یہ کہ جس کا تخلص صبور تھا

تخلص - ایک خاص نشان کہ جس سے کوئی پہچانا جائے۔ یعنی خصوصیت کہتا ہے۔ کہ میرا وہ دل کہ جس کی خصوصیت صبور یعنی صبر کرنا تھی۔ اب اسی دل کے نام کو سنکر بجلی کو گویا تڑپنے کا سبق حاصل ہوتا ہے۔ مراد یہ کہ پہلے صابر تھا۔ اب سخت بیقرار ہوں۔

(۱۴۹۲) شاید کہ مر گیا ترے رخسار دیکھکر
پیمانہ رات ماہ کا لبریزِ نور تھا

رات کو چاند کا پیمانہ نور سے لبریز ہو گیا تھا۔ یعنی وہ چودھویں کا چاند ہو کے پھر اس کا پیمانہ لبریز ہونے لگا تھا۔ یعنی آمادہ بہ زوال ہو گیا تھا۔ شاید یہ اس لئے کہ وہ تیرے رخسار دیکھکر اُن پر مر گیا۔ یعنی رشک سے مر گیا اور غروب ہونے لگا۔

(۱۴۹۲) شمع رو ئیوں کی سرِ انگشتِ حنائی دیکھکر
غنچۂ گل پر فشاں پروانہ آسا جل گیا

شمع کی طرح شعلہ رخسار معشوقوں کی مہندی رنگی انگلیوں کے سروں کو دیکھکر گلاب کا غنچہ اپنے پتے جھاڑ کے پروانے کی طرح جل کر مر گیا۔

(۱۴۹۳) جان دادگاں کا حوصلہ فرصت گداز ہے
یاں عرصۂ تپیدنِ بسمل نہیں رہا

جان قربان کرنے والوں کا حوصلہ اس قدر فرصت گداز یعنی مہلت کو فنا کر دینے والا ہے۔ کہ ایسے بسمل کو تڑپنے کا عرصہ یعنی تڑپنے تک کی بھی مہلت نہیں ملتی۔ مراد عاشق بسمل بعد قتل تڑپا نہیں کرتا۔

(۱۴۹۴) ہوں قطرہ زن بوادیٔ حسرت شبانہ روز
جز تار اشک جادۂ منزل نہیں رہا

حسرت کی وادی میں دن رات قطراتِ اشک گراتا رہتا ہوں۔ اب سوائے اشک کی تار کے اپنی منزل کی طرف جانے والی پگڈنڈی نہیں پاتا گویا شب و روز روتے ہی کا خیال بندھا ہے۔

(۱۴۹۵) اے آہ میری خاطرِ وابستہ کے سوا
دنیا میں کوئی عقدۂ مشکل نہیں رہا

عقدۂ مشکل۔ ایسی مشکل کہ پیچیدہ اور حل ہونے میں نہ آئے۔

حل۔ اے آہ۔ میرے وابستہ (نہ کھلے ہوئے) دل یعنی مشکلوں میں گھرے ہوئے دل کے سوا دنیا میں اور کوئی نہ حل ہونے والی پیچیدگی یا مشکل موجود نہیں ہے۔

(۱۴۹۶) بوئے یوسف مجھے گلزار سے آتی تھی اسد
دے نے برباد کیا پیرہنستاں میرا

یوسف مرزا غالب کا بھائی تھا۔ جس سے مرزا کو بہت محبت تھی۔ وہ دیوانہ ہو گیا تھا۔ اس نے کہتا ہے کہ مجھ کو یوسف کی بو باغ سے آ رہی تھی۔ جس کی حالت پر میں نے غم کھا کے اپنا گریبان چاک کر دیا ہے۔ اور یہ دے کا موسم ہے۔ یعنی سرما کے دن اور اس نے میرا پیرہنستان یعنی گریبان برباد کر دیا ہے۔ حالانکہ عشاق اپنا گریبان موسم بہار میں پھاڑا کرتے ہیں۔ مگر یہ ایک دوسرا معاملہ ہے۔ البتہ رنج دونوں حالتوں میں یکساں ہے۔

(۱۴۹۷) کل اسد کو ہم نے دیکھا گوشۂ میخانہ میں
دست بر سر، سر بزانو و دلِ مایوس تھا

کل ہم نے اسد کو شراب خانے کے ایک گوشے میں دیکھا تھا۔ اُس کا ہاتھ سر پر تھا۔ اور سر زانو پر اور دل مایوس ہو رہا تھا۔

(۱۴۹۸) رکھا غفلت نے دور افتادۂ راہِ فنا ورنہ
اشارت فہم کو ہر ناخنِ بریدہ ابرو تھا

ہر ناخن بریدہ۔ ہر ناخن جو انگلی سے کاٹ کر پھینک دیا جاتا ہے۔ ابرو تھا۔ اس سے مراد عبرت دلانے کے لئے۔ جیسے آنکھیں دکھاتے وقت بھوؤں کو تان دیتے ہیں۔

حل۔ مجھے صرف غفلت نے فنا کی راہ سے دور پڑا ہوا رہنے دیا۔ (ورنہ میں اگر غافل نہ ہوتا۔ تو اپنی فنا کا خیال رکھتا۔ اور اعمال نیک کی طرف توجہ کرتا۔) بلکہ جو شخص ایک اشارہ ہی سے بھانپ جانے والا ہو۔ اس کو

تو ایک کٹا ہوا ناخن بھی عبرت دلانے کو تنی ہوئی بھوؤں کا کام دیتا ہے۔ مراد یہ کہ مجھے اپنا کٹا ہوا ناخن بھی عبرت دلا سکتا تھا۔ مگر میں نے توجہ نہ کی۔

(۱۴۹۹) اسد خاکِ درِ میخانہ اب سر پر اڑاتا ہوں
گئے وہ دن کہ پانی جام سے کا تا بزانو تھا

اے اسد اب درِ میخانہ کی خاک سر پر ڈالتا ہوں۔ حالانکہ اس سے قبل پانی جام سے کا تا بزانو تھا۔ یعنی شراب کا دریا بہ رہا تھا۔ اور میں اس میں چلتا تھا۔ اور آب مے میرے زانو تک آتا تھا۔ مراد شراب اب نہیں ملتی اور میخانے کے ارد گرد اس لئے مارا پھرا کرتا ہوں۔

(۱۵۰۰) عشق میں ہم نے ہی ابرام سے پرہیز کیا
ورنہ جو چاہیے اسباب تمنا سب تھا

عشق میں مضبوطی کے ساتھ قایم رہنے یعنی ابرام سے ہم نے ہی پرہیز کیا۔ ورنہ اسباب تمنا یعنی عشق و ہوس میں جن چیزوں کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ وہ سب ہمیں حاصل تھیں۔ (ابرام استوری۔ یا استقلال سے کام لینا۔)

(۱۵۰۱) آخر کار گرفتارِ سرِ زلف ہوا
دلِ دیوانہ کہ وارستۂ ہر مذہب تھا

آخر کار میرا دیوانہ دل جو کہ ہر ایک مذہب سے وارستہ یعنی آزاد تھا۔ ایسا آزاد مشرب دل بھی سرِ زلف یعنی زلف کے شوق میں گرفتار ہوا۔ یعنی عاشق ہوگیا

(۱۵۰۲) شوق ساماں فضول ہے وگرنہ غالب
ہم میں سرمایۂ ایجادِ تمنا کب تھا

غالب ہمیں شوق ساماں فضول تھا۔ یعنی وہ باتیں جو نکمی ہیں اور جو درکار نہیں ہیں۔ ہم کو ان کا شوق ہے۔ ورنہ ہم میں سرمایۂ ایجاد تمنا۔ یعنی وہ چیزیں جن کی تمنا کی جاتی ہے۔ یا درکار ہوا کرتی ہیں۔ ان کی ایجاد یا پیدا کرنے کا سرمایہ یعنی ساز و ساماں ہی کب تھا۔ مراد یہ کہ کام کی چیزوں کا تو ساز و ساماں ہی موجود نہ تھا۔ پس نکمی باتوں میں ہم ہمیشہ مصروف رہے۔

(۱۵۰۳) دُود کو آج اس کے ماتم میں سیاہ پوشی ہوئی
وہ دلِ سوزاں کہ کل تک شمعِ ماتم خانہ تھا

میرا وہ دل کہ جلنے کے سبب کل تک میرے ماتم خانہ کی شمع یعنی رونق خانہ تھا۔ آج اس کے ماتم میں دھوئیں نے سیاہ لباس زیب بدن کیا۔ مراد یہ کہ وہ دل سوزاں بجھ گیا۔ اور بجھتے وقت اس کے دھوئیں نے اس پر سیاہ ماتمی لباس پہنایا گیا۔

(۱۵۰۴) دیکھ اس کے ساعدِ سیمیں و دستِ پرنگار
شاخِ گل جلتی تھی مثلِ شمع گل پروانہ تھا

اس کے چاندی کے جیسے بازو۔ اور پر زینت ہاتھوں کو دیکھکر پھولوں سے بھری ٹہنی بھی مثل شمع رشک سے جلتی تھی۔ اور پھول اس پر پروانہ کی طرح نثار تھا۔

(۱۵۰۵) اے اسد رویا جو دشتِ غم میں میں حیرت زدہ
آئینہ خانہ ہجومِ اشک سے ویرانہ تھا

آئینہ خانہ سے مراد یہاں دل ہے آئینہ کا گھر۔ یعنی دل۔ جو بوجہ حیرت کے آئینہ کی طرح نظر آیا کرتا ہے۔ کیونکہ آئینہ علامت حیرانی کی ہے

حل۔ اے اسد میں حیرت زدہ جب غم کے جنگل میں رویا۔ تو میرے دل کا آئینہ خانہ یعنی دل اشکوں کے ہجوم سے ویران ہو گیا۔

(۱۵۰۶) اے آبلہ کرم کو یاں بجھ اک قدم کر
اے نور چشم وحشت اے یادگار صحرا

اے پاؤں کے آبلے مجھ پر کرم کر اور میرے پاس آ۔ اے تو کہ وحشت کا نور چشم یعنی فرزند ہے۔ اور صحرا کی یادگار ہے۔ یعنی جنگل میں پھر کے آبلہ بطور یادگار حاصل ہوا کرتا ہے۔

(۱۵۰۷) دیوانگی اسد کی حسرت کش طرب ہے
در سر ہوائے گلشن در دل غبار صحرا کا

اسد کا جنونی پن خوشی کا حسرت کش ہے۔ یعنی اس کو یہ حسرت ہے کہ کبھی یہ خوش ہو۔ مگر نہیں۔ اس کے سر میں باغ کی خواہش بھری رہتی ہے اور اس کے دل میں صحرا کا غبار (یعنی یہ حسرت کہ جی بھر کے صحرا نوردی کرے) مگر یہ باتیں اسکو میسر نہیں آتیں۔

(۱۵۰۸) سیر آں سوئے تماشا ہے طلب گاروں کا
خضر مشتاق ہے اس دشت کے آواروں کا

یہاں تماشہ سے مراد تماشائے دہر

حل۔ دنیا کے تماشے سے اس طرف یعنی اس سے پار جاکر یعنی دنیا کو ترک کر کے اس سے ورا لورا ہم لوگوں کا جو خدا کے طالب کار ہیں۔ سیر ہو رہا ہے۔ ایک ایسے وقت کے آواروں کا رجحان ہے کہ ہم تارک الدنیا ہیں) خضر بھی مشتاق پایا جاتا ہے۔ مراد یہ کہ انکو خضر بھی قابل زیارت خیال کرتا ہے۔ کیونکہ وہ اسقدر متبرک ہوا کرتے ہیں۔

(۱۵۰۹) پھر وہ سوئے چمن آتا ہے خدا خیر کرے
رنگ اڑتا ہے گلستاں کے ہواداروں کا

ہوادار۔ خیرخواہ۔ بہی خواہ۔ یا طرفدار۔

حل۔ وہ محبوب پھر باغ کی سیر کرنے کو آرہا ہے۔ اس سے اُن لوگوں کا رنگ اُڑنے لگا ہے۔ کہ جو باغ کے طرفدار ہیں۔ کیونکہ محبوب کے ہوتے ہوئے جب کوئی باغ کے پھولوں وغیرہ کو نہیں پوچھیگا تو ان باغ کے طرفداروں کو نقصان پہنچے گا۔ اس لئے وہ ڈرتے ہیں۔

(۱۵۱۰) اسد اے ہرزہ درا نالہ بہ غوغا تا چند۔
حوصلہ تنگ نہ کر بے سبب آزاروں کا

اے اسد بے ہودہ بکنے والے تو شور مچا کے یوں کب تک رویا کریگا۔ اس کو روک۔ تاکہ تو اُن لوگوں کا حوصلہ پست نہ کر دے۔ جو کہ بلا سبب لوگوں کو ستایا کرتے ہیں۔

(۱۵۱۱) اسد ارباب فطرت قدرداں لفظی و معنی ہیں
سخن کا بندہ ہوں لیکن نہیں مشتاق تحسیں کا

ارباب فطرت۔ صاحب دانش۔

حل۔ اے اسد وہ لوگ جو صاحب دانش ہیں۔ وہ شعروں کے الفاظ اور ان کے معانی کے قدردان ہوا کرتے ہیں۔ میں سخن کا بندہ ہوں یعنی شعر کا فدائی ہوں۔ لیکن یہ بات نہیں چاہتا۔ کہ کوئی میری تعریف کرے۔ گویا ؎

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا

(۱۵۱۲) وردِ اسمِ حق سے دیدارِ صنم حاصل ہوا
رشتۂ تسبیح تارِ جادۂ منزل ہوا

حق سے مراد خدا ہے۔ وردِ اسمِ حق۔ یعنی خدا کے ایک نام حق کو یا حق کہہ کر تسبیح پھرا کے یاد کرنا۔ صنم سے یہاں مراد معشوقِ حقیقی یعنی خدا ہے۔ کہتا ہے۔ کہ یا حق یا حق تسبیح پرورد کرنے یعنی پڑھنے اور یاد کرنے سے گویا اس محبوبِ حقیقی کا دیدار حاصل ہو گیا۔ اور اس طرح تسبیح کا تاگا۔ منزلِ آخرت کی پگڈنڈی کا تار یا اس کا باریک نشانِ راہ بن گیا۔

(۱۵۱۳) محتسب سے تنگ ہے از بسکہ کارِ میکشاں
رز میں جو انگور نکلا عقدۂ مشکل ہوا

چونکہ میکشوں یعنی شراب پینے والوں کا کام محتسب یا کوتوال سے تنگ ہے۔ مراد۔ کوتوال کسی کو شراب اپنے گھر میں نکالکے پینے نہیں دیتا لہذا رز یعنی انگور کی بیل میں جو انگور لگا ہے۔ اور وہ گول گرہ کی طرح کا ہے۔ تو گویا وہ میکشوں کے لئے ایک عقدۂ مشکل ہے۔ یعنی مشکلوں کی گرہ۔ کہ وہ کوتوال کے ڈر سے ان انگور کی شراب کشید نہیں کر سکتے۔

(۱۵۱۴) عیب کا دریافت کرنا ہے ہنرمندی اسدؔ
نقص پر اپنے ہوا جو مطلع کامل ہوا

مطلع ۔ اطلاع دیا گیا۔ نحل۔ اپنے عیب کا معلوم کرنا اسے اسد ایک ہنرمندی ہے۔ لہذا جس شخص کو اپنے نقص یا عیب پر اطلاع دی گئی۔ یعنی جو کوئی اپنے عیب سے واقف ہو گیا۔ گویا وہ کامل انسان بن گیا۔

(۱۵۱۵) دل و جگر تپِ فرقت سے جل کے خاک ہوئے
وسلے ہنوز خیالِ وصال خام رہا

جدائی کی تپ سے دل و جگر جل کے خاک ہو گئے۔ یعنی مجھ کو سوزِ عشق کی بدولت اس قدر حسرت اور محرومی کے صدمے اٹھانے پڑے۔ پھر بھی میرے دل میں وصالِ دوست کا ایک خام یعنی ناممکن العمل خیال برابر قائم رہا۔

(۱۵۱۶) شکستِ رنگ کی لائی سحر شبِ سنبل
پہ زلفِ یار کا افسانہ ناتمام رہا

شکستِ رنگ۔ رنگ دور ہونا۔ یہاں مراد رات گذر کر اس کی سیاہی کا بوقتِ سحر زائل ہو جانا۔ شبِ سنبل۔ وہ سنبل یا پھول کہ صبح ہونے سے قبل زمین سے اُگے۔ یہ محاورہ (شبِ سنبل) ایک اسی طرح کا محاورہ ہے۔ جیسے فارسی میں شبِ گل کہتے ہیں۔ مثال ؎

خط نو بہار و خالِ تو رفت کوکبِ گل است
روئے تو صبحِ گلشن و زلفت شبِ گل است

حلِ شعر۔ رات گذر کر صبح نے شبِ سنبل کی کیفیت پیدا کر دی۔ یعنی پو پھٹی مگر اس دوست کی کہانی ابھی تک ختم نہیں ہوئی۔

(۱۵۱۷) دہانِ تنگ مجھے کس کا یاد آیا تھا
کہ شب خیال میں بوسوں کا اژدہام رہا

اژدہام بمعنی انبوہ یا بے شمار۔ کہتا ہے۔ کہ کس کا تنگ منہ مجھے یاد آیا تھا۔ کہ رات بھر مجھے بے شمار بوسوں ہی کا خیال رہا۔

(۱۵۱۸) نہ پوچھ حال شب و روز ہجر کا غالبؔ
خیال زلف و رخ دوست صبح و شام رہا

غالب ہجر کی رات اور دن کا کچھ حال نہ پوچھ۔ مجھے صبح و شام اس کی زلف اور رخسار ہی کا خیال لگا رہا۔ اس شعر میں روز و شب اور صبح و شام کو زلف و رخ سے مناسبت ہے۔

(۱۵۱۹) لگے گر سنگ سر پر یار کے دست نگاریں سے
بجائے زخم گل بر گوشۂ دستار ہو پیدا

اگر دوست کے ہاتھ سے میرے سر پر پتھر لگے۔ تو اس کے دست نگارین یعنی خوبصورت ہاتھ کی بدولت میرے سر میں اس پتھر سے کوئی زخم نہیں پیدا ہوسے گا۔ بلکہ میری پگڑی کے ایک طرف کوئی (خوبصورت) پھول پیدا ہو جائیگا۔

(۱۵۲۰) بہ سنگ شیشہ توڑوں ساقیا پیمانۂ پیماں
اگر ابر سیہ مست از سر کہسار ہو پیدا

پیماں بہ معنی اقرار کرنا۔ پیماں مراد شرابی کا توبہ کرکے یہ اقرار کرنا کہ پھر کبھی شراب نہیں پیوں گا۔

حل۔ اے ساقی اگر کالی گھٹا پہاڑ کے سرے پر سے نمودار ہو تو میں شیشہ کے پتھر سے اپنی توبہ کے اقرار کا پیمانہ (ناپ یا آلہ کی شکل) ابھی توڑ کر رکھ دوں۔

(۱۵۲۱) اسدؔ مایوس مت ہو گرچہ رونے میں اثر کم ہے
کہ غالب ہے کہ بعد از زاری بسیار ہو پیدا

اے اسد اگرچہ رونے میں اثر کم ہے۔ مگر اغلب ہے کہ بہت زیادہ

رونے سے کچھ اس میں ہو جاوے۔

(۱۵۲۲) شب کہ تھا نظارگی روئے بتاں کا اے اسدؔ
گر گیا بام فلک سے صبح طشت ماہتاب

نظارگی۔ دیکھنے والا۔ دیدار بازی کرنے والا۔

حل۔ چاند جو رات کو ان بتوں کے چہروں کو دیکھنے والا تھا۔ اے اسد۔ صبح کو اس کا طشت آسمان کی چھت پر سے گر گیا۔ مراد طشت از بام فتاد۔ جو ایک فارسی محاورہ ہے۔ اس کے معنی راز کا فاش ہو جاتا ہے۔ یعنی چاند رات کو تو حسینوں کے چہرے دیکھتا تھا۔ اور ان سے اپنا مقابلہ کرتا تھا۔ صبح ہوئی تو وہ ماند پڑ گیا۔ (جیسا کہ چاند کا دستور ہے۔) تو اس سے یہ راز کھلا۔ کہ چاند کا جوبن صرف رات بھر ہی کے لئے ہوتا ہے۔ بھلا یہ ان حسینوں کے چہروں کا کیا مقابلہ کر سکتا ہے۔ جو ہمیشہ نورانی ہیں۔

(۱۵۲۳) ہے بہاراں میں خزاں پرور خیال عندلیب
رنگ گل آتشکدہ ہے زیر بال عندلیب

رنگ گل۔ گلاب کے پھولوں کی سرخ رنگت جو آتشی نمود رکھتی ہے زیر بال۔ پروں کے نیچے۔

حل۔ بوقت موسم بہار بلبل کو پھول کی یاد اس قدر دکھ پہنچاتی ہے کہ زیادہ خزاں پرور ہے۔ یعنی اس کے لئے بہار نہیں۔ خزاں کی سی تکلیف کیفیت پیدا کر رہی ہے۔ لہذا پھول کی یہ آتشی رنگت گویا بلبل کے پروں کے نیچے ایک آتشکدہ ہے کہ جل رہا ہے۔ یعنی موسم بہار میں بھی بلبل کو چین حاصل نہیں ہے۔

دوسرے معنی۔ خزاں پرور خیال عندلیب سے یہ مراد لی جا سکتی ہے

کہ بلبل کے دل میں بہار میں بھی خزاں کا کھٹکا روز بروز بڑھ رہا ہے۔ لہٰذا
اس کے پروں کے نیچے جیسے ایک آتشکدہ جل رہا ہے اور اسے سخت تکلیف
موسم بہار میں پہنچ رہی ہے۔

(۱۵۲۴) عشق کو ہر رنگ شانِ حُسن ہے مدِ نظر
مصرعِ سرو چمن ہے حسبِ حالِ عندلیب

باغ میں سرو کا پودا خوبصورتی کے لئے لگاتے ہیں۔ کہ جس سے باغ
کی زیبائش بڑھ جاتی ہے۔ دوسرے سرو پہ قمری عاشق ہوتی ہے اسیطرح
بلبل بھی ایک خوبصورت جانور ہے۔ اور پھول پر عاشق ہے۔ تو گویا سرو اور
بلبل دونوں میں ایک طرح کی مناسبت ہے۔ اسی لئے کہتا ہے۔ کہ عشق کو
ہر طرح حسن کی شان (خوبصورتی) مدِ نظر ہے۔ چنانچہ سرو چمن جہاں ایک
مصرعہ ہے۔ کہ جس سے حسن و عشق کی شان ٹپکتی ہے۔ تو یہ بلبل کے حسب
حال ہے۔ کہ اس کی بھی یہی کیفیت ہے۔

(۱۵۲۵) جاتا ہوں جدھر سب کی اُٹھے ہے اُدھر انگشت
یکدست جہاں مجھ سے پھرا ہے مگر انگشت

یک دست۔ یکساں۔ متفقہ طور پر۔

حل۔ میں جدھر جاتا ہوں سب کی اُنگلی اُس طرف کو اٹھتی ہے
مجھ سے سارا جہان متفقہ طور پر پھر گیا ہے۔ مگر سب اہلِ جہان کی ایک
اُنگلی (جس کا اوپر بیان ہوا ہے) وہ میری طرف سے نہیں پھری۔ گویا مجھ کو
برابر وہ بدنام کرتی رہتی ہے۔

(۱۵۲۶) مژگاں کی محبت میں جو انگشت نما ہوں
لگتی ہے مجھے تیر کی مانند ہر انگشت

انگشت نما ہونا۔ وہ شخص کہ جس کی طرف سب کی اُنگلی اُٹھے۔ عمو[...]
کسی امر قبیح کے تعلق سے۔ مراد بدنام ہونا۔

حل۔ میں جو دوست کی پلکوں کی محبت میں بدنام ہوں۔ مجھے
ہر ایک اُنگلی جو میری طرف اُٹھتی ہے۔ تیر کی طرح محسوس ہوتی ہے۔

(۱۵۲۷) ہر غنچہ گل صورت یک قطرۂ خوں ہے
دیکھا جو کسی کا جو حنا بستہ سر انگشت

حنا بستہ سر انگشت۔ اُنگلی کی پور جس کو مہندی لگی ہو۔ اور و[...]
شوخ لال رنگت کی ہوا کرتی ہے۔

حل۔ میں نے جو کسی محبوب کی مہندی رنگی اُنگلی کی پور ... دیکھی[...]
تو میں خیال کرتا ہوں۔ کہ وہ ہر غنچہ گل ہے۔ کہ جس کی شکل ایک قطرہ خو[...]
کی طرح لال ہوا کرتی ہے۔

(۱۵۲۸) خون دل میں جو میرے نہیں باقی تو عجب کیا
جوں ماہی بے تاب تڑپتی ہے ہر انگشت

جبکہ میرے دل میں خون مطلق باقی نہیں رہا۔ تو عجب کیا میری ہر ایک
اُنگلی بے آب مچھلی کی طرح تڑپ رہی ہے۔ یعنی خون ہی جسم میں نہیں تو انگلیو[...]
کو کہاں سے پہنچیگا۔

(۱۵۲۹) دو عالم کی ہستی پہ خط وفا کھینچ
دل دوستِ اربابِ ہمت سلامت

اس شعر کی نثر یوں ہے۔ دل دوستِ ارباب ہمت دو عالم کی ہستی پ[...]
خط وفا کھینچ کہ سلامت رہیں۔ مراد یہ کہ ارباب ہمت یعنی بلند ارادہ[...]
اصحاب دونوں جہانوں میں اپنے ہاتھوں اور دل سے ایسے کام کرکے کہ[...]

جن سے وفا کا اظہار ہوتا ہو۔ ہمیشہ سلامت رہیں۔

قطعہ بند

(۱۵۳۰) وفور بلا ہے ہجوم وفا ہے
سلامت ملامت ۔ ملامت سلامت

(۱۵۳۱) نہ فکر سلامت نہ بیم ملامت
ز خود رفتگی ہائے حیرت سلامت

دوست کی محبت میں عاشق پر وفور بلا ہے۔ یعنی مصیبتوں کا ہجوم اس لئے اغیار طعن کرتے ہیں۔ جیسا کہ اُن کا دستور ہے۔ لہٰذا یہ ملامت یا طعن اغیار سلامت رہے۔ کیونکہ ترک عشق کبھی نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح عاشق کے دل میں وفاؤں کا ہجوم ہے۔ اور اس پر بھی اغیار اسے ملامت کرتے ہیں۔ تو یہ ملامت بھی سلامت رہے۔ کیونکہ ترک وفا نہیں کر سکتے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ نہ تو فکر سلامت ہے۔ کہ مصائب عشق ضرور قایم رہیں اور نہ کسی کی ملامت کا عاشق کو خوف ہے۔ کیونکہ وہ از خود رفتہ یعنی آپے ہی سے بے خبر ہے۔ اس کی تو یہ حیرت یا از خود رفتگی و بے خبری ہی سلامت رہے" اور بس۔

(۱۵۳۲) جبکہ نقش مدعا ہووے نہ جز موج سراب
وادیٔ حسرت میں پھر آشفتہ جولانی عبث

اس شعر کا مختصر مطلب یہ ہے۔ کہ جب کوئی امید ہی دل میں نہ ہو تو پھر حسرت کس بات کی؟

حل شعر۔ جبکہ دلی مدعا کا نقش یعنی اصلی مدعا بجز موج سراب کے کچھ نہ ہو۔ یعنی جیسے سراب محض خاک ہوتا ہے۔ ایسے ہی کوئی امید یا

حاصل نہ ہو۔ تو پھر حسرت وادی میں آشفتہ جولانی کرنا یعنی رنج و پریشانی اُٹھانا بالکل عبث ہے۔

(۱۵۳۳) دست برہم سودہ ہے مژگان خوابیدہ اسد
اے دل از کف دادۂ غفلت پشیمانی عبث

دست برہم سودن۔ فارسی محاورہ ہے۔ جس کا مطلب پشیمان ہونا ہے۔ دل از کف دادہ۔ مراد عاشق۔

حل۔ شاعر معشوق سے خطاب کرتا ہے۔ کہ اے محبوب تیری پلکیں ملی ہوئی ہیں۔ جس سے وہ آپس میں مل کر گویا دست برہم سودہ کی شکل بن گئی ہیں۔ یعنی افسوس کا اظہار کر رہی ہیں۔ مگر یہ کیا افسوس کرنا ہے۔ جبکہ تیری آنکھیں بند ہیں۔ لہٰذا اے دل از کف دادۂ غفلت۔ یعنی اے غفلت کے عاشق تیری اس طرح کی پشیمانی بے فائدہ ہے۔ ذرا آنکھ کھول اور عاشق کے حال پریشان پر نظر کر۔

(۱۵۳۴) ناخن دخل عزیزاں یک قلم ہے نقب زن
پاسبانیٔ طلسم گنج تنہائی عبث

یک قلم۔ بالکل۔ سراسر۔ حل۔ جب عزیزوں کی مداخلت کا ناخن سراسر نقب زن ہے۔ یعنی گنج تنہائی پر پھاپا ڈالتا ہے۔ تو پھر ایسی گنج تنہائی کے طلسم کی پاسبانی کرنا یعنی تنہائی کی نگہداشت بالکل فضول ہے

(۱۵۳۵) یک نگاہ گرم ہے۔ جوں شمع سرتا پا گداز
بہر از خود رفتگاں رنج خود آرائی عبث

اے محبوب جب تیری ایک گرم نگاہ یعنی تیز نظر ہی عاشق کو شمع کی طرح سر سے پاؤں تک جلا سکتی ہے۔ تو پھر خود آرائی یعنی اپنی زیبائش

کی زحمت اُٹھاتا تاکہ اس زیبایش سے تیرے زیور اسے تجھ پر فدا ہوں۔ بالکل عبث ہے۔

(۱۵۳۶) قیس بھاگا شہر سے شرمندہ ہوکر اے اسد
بن گیا تقلید سے میری یہ سودائی عبث

اے اسد مجنوں نے میری تقلید کی۔ مگر کامیاب نہ ہوا۔ تو شرم کھا کے شہر ہی سے بھاگ گیا۔ لہذا وہ میری نقل کرکے بے فائدہ مجنوں یعنی سودائی بنا تھا۔

(۱۵۳۷) اے اسد بیجا ہے نازِ سجدۂ عرضِ نیاز
عالمِ تسلیم میں یہ دعویٰ آرائی عبث

اے اسد نیازمندی یعنی بندگی کے لئے سجدہ عرض کرنا یعنی خدا کے آگے عاجزی سے سربسجود ہونا۔ اور پھر اپنی اس عبادت پر غرور کرنا۔ بالکل غیر مناسب ہے۔ کیونکہ انسان ایک عالم تسلیم میں ہے۔ یعنی خدا کے آگے سر نیاز جھکائے ہوئے۔ اور عاجز ہستی ہے۔ اس لئے یہ اپنے کسی دعویٰ کا گھمنڈ کرے تو عبث ہے۔ کیونکہ خدا جو چاہے کر سکتا ہے۔ اس کے آگے ہماری کوئی بندگی یا ہمارا کوئی دعویٰ ہی کیا۔

(۱۵۳۸) خمارِ منتِ ساقی اگر یہی ہے اسد
دلِ گداختہ کے میکدے میں ساغر کھینچ

اے اسد اگر ساقی کے احسان کا نشہ تجھ کو ایسا ہی چڑھ جاتا ہے۔ تو اپنے دل گداختہ یعنی اپنے متاثر دل کے میکدے میں جام شراب پی۔ یعنی دل ہی دل میں محو احسان ہستائی رہا کر۔

(۱۵۳۹) کس بات پہ مغرور ہے اے عجزِ تمنا
سامانِ دعا وحشت و تاثیرِ دعا ہیچ

جبکہ خدا کے نزدیک ہماری دعا کا ساز و سامان یعنی ایک ایسا وسیلہ مغفرت وحشت میں داخل ہے۔ اور ہماری دعا میں کچھ تاثیر نہیں ہے۔ تو اے عجز تمنا یعنی ہماری ناکام دعا اور تمنائے مغفرت اب تو کس بات کا غرور کرتی ہے۔ مراد یہ کہ عبادت پر غرور نہ کر کہ اس کا خدا پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ ہاں وہ خود ہی چاہے تو بخشدے۔

(۱۵۴۰) آہنگ اسد میں نہیں جز نغمۂ بیدل
عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

آہنگ۔ انداز نغمہ۔ غالب پہلے بیدل کا مقلد تھا۔ اسی لئے کہتا ہے کہ اسد کے انداز نغمہ یعنی طرز شاعری میں بیدل کے نغمہ یا طرز شعرگوئی کے سوا اور کوئی خوبی نہیں ہے۔ تاہم ساری دنیا ہمارا ہی افسانہ سناتی ہے۔ یعنی ہماری تعریف کرتی ہے۔ اور ہم دراصل کچھ بھی نہیں ہیں۔

(۱۵۴۱) زندگانی نہیں بیش از نفس چند اسد
غفلت آرائی یاراں پہ ہیں خنداں گل و صبح

اے اسد زندگی چند سانسوں سے زیادہ نہیں ہے۔ مگر سب دوست اس کی طرف سے غافل ہیں۔ اور ان کی اس غفلت پروری پر صبح اور پھول دونوں ہنستے ہیں۔ یعنی پھول تو چند روز کے بعد مرجھا جاتا ہے۔ اور صبح صرف تھوڑا عرصہ قایم رہتی ہے۔ پھر معدوم ہو جاتی ہے۔ اسیطرح انسان کی زندگی محض چند روزہ ہے۔ تو اس امر واقعہ سے انسان غافل کیوں رہے۔

(۱۵۴۲) تھا میں گلدستۂ احباب کی بندش کی گیا
منتفرق ہوئے میرے رفقا میرے بعد

میں جب تک زندہ تھا میں دوستوں کے گلدستہ کے پھول مجتمع رکھنے کی گویا گھانس تھا۔ (فی الواقعہ غالب کے دوست آشنا بہ تعداد کثیر تھے) ہذا جب میں نہ رہا تو میرے دوست بھی سب کے سب بکھر گئے۔

(۱۵۴۳) ہاتھ آیا زخم تیغ یار سا پہلو نشیں
کیوں نہ ہووے آج کے دن بیکسی کی روح شاد

بیکسی وہ حالت ہوا کرتی ہے۔ کہ جب کسی کا کوئی ساتھ دینے والا نہ ہو۔

حل شعر۔ جب مجھ کو دوست کی تلوار کے زخم جیسا پہلو نشین یعنی ایک ساتھی ہاتھ آگیا ہے۔ تو پھر آج میری بیکسی کی روح کس لئے خوشی نہ منائے۔ کہ زخم تیغ رفیق بنا ہے۔

(۱۵۴۴) ہم نے زخم جگر پر بھی زبان پیدا نہ کی
گل ہوا ہے ایک زخم سینہ پر خواہان داد

گل یعنی گلاب کا پھول عموماً بہت سرخ ہوتا ہے۔ اور ایسے ہی وہ زخم ہوتے ہیں۔ کہ جن سے لہو بہتا ہو۔ اس لئے ان دونوں کی مناسبت پر کہتا ہے۔ کہ پھول تو صرف ایک ہی زخم اپنے سینہ پہ کھا کر انصاف کا خواہاں ہوا ہے۔ (عموماً پھولوں کے وسط میں ایک داغ سیاہ۔ سفید یا لال رنگ کا ہوا کرتا ہے۔ یہ اس کی طرف اشارہ ہے۔) لہذا۔ وہ ہم سے کیا مقابلہ کر سکتا ہے۔ جبکہ ہم اپنے جگر پر سینکڑوں زخم کھا چکے ہیں۔ اور صبر سے اُف تک نہیں کرتے۔

(۱۵۴۵) تیغ در کف کف بلب آتا ہے قاتل اس طرف
مژدہ باد اے آرزوئے مرگِ غالب مژدہ باد

تیغ در کف۔ ہاتھ میں تلوار۔ کف بلب۔ ہونٹوں پر کف۔ یعنی غصہ سے جھاگ منہ میں پیدا ہوتا۔

حل۔ قاتل ہاتھ میں تلوار لئے اور منہ میں جھاگ چھوڑتا ہوا ادھر آرہا ہے۔ اے مرگ غالب کی خواہش تجھ کو بہت بہت مبارک اور خوشخبری ہو۔ کہ اب غالب کا قتل ہوا ہی چاہتا ہے۔ کیونکہ قاتل تیغ در کف ہے

(۱۵۴۶) تو پست فطرت اور خیال بسا بلند
اے طفل خود معاملہ قد سے عصا بلند

طفل خود معاملہ۔ ایسا خود سر بچہ جو دوسروں سے کچھ مشورہ وصلاح نہ لے۔

حل شعر۔ اے خود سر بچے تیری فطرت یعنی پیدائشی خواص تو پست ہیں۔ اور تو خیالات بہت بلند رکھتا ہے۔ یہ ایسا ہے جیسے کہ کوئی شخص اپنے قد سے بھی زیادہ لمبا سونٹا اپنے ہاتھ میں رکھے۔ جو کچھ موزوں نظر نہیں آتا۔

(۱۵۴۷) موقوف کیجئے یہ تکلف نگاریاں
ہوتا ہے ورنہ شعلۂ رنگِ حنا بلند

دوست سے کہتا ہے۔ کہ یہ تکلف کا نگارش کرنا یعنی اور زیادہ اس کا رنگ شوخ کرنا یعنی اس کو ترقی دینا چھوڑ دیجئے۔ ورنہ رنگ حنا (جس کو تم بہ تکلف اس قدر زیادہ شوخ کر رہے ہو یہ) مزید ترقی کر کے ایک شعلے کی طرح (جو سرخی مائل مثل حنا ہوا کرتا ہے۔) بلند ہو جائیگا۔ یا بھڑک اُٹھے گا۔ اور

خم کو جلا دیگا۔

(۱۵۴۸) ہزار آفت و یک جانِ بے نوائے اسد
خدا کے واسطے اے شاہِ بیکساں فریاد

ہزار آفتیں نازل ہوئیں۔ اور فقط ایک بے نوا یعنی بے سر و سامان جان اسد کی ہے۔ لہذا اے بیکسوں کے بادشاہ (مراد آنحضرتؐ یا حضرت علی کرم اللہ وجہہ) خدا کے لئے تم میری فریاد کو پہنچو۔

(۱۵۴۹) لکھی یاروں کی بدمستی نے میخانہ کی پامالی
ہوئی قطرہ فشانی ہائے مے بارانِ سنگ آخر

دوستوں کی بدمستی نے شراب خانے کی تقدیر میں اس کا پامال ہونا لکھا تھا۔ لہذا ان دوستوں نے مستی میں بھر کر جب میخانے کے خم توڑے اور شراب کو بہا دیا۔ تو یہ قطرہ افشانی یعنی شراب کا قطرہ قطرہ تک بہہ جانا۔ آخرکار ایک پتھروں کی بارش ثابت ہوئی۔ کیونکہ اس سے میخانہ بالکل برباد ہو گیا۔

(۱۵۵۰) دیا یاروں نے بیہوشی میں درماں کا فریب آخر
ہوا سکتے سے میں آئینہ دستِ طبیب آخر

آخر دوستوں نے مجھ کو بے ہوش کر کے درماں یعنی علاج کا یوں فریب دیا۔ مراد یہ کہ مجھے اس طرح فریب دے کے بتایا کہ تیرا علاج ہو رہا ہے (کیونکہ بعض امراض میں مریض کو قصداً بے ہوش بھی کیا جاتا ہے) لہذا میں آخرکار یعنی جب اور کوئی علاج موثر نہ ہوا تو اس سکتے یا بے ہوشی کے عالم میں طبیب ہی کا آئینہ دست بن گیا۔ یعنی میں بوجہ حیرت و بے خبری آئینہ بنا۔ اور میرا طبیب اس آئینہ کو دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔

یا مطلب یہ کہ میں آئینہ دست طبیب اس طرح ہوا۔ کہ اس کا تختۂ مشق بن چکا تھا۔

(۱۵۵۱) غرورِ ضبط وقتِ نزع ٹوٹا بے قرارانہ
نیاز بال افشانی ہوا صبر و شکیب آخر

وقت نزع جب میں خود بخود تڑپنے لگا۔ اور زیادہ ضبط نہ کر سکا۔ تو اس طرح بے قرارانہ حالت میں میرا وہ ضبط غرور یعنی ضبط ہونے کا دعوی ٹوٹ گیا۔ اور جو صبر و شکیب مجھ میں تھا۔ وہ (وقت نزع) جب تڑپ کر مجھ پر افشانی کی تھی۔ یعنی مجھ پہ چھڑکے گئے تھے۔ انہی پروں پہ میرا وہ صبر و شکیب بھی قربان ہو گیا۔ مراد یہ کہ سخت مصیبت میں انسان کا صبر جاتا رہتا ہے۔

(۱۵۵۲) اسد کی طرح میری بھی بغیر از صبح رخساراں
ہوئی شام جوانی اے دلِ حسرت نصیب آخر

صبح رخسار۔ مراد ایک خوبصورت محبوب۔

حلِ شعر۔ اے دل حسرت نصیب۔ اسد کی طرح کسی خوبصورت محبوب کے بغیر میری شام جوانی بھی آخر تمام ہو گئی۔ (اس شعر میں صبح رخسار اور شام جوانی کے الفاظ سے صبح و شام کا تقابل کیا ہے۔ اور یہی بنائے شعر ہے۔)

(۱۵۵۳) ظلم کرنا گدائے عاشق پر
نہیں شاہانِ حسن کا دستور

فقیر یا عاجز عاشق پر کچھ ظلم کرنا۔ شاہانِ حسن یعنی محبوبوں کا دستور نہیں ہے۔ (یہاں گدا اور شاہ کی مناسبت کا اظہار کیا گیا ہے)

(۱۵۵۴) دوستو مجھ ستم رسیدہ سے
دشمنی ہے وصال کا مذکور

اے دوستو۔ مجھ جیسے ظلم رسیدہ شخص سے جو کسی کا وصال نہ ہونے سے رنج میں ہے۔ وصال محبوب کا ذکر کرنا گویا مجھے ستانا۔ اور میرے ساتھ دشمنی کرنا ہے۔

(۱۵۵۵) زندگانی پہ اعتماد غلط
ہے کہاں قیصر اور کہاں فغفور

زندگی پر بھروسہ کرنا غلطی کرنا ہے۔ بھلا اب قیصر روم اور بادشاہ چین یعنی فغفور کہاں ہے۔

(۱۵۵۶) کیجے جوں اشک اور قطرہ زنی
اے اسدؔ ہے ہنوز دلی دُور

جس طرح آنسو قطرے قطرے گرا کرتے ہیں۔ آپ اور آنسو بہائیے یعنی کچھ عرصہ اور مبتلائے رنج رہیے۔ اس لئے کہ ابھی دلی دور ہے۔ یعنی آپ کی تمنا اتنی جلدی پوری ہونے والی نہیں ہے۔

(۱۵۵۷) مدعی میرے صفائے دل سے ہوتا ہے خجل
ہے تماشہ زشت رویوں کا عتاب آئینہ پر

مدعی یا رقیب میرے صاف و شفاف آئینہ جیسے دل کی بدولت جب مجھ سے کوئی سچی بات سن پاتا ہے۔ تو شرمندہ ہو جاتا ہے۔ لیکن تماشہ ہے۔ یعنی تعجب ہے۔ کہ بد صورت لوگ (اپنی صورت کو تو کچھ نہیں کہتے۔ اور جب) آئینہ میں اپنی کریہہ شکل دیکھ پاتے ہیں۔ تو آئینہ پر خفا ہونے لگتے ہیں۔ حالانکہ اس کا کیا قصور۔ اسی طرح میرا کیا قصور اگر میں صاف دل ہوں اور وہ مجھ سے خجل ہے۔

(۱۵۵۸) دل کو توڑا جوشِ بیتابی سے غالبؔ کیا کیا
رکھ دیا پہلو بوقت اضطراب آئینہ پر

یہاں آئینہ سے مراد آئینہ دل ہے۔ اور بوقت اضطراب پہلو رکھا کے یہ معنی ہیں۔ کہ گھبراہٹ میں ادھر اُدھر پہلو بدلے۔

حل شعر۔ اے غالب تو نے اضطراب کی حالت میں پہلو بدلا۔ اور اس سے یعنی جوش بیتابی یا سخت گھبراہٹ کی حالت میں تیرا آئینہ دل تیرے پہلو کے تلے آ کے ٹوٹ گیا۔ یہ تو نے کیا کیا۔ کہ اپنے دل ہی کو توڑ دیا۔ مطلب یہ کہ سخت اضطراب کی حالت میں بھی صبر کرنا تھا۔ اور پہلو کو نہیں بدلنا چاہیے تھا۔

(۱۵۵۹) اے چرخ خاک بر سر تعمیر کائنات
لیکن بنائے عہد وفا استوار تر

اے آسمان تعمیر کائنات یعنی تمام موجودات کے سر پر خاک۔ مطلب یہ کائنات کی بنا جب فنا پر ہے۔ تو اس کے سر پر خاک ڈالو۔ مگر عہد وفا یعنی وفا کا اقرار ایسا نہیں ہے۔ اس کی بنیاد استوار تر یعنی بہت مضبوط ہو۔ یہ کائنات سے بہتر ہے۔ لہٰذا اس کو چھوڑ اور اُس کو اختیار کر۔

(۱۵۶۰) ہجوم فکر سے دل مثل موج لرزے ہے
کہ شیشہ نازک و صہبائے آبگینہ گداز

غم کی کثرت کی وجہ سے میرا دل ایک لہر کی طرح کانپتا ہے۔ کیونکہ شیشہ تو نازک ہے۔ اور اُس میں شیشہ کو پگھلا دینے والی شراب بھر رکھی ہے۔ مراد یہ کہ میرا دل تو سخت کمزور ہے۔ اور اس میں دل کو گداز کر دینے والا غم بکثرت بھر دیا گیا ہے۔

(۱۵۶۱) گل کھلے غنچے چٹکنے لگے اور صبح ہوئی
سرخوشِ خواب ہے وہ نرگسِ مخمور ہنوز

پھول کھل چکے۔ کلیاں بھی کھل گئیں۔ اور سویرا ہو گیا۔ مگر ابھی تک وہ نرگس مخمور یعنی دوست کی نشیلی آنکھ سرخوش خواب ہے۔ یعنے خواب میں مست ہے۔ سرخوش بہ معنی مست یا غافل

(۱۵۶۲) اے اسد تیرگیِ بختِ سیاہ ظاہر ہے
نظر آتی نہیں صبحِ شبِ دیجور ہنوز

یہاں شب دیجور سے مراد ہجر کی کالی رات ہے۔

حل۔ اے اسد میری سیاہ بختی کی تیرگی یعنی سیاہی اسی بات سے ظاہر ہے۔ کہ میری ہجر کی کالی رات، صبح ہوتے دکھائی نہیں دیتی۔

(۱۵۶۳) اے اسد ہم خود اسیرِ رنگ و بوئے باغ ہیں
ظاہر: صیاد نادان ہے گرفتارِ ہوس

اس شعر میں شاعر یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ کہ ہر شخص کسی نہ کسی کے عشق میں گرفتار ہے۔ چنانچہ کہتا ہے۔ اے اسد ہم خود رنگ و بوئے باغ کے قیدی ہیں۔ حالانکہ ظاہرا ہم صیاد کو الزام دیتے ہیں۔ کہ وہ نادان جانور ول کو گرفتار کرنے کی ہوس میں مبتلا ہے۔ حاصل مطلب یہ کہ سب ہی مبتلائے عشق و ہوس ہیں۔

(۱۵۶۴) شمع ہے ہے بزمِ انگشتِ تحیر در دہن
شعلۂ آوازِ خوباں پر بہ ہنگامِ سماع

شعلۂ آواز۔ ایک فارسی محاورہ ہے۔ جس کا مفہوم وہ پُرسوز آواز کہ جس کا ہر شخص کے دل پر اثر ہو۔

حل شعر۔ سماع کے وقت یعنی جبکہ راگ رنگ ہو رہا ہو۔ محبوبوں کی پُرسوز و مثاثر آواز سے تمام محفل سماع انگشت بہ تحیر در دہن ہے۔ یعنی حیرت کی انگلی اپنے دانتوں میں لئے ہے۔ اور وہ انگلی اس کی شمع یا موم بتی ہے۔ کہ مثل انگشت کے ہوا کرتی ہے۔ گویا ایک شمع محفل ہی نہیں۔ بلکہ ایک انگشت حیرت ہے۔ کہ جس کے ذریعہ اہل محفل اپنی اس حیرت کا جو شعلہ آواز خوباں سے پیدا ہوتی ہے۔ اظہار کرتے ہیں۔

(۱۵۶۵) چارسوئے دہر میں بازارِ غفلت گرم ہے
عقل کے نقصان سے اٹھتا ہے خیالِ انتفاع

چار سوئے دہر۔ یعنی دنیا میں ہر طرف غفلت کا بازار گرم ہے۔ (یہاں وہی اچھا ہے جو اوروں کی طرح غافل رہے۔) لہذا۔ عقل سے نقصان یعنی عوام کی طرح غفلت شعار ہو جانے ہی سے انتفاع یعنی نفع حاصل کرنے کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ اسی مضمون کے تعلق سے شیخ سعدی بھی گلستاں میں ایک جگہ لکھتا ہے کہ کوئی لڑکا اپنے باپ سے شکایت کر رہا تھا۔ کہ ابا دیکھو یہ سب اہل مجلس علی الصبح سو رہے ہیں۔ اور نماز نہیں پڑھتے۔ باپ نے جواب دیا کہ بیٹا بہتر ہوتا۔ کہ تو بھی انہی کی طرح غافل سویا ہوتا۔ اور کسی کی شکایت نہ کرتا۔ گویا عوام کی تقلید بہتر ین مصلحت ہے۔

(۱۵۶۶) آشنا غالبؔ نہیں ہیں دردِ دل کے آشنا
ورنہ کس کو میرے افسانے کی تابِ سماع

اے غالبؔ دوست سب ہمارے دردِ دل کے آشنا یعنی سچے درد خواہ نہیں ہیں۔ اس لئے یہاں کون ہے۔ کہ جس کو ہمارے دردناک افسانہ سننے کی تاب ہو۔

(۱۵۶۷) وقت خیال جلوۂ حسن بتاں اسد
دکھلائے ہے مجھے دو جہاں لالہ زار داغ

وقت خیال یعنی حسینوں کی یاد کے وقت ان بتوں کے حسن کا جلوہ مجھے دو جہان یعنی اس جہان اور اگلے جہان دونوں میں لالہ زار داغ دکھاتا ہے۔ مراد یہ کہ ایسی یاد سے مجھے ہر ایک جہان میں داغ دل۔ یا محرومی و بدنصیبی ہی حاصل ہوتی ہے۔

(۱۵۶۸) تھے میرے ہی جلانے کو اے آہ شعلہ ریز
گھر پر پڑا نہ غیر کے کوئی شرار حیف

کوئی شرارہ رقیب کے گھر پر نہ پڑا۔ تاکہ اس کو جلا دیتا۔ اس لئے کہ وہ سب شرارے اے آہ میرے ہی جلانے کے لئے شعلہ ریز تھے۔ یعنی جلتے تھے۔

(۱۵۶۹) گل چہرہ ہے کسی خفقانی مزاج کا
گھبرا رہی ہے بیم خزاں سے بہار حیف

خفقانی اُس چڑچڑی مزاج کے دیوانے کو کہا کرتے ہیں۔ کہ ایک ذرا سا جوش اُس میں پیدا ہو تو اس کا منہ سرخ ہو جاتا ہے۔ اور پھر تھوڑی دیر کے بعد زرد رنگت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح بہار بھی پہلے سُرخ نما ہوا کرتی ہے۔ اور وقت خزاں زرد رو۔ لہذا کہتا ہے کہ یہ افسوس ہے جو بہار خزاں کے خوف سے گھبرا رہی ہے۔ تو یہ گویا کسی خفقانی مزاج کے آدمی کا چہرہ ہے۔ کہ پہلے سرخ سُرخ اور پھر زرد زرد ہوا کرتا ہے۔

(۱۵۷۰) ہیں میری مشت خاک سے اسکو کدورتیں
پائی جگہ بھی دل میں تو ہو کر غبار حیف

مگر میری مٹی سے بھی اس کو کدورت ہے۔ اور وہ میری طرف سے اپنے دل میں غبار رکھتا ہے۔ لہذا میں نے اس کے دل میں جگہ پائی۔ تو کس طرح ؟ یعنی غبار کی صورت۔

(۱۵۷۱) "تا قیامت شب فرقت میں گذر جائے گی عمر
سات دن ہم پہ بھاری ہیں سحر ہونے تک

ہماری عمر تو روز قیامت تک شب ہجر ہی میں گزر جائیگی۔ گویا ہم پر بھی سحر یعنی قیامت کی صبح ہونے تک وہ تکلیف کا عالم طاری رہیگا۔ کہ جیسے مردے پر قبر میں سات دن بھاری ہوا کرتے ہیں۔

(۱۵۷۲) آتے ہیں پارہ ہائے جگر درمیان اشک
لایا ہے لعل بیش بہا کاروان اشک

جگر کے ٹکڑے بھی آنسوؤں کے ساتھ نکل آتے ہیں۔ گویا ہمارے اشک کا قافلہ بہت قیمتی لعل اپنے ہمراہ لایا ہے۔

(۱۵۷۳) اے آرزو شہید وفا خونبہا نہ مانگ
جز بہر دست و بازوئے قاتل دعا نہ مانگ

اے میرے دل کی آرزو جو کہ وفا پر مرمٹی ہے۔ تو میرے قتل کا خونبہا نہ مانگ۔ بلکہ اگر دعا بھی مانگے۔ تو قاتل کے ہاتھ اور بازوؤں کی سلامتی کے سوا اور کوئی دعا نہ مانگ۔ (اور یہ دعا بھی اس لئے مانگنی چاہئے۔ کہ معشوق قاتل کے پُر زور دست و بازو سلامت رہیں گے تو وہ عاشق کو قتل کر سکیگا)

(۱۵۷۴) نور سے تیرے ہے اُس کو روشنی
ورنہ ہے خورشید یک دست سوال

سورج کو تیرے ہی نور سے روشنی پہنچتی ہے۔ ورنہ وہ کیا ہے؟ ایک دست سوال ہے۔ یعنی جس طرح ہتھیلی پھیلا کے سوال کرتے ہیں۔ سورج بھی اسی طرح ایک دست سوال تھا۔ (کسب ضیا کے لئے) مگر تو نے اُس کو منور کر دیا۔

(۱۵۷۵) شور حشر اس فتنہ قامت کے حضور
سایہ آسا ہو گیا ہے پائمال

وہ معشوق جس کے قد و قامت سے فتنے بپا ہوئے ہیں۔ اُس کے سامنے شور قیامت بھی سایہ کی طرح پائمال ہو گیا ہے۔ یعنی جیسے سایہ پاؤں پر پڑا رہتا ہے۔ وہ بھی پائمال ہے۔

(۱۵۷۶) شوق بے پروا کے ہاتھوں مثل سازِ نادرست
کھینچتا ہے آج نالے خارج از آہنگ دل

آہنگ سے مراد سُر یا الاپ اور آہنگ۔ طرز و روش کو بھی کہتے ہیں۔
حل۔ میرے بے پروا عشق کے ہاتھوں میرا دل مثل بگڑے ہوئے باجے کے بے سرے نالے نکالتا ہے۔ یا ایسے نالے کہ خارج از آہنگ ہیں۔ یعنی معمولی طرز و روش سے بالکل مختلف ہیں۔

(۱۵۷۷) اسدؔ فریفتہ انتخاب طرز جفا
وگرنہ دلبری وعدہ وفا معلوم

اسد تو اس ظالم معشوق کی طرز جفا کا فریفتہ ہے۔ یعنی وہ عجب طرح سے نئے نئے ظلم کرتا ہے۔ ورنہ ان جفاؤں کے عوض وہ وعدہ وفا

کر کے تیرا دل موہ لے۔ یہ تو معلوم ہی ہے کہ وہ ایسا کبھی نہیں کریگا۔

(۱۵۷۸) بسکہ وہ شمع و چراغ محفل اغیار ہے
چپکے چپکے جلتے ہیں جوں شمع ماتم خانہ ہم

چونکہ وہ محفل اغیار کی رونق ہے۔ جیسے شمع و چراغ۔ ہم اس سے ماتم خانہ کی شمع کی طرح چپکے چپکے جلتے رہتے ہیں۔

(۱۵۷۹) شام غم میں سوز عشق آتش رخسار سے
پر فشانِ سوختن ہیں صورت پروانہ ہم

دوست کے رخسار کی آگ یا اس کی سرخی کے عشق کی سوزش کی شام غم میں ہم پروانہ کی طرح پر فشانِ سوختن ہیں۔ فارسی میں پر فشانِ سوختن سے مراد آگ کا جھلملانا ہے۔ تو گویا سوز عشق سے جل کر آگ کی طرح جھلملاتے ہیں۔ جیسے کہ پروانہ شمع کے گرد پھڑ پھڑایا کرتا ہے۔

(۱۵۸۰) تماشائے گلشن تمنائے چیدن
بہار آفرینا گنہگار ہیں ہم

تماشائے گلشن یعنی باغ کی سیر تمنائے چیدن ہے۔ یعنی پھولوں کے توڑنے کی ترغیب دلاتی ہے۔ لہذا اسے بہار آفریں یعنی موسم بہار کو پیدا کرنے والے ہم اس بات کے گنہگار ہیں۔ کہ باغ سے پھول توڑ لیتے ہیں۔ (اگرچہ بہار آفرین کی منشا بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے۔ کہ ایسے خوشنما پھول موسم بہار میں باغ سے نہ توڑے جائیں۔ مگر سیر کرتے ہوئے ہر شخص پھول توڑنا چاہتا ہے۔

(۱۵۸۱) نہ ذوق گریباں نہ پروائے داماں
نگہ آشنائے گل و خار ہیں ہم تو

نگہ آشنا یعنی جو کسی کی نگہ یا شوق ہے وہی ہمارا ہی مراد پھول اپنا کر بیبان پھاڑ دیا کرتا ہے۔ اور اس کو ذوق کر بیبان ہوتا ہے۔ اور کانٹا کسی کے دامن میں لگ کے اس کو پھاڑ دیا کرتا ہے۔ کہ وہ یہی شوق رکھتا ہے۔ ہم بھی ان دونوں کی طرح گریباں و دامن پھاڑنے کا شوق رکھتے ہیں۔

(۱۵۸۲) اسد شکوہ کفر و دعا ناسپاسی
ہجوم تمنا سے لاچار ہیں ہم

اے اسد ہماری آرزوؤں کی کثرت ہے۔ یعنی ہجوم تمنا ہے لہذا بوجہ کثرت جب سب کی سب امیدیں پوری نہیں ہوتیں۔ تو ہم لاچار ہو کے شکوہ کرتے ہیں۔ تو گویا ہم سے گلہ شکوہ کرنے کا کفر صادر ہوتا ہے۔ اور ہم دعا ناسپاسی ہیں۔ یعنی دعائیں مانگ کر جب ساری پوری نہ ہوں۔ تو دعا ناسپاس ہوتے ہیں۔ یعنی دعاؤں کا احسان نہیں مانتے۔ مطلب یہ کہ ہجوم آرزو نے ہمیں خدا سے گلہ مند اور دعا سے بدظن کر دیا ہے۔

(۱۵۸۳) گذرا جو آشیاں کا تصور بوقت بند
مژگان چشم دام ہوئے خار و خس تمام

مرغ اسیر کو جال میں پھنستے وقت جب اپنے گھونسلے کا خیال آیا تو چشم دام جال کی آنکھ یعنی اس کی زنجیریوں کی مژگاں (پلکیں) اس کے لئے گھونسلا بنانے کو خار و خس (تنکے) متصور ہونے لگیں یعنی قید میں اس نے جال کے دھاگے ہی گھونسلے کی تیلیاں فرض کر لیں۔

(۱۵۸۴) کر سکے نہ پائے ضعف سے شور جنوں اسد
اب کی بہار کا یونہی گذرا برس تمام

موسم بہار میں دیوانہ اور زیادہ جنونی بن جاتا اور شور و شر مچایا کرتا ہے۔ کہتا ہے۔ بوجہ ضعف کے ہم اے اسد شور جنون (حسب خواہش) برپا نہ کر سکے۔ تو گویا ابکی بہار کا یہ تمام سال بیکار ہی گذر گیا۔

(۱۵۸۵) فلک سفلہ بے محابا ہے
اس ستمگر کو انفعال کہاں

بے محابا۔ بلا تامل۔ حل۔ آسمان بلا تامل کمینگی کرنے والا ہے بھلا اس ظالم کو شرم ہی کب آتی ہے۔

(۱۵۸۶) بوسہ میں وہ مضائقہ نہ کرے
پر مجھے طاقت سوال کہاں

وہ دوست بوسہ دینے میں ہرگز تامل نہ کرے۔ لیکن (بوجہ اس کے رعب کے) مجھ میں یہ طاقت ہی کہاں ہے۔ کہ میں سوال بوسہ اس سے کروں۔

(۵۸۷) مثل گل زخم ہے میرا بھی سناں سے توام
تیرا ترکش ہی کچھ آبستنی تیر نہیں

زخم مثل گل سے مراد یہاں زخم کا گلاب کے پھول کی طرح لال لال رنگ کا ہوتا ہے۔ سناں۔ بہ معنی تلوار۔ توام۔ ایک ساتھ پایا جانا جیسے کہتے ہیں۔ غم اور خوشی توام ہیں۔ ترکش۔ تیروں کے رکھنے کا خانہ۔ آبستنی۔ آبستنی سے مراد حاملہ ہونا۔

حل شعر۔ میرا زخم جو گلاب کے پھول کی طرح کا لال لال ہے۔ وہ بھی تلوار کے ساتھ لگا رہتا ہے۔ کچھ تیرا ترکش ہی تیر کی قربت سے حاملہ نہیں ہوا۔ یعنی کچھ وہی دو لو توام نہیں ہیں۔

(۱۵۸۸) میرؔ کے شعر کا احوال کہوں کیا غالبؔ
جس کا دیوان کم از گلشن کشمیر نہیں

یعنی جس طرح کشمیر جنت نظیر کی مثال عام دنیا میں نہیں، پائی جاتی اس طرح دیوان میر تقی میر ہے۔

(۱۵۸۹) پاؤں میں جب وہ حنا باندھتے ہیں
میرے ہاتھوں کو جدا باندھتے ہیں

یعنی میں چاہتا ہوں کہ ان کے پاؤں سے حنا اتار دوں کہ اُن کو میرے ہاں آنے میں کوئی عذر نہ ہو سکے۔ مگر وہ جب کبھی مہندی لگاتے ہیں۔ تو اسی خیال سے وہ میرے ہاتھوں کو علیحدہ باندھتے ہیں۔ کہ میں مہندی نہ اتاروں۔

(۱۵۹۰) تیرے بیمار پہ ہیں فریادی
وہ جو کاغذ میں دوا باندھتے ہیں

کاغذ میں دوا باندھنے والے مراد حکیم یا طبیب۔

حل۔ تیرے بیمار عاشق کے علاج کرتے ہیں وہ لوگ بھی فریادی ہیں۔ یا عاجز ہیں۔ کہ جن کو طبیب کہا جاتا ہے۔

(۱۵۹۱) شیخ جی کعبہ کا جانا معلوم
آپ مسجد میں گدھا باندھتے ہیں

اجی شیخ صاحب تم تو مسجد ہی میں اپنا گدھا باندھ کے مسجد کی بے حرمتی کرتے ہو۔ تو پھر کعبہ کیا جاؤ گے؟۔ تم میں جذبہ ایمان

ساں ؟ -

(۱۵۹۲) ہے نزاکت فصل گل میں بسکہ معمار چمن
قالب گل میں ڈھلی ہے خشت دیوار چمن

موسم بہار میں نزاکت گویا چمنستان کی معمار ہے۔ یعنی اس کو وہی جنم ہے۔ کیونکہ پھول جو اس قدر نازک ہوتا ہے۔ اسی کے قالب یا سانچے میں چمنستان کی اینٹیں ڈھالی گئی ہیں۔

(۱۵۹۳) بسکہ پائی یار کی رنگیں نوائی سے شکست
ہے کلاہ ناز گل بر طاق دیوار چمن

چونکہ دوست کی رنگین ادائی یعنی نزاکت سے پھول نے بھی شکست کھائی ہے۔ لہذا پھول کے ناز یا نزاکت کی ٹوپی (کلاہ) دیوار چمن کی طاق پر ہے۔ (طاق پر ہونے سے مراد کسی کو نظر انداز کر دینا ہے۔

(۱۵۹۴) وقت ہے گر بلبل مسکیں زلیخائی کرے
یوسف گل جلوہ فرما ہے بہ بازار چمن

یوسف گل۔ (اس میں اضافت توصیفی ہے) یعنی وہ پھول جو یوسف کی طرح خوبصورت اور ہر دلعزیز ہے۔ وہ چمن کے بازار میں جلوہ فرما ہے۔ اپنا جوبن دکھا رہا ہے۔ یہ وقت ہے۔ کہ کوئی غریب بلبل زلیخا کی طرح اس یوسف گل پر عاشق ہو جائے۔

(۱۵۹۵) معاف بیہدہ گوئی ہیں ناصحان عزیز
ولے بدست نگارے نداده رکھتے ہیں

معزز ناصح یاوہ گوئی میں معذور ہیں۔ کیونکہ وہ ایسا دل رکھتے ہیں جو کہ بدست نگارے نداده ہے یعنی اس کو وہ کسی معشوق کے

عشق میں ہاتھ سے کھو نہیں چکے ہیں۔

(۱۵۹۶) برنگ سبزہ عزیزان بدزباں یکدست
ہزار تیغ بہ زہرآب دادہ رکھتے ہیں

برنگ سبزہ۔ یعنی جس طرح سبزہ کی کونپل یا گھاس کی تیز نوک پر شبنم پڑکر اس کو آب رہتی ہے۔ تیغ آب دادہ سے مراد۔ وہ تلوار جس کو آب چڑھائی گئی۔ تاکہ وہ زیادہ تیز ہو۔

حل شعر۔ جو عزیز مثلاً دوست یا رشتہ دار یکدست (تمام تر) یعنی انتہا درجے کے بدزبان ہوا کرتے ہیں۔ وہ گھاس اور سبزہ کی کونپلوں کی طرح ہزاروں تلواریں ہوا کرتی ہیں۔ کہ جن کو زہر کے آب چڑھائی گئی تاکہ وہ زیادہ کاٹ کریں۔

(۱۵۹۷) پیمانۂ وسعت کدۂ شوق ہوں اے رشک۔
محفل سے مگر شمع کو دل تنگ نکالوں

شوق سے مراد یہاں عشق میں جلنے کا شوق۔ جیسے کہ شمع جلا کرتی ہے۔ اس شعر میں عاشق کے جلنے اور شمع کے جلنے کا تقابل کیا گیا ہے۔

حل شعر۔ جلنے کے شوق کے وسعت کدہ یعنی وسیع میدان کا میں ایک پیمانہ یعنی معیار ہوں۔ اے رشک شاید کہ میں اس قدر جلوں کہ اسی رشک میں شمع کو جو دل تنگ ہو جائے۔ میں محفل سے نکال دوں۔

(۱۵۹۸) یک نشوونما جا نہیں جولان ہوس کو
ہر چند بمقدار دل تنگ نکالوں

یک نشوونما۔ ایک مرتبہ پوری طرح سے پروان چڑھنا۔ یا بہ کمال پہنچنا۔ جولان ہوس۔ ہوس رانی۔ یعنی دل کی ہوس پوری کرنا۔

حل۔ ہر چند کہ میں اپنے تنگ دل کے حسب مقدار بھی ہوس رانی کیا چاہتا ہوں۔ تو بھی جولان ہوس یعنی اپنے دل کے ارمان یا ہوس نکالنے کو یک نشوونما جا بھی نہیں ملتی۔ یعنی ایک دفعہ بھی ارمان نکالنے کا موقع نہیں ملتا۔

(۱۵۹۹) فریاد اسد غفلت رسوائی دل سے
کس پردہ میں فریاد کی آہنگ نکالوں

آہنگ۔ لے۔ سُر۔ اے اسد دل کے ہاتھ سے کہ جو میری رسوائی کی طرف سے غفلت کرتا ہے۔ فریاد ہے۔ اب میں کس پردے میں یعنی کس طرح اپنے رونے دھونے کی لے نکالوں۔ یعنی دل کی رسوائی تو غفلت کرتی ہے۔ یا میرا دل میری رسوائی پوری طرح نہیں ہونے دیتا۔ اور میرا عشق سب پر ظاہر نہیں ہوتا۔ تو میں اگر فریاد یعنی سب کے سامنے رونے کی لے نکالوں۔ تو وہ کونسا پردہ یعنی وسیلہ ہوگا۔ بجز رسوائی عشق کے۔

(۱۶۰۰) ہوں گرمیٔ نشاط تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیب گلشن ناآفریدہ ہوں

انسان کو کسی خیالی عیش کا تصور بندھے۔ تو وہ بہت خوش رہتا ہے۔ اسی مضمون پر اس شعر کی بنیاد ہے۔ کہتا ہے۔ تصور کی خوشی کی گرمی سے متاثر ہوکر میں نغمہ سنج ہو رہا ہوں۔ یعنی مسرت کے ترانے گا رہا ہوں۔ کیونکہ میں ایسے باغ کی بلبل ہوں۔ کہ جو ابھی پیدا ہی نہیں ہوا۔ یعنی محض ایک خیالی باغ ہے۔

(۱۶۰۱) جوں بوئے گل ہوں گرچہ گرانبار عشقِ زر
لیکن اسد بوقت گزشتن جریدہ ہوں

گراں بار مشت زر۔ پھول میں سے جو ذرے سے جھڑتے ہیں اسے زرِ گل کہا جاتا ہے۔ وہ ایک خاص مقدار سے بعض پھولوں میں ہوا کرتے ہیں اس لئے یہاں مشتِ زر سے استعارہ کیا ہے ہوا جب باغ میں چلتی ہے۔ تو گویا اس زر گل سے ٹکرا کر خوشبو حاصل کرتی ہے۔ اور وہ گرانبار ہو جاتی ہے۔

حل شعر۔ اگرچہ میں پھول کی خوشبو ہوں جو کہ زر گل سے گرانبار ہوا کرتی ہے۔ یعنی اس کی خوشبو لیکر باغ میں پھیلتی ہے۔ مگر اے اسد باغ میں چلتے پھرتے وقت جس طرح وہ بوئے گل تنہا ہوتی ہے۔ اور اس پر کوئی بوجھ بار دکھائی نہیں دیتا۔ اسی طرح میں بھی باغ میں تنہا پھر کر گزر جایا کرتا ہوں۔

(۱۶۰۲) سر پر مرے وبال ہزار آرزو رہا
یارب میں کس غریب کا بخت رمیدہ ہوں

میرے سر پر ہزارہا امیدوں کا بوجھ رہا۔ اور یہ کبھی نہ اترا۔ یعنی کوئی امید کبھی پوری نہ ہوئی۔ یارب میں ہمیشہ کس غریب کا بخت رمیدہ یعنی وحشی نصیبہ رہا۔

(۱۶۰۳) میرا نیاز و عجز ہے۔ مفتِ بتاں اسد
یعنی کہ بندۂ بہ درم ناخریدہ ہوں

میرا نثار ہونا بتوں پر اور ان کے سامنے میرا عاجزی کا عالم ان بتوں (یا معشوقوں) کی خاطر بالکل مفت رہا۔ گویا کہ میں اُن کا ایک بے درم غلام ہوں۔

(۱۶۰۴) مگر آتش ہمارا کوکب اقبال چمکا دے
وگرنہ مثل خار خشک مردود گلستاں ہیں

خار خشک۔ مراد۔ باغ کے سوکھے گرے پڑے تنکے وغیرہ۔ کہ جنکو باغ میں کوئی پوچھتا نہیں۔ مگر ان کو آگ سے جلائیں تو شعلے خوب اُٹھتے ہیں

حل شعر۔ ہم باغ کے گرے پڑے تنکے اور کانٹے وغیرہ ہیں۔ کہ خشک ہونے کی وجہ سے مردود گلستاں ہیں۔ یعنی اُن کو باغ سے باہر پھینک دیا جاتا ہے۔ لیکن اگر ان کو یعنی ہم کو آگ سے جلا دیا جائے۔ تو ہم اُن تنکوں کی طرح جل کے خوب شعلے اُٹھائیں۔ اور شاید اس طرح ہمارے اقبال کا ستارہ بھی آگ کے ذریعہ چمک اُٹھے۔

(۱۶۰۵) اے نوا ساز تماشا سر بکف جلتا ہوں میں
اک طرف جلتا ہے دل اور اک طرف جلتا ہوں میں

سر بکف کے یہاں لفظی معنی مراد ہیں۔ یعنی افسوس کی حالت میں سر کو اپنی ہتھیلی پر رکھکر افسوس کرتا ہوں۔ اے تماشے کے ساز و سامان کرنے والے۔ یعنی تماشا دیکھنے والے۔ میری طرف دیکھ کہ میں حالت غم میں اپنی ہتھیلی پر ہاتھ رکھے ہوئے افسوس کر رہا ہوں۔ اور ایک طرف میرا دل غم سے جلتا ہے۔ دوسری طرف میں خود جل رہا ہوں۔

(۱۶۰۶) شمع ہوں تو بزم میں جا پاؤں غالب کی طرح
بے محل اے مجلس آرائے نجف جلتا ہوں میں

مجلس آرائے نجف سے مراد یہ کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ شہر نجف میں دفن ہیں۔ لہذا اس جملے سے مراد حضرت علی ہیں۔

حل۔ اگر میں شمع ہوں تو خدایا غالب کی طرح میں بھی کسی محفل میں جگہ پاؤں۔ یعنی سب میں عزت حاصل کروں۔ ورنہ یا حضرت علی رضہ میں بے موقع ہی جل رہا ہوں۔ یعنی کہیں بھی میری عزت نہیں۔ اور

بے ٹھکانے ہو رہا ہوں۔

(۱۶۰۷) فتادگی میں قدم استوار رکھتے ہیں
برنگِ جادہ سرِ کوئے یار رکھتے ہیں

ہم فتادگی کی حالت میں یعنی گرے پڑے بھی اپنا قدم استوار رکھتے ہیں۔ مراد راہ سے بے راہ نہیں ہوتے۔ گویا جس طرح پگڈنڈی ہوتی ہے کہ ٹھیک ایک ہی طرف کو چلی جاتی ہے۔ ہم بھی اسی طرح اس دوست کے کوچے کا دھیان ہمیشہ اپنے دل میں جمائے رکھتے ہیں۔ اور اسی طرف کو چلے جاتے ہیں۔

(۱۶۰۸) جنونِ فرقتِ یارانِ رفتہ ہے غالبؔ
بسانِ دشت دلِ پُر غبار رکھتے ہیں

اے غالب ہم کو اپنے مرے ہوئے یا گزشتہ دوستوں کی جدائی کا غم ستاتا ہے۔ کہ جس سے ہم ایک بیابان کی طرح اپنا دل غبار یا رنج سے ہمیشہ بھرا ہوا رکھتے ہیں۔

(۱۶۰۹) ہوئی ہیں آب شرم کوشش بجائے تدبیریں
عرق ریزِ تپش ہیں موج کی مانند زنجیریں

ایک بے موقع کوشش سے زخم کھا کے ہماری تدبیر آب ہو گئی ہیں۔ یعنی ناکام رہی ہیں۔ یہ تدبیریں گویا وہ زنجیریں ہیں۔ کہ عرق ریز تپش ہو کے یعنی سخت تپش سے پگھل کے عرق ہو گئیں۔ اور اب عرق بن کے پانی کی لہر کی مانند بہہ رہی ہیں۔ مراد یہ کہ کسی مخالف تاثیر سے جس طرح لوہا بھی پانی ہو جاتا ہے۔ اسی طرح مخالف کوشش کے اثر سے ہم بھی پانی ہو کے رہ گئے۔

(۱۶۱۰) بتانِ شوخ کی تمکیں بعد از قتل کی حیرت
بیاضِ دیدۂ نخچیر پر کھینچے ہے تصویریں

تمکیں بعد از قتل سے مراد۔ قتل کر کے مطلق متاثر نہ ہونا۔ اور غرور و تمکنت پر قائم رہنا۔

حل۔ وہ شوخ بت جب قتل کر کے بھی غرور و تمکنت پر قایم رہے تو اس سے مقتول کو جو حیرت ہوئی تو وہ حیرت۔ نخچیر (مراد شکار) یعنی مقتول کی آنکھ کی سفیدی پر کئی تصویریں کھینچتی ہیں۔ یعنی اس کی کئی حالتیں بدلتی ہیں۔

(۱۶۱۱) اسد طرزِ عروجِ اضطرابِ دل کو کیا کہیے
سمجھتا ہوں تپش کو الفتِ قاتل کی تاثیریں

عروج۔ مراد بڑھنا۔ یا ترقی کرنا۔ عروج اضطراب۔ بیقراری میں ترقی ہونا۔ تپش۔ بے قراری و اضطراب۔

حل۔ اے اسد میں دل کی بے قراری کی ترقی کی طرز کی نسبت کیا کہوں۔ یہ خیال کرتا ہوں۔ کہ میری اس بیقراری اور اضطراب پر اس قاتل معشوق ہی کی محبت کا اثر ہے۔ کہ جس قدر یہ بڑھتی ہے۔ اُسی قدر وہ بے قراری بھی ترقی پاتی ہے۔

(۱۶۱۲) ہو چکے ہم جادہ ساں صد بار قطع و تا ہنوز
زینتِ یک پیرہن چوں دامنِ صحرا نہیں

جادہ۔ باریک راہ یا پگڈنڈی۔ دامن صحرا۔ جنگل کا کوئی گوشہ جو ہمیشہ سبز و شاداب ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ سعدی کہتا ہے۔ ؎

بامداداں کہ تفاوت نکند لیل و نہار
خوش بود دامنِ صحرا و تماشائے بہار

حل۔ ہم ایک پگڈنڈی کی طرح سو مرتبہ توڑے پھوڑے جا چکے ہیں، مگر پھر بھی دامن صحرا کی طرح کسی پیرہن کی زینت نہ ہوئے۔ یہاں پیرہن سے مراد ایک وسیع چیز جیسے صحرا۔ مطلب یہ کہ پگڈنڈی شکستہ ہو کر ایک چھوٹا سا مقام تو ضرور بن جاتی ہے۔ جیسے کہ دامن صحرا مگر پگڈنڈی پر درختوں کا یا سبزہ وغیرہ کا نام و نشان نہیں ہوتا۔ اس لئے کسی حالت میں بھی وہ دامن صحرا کی سی زینت دار نہیں ہو سکتی۔ اور یہی ہمارا حال ہے۔

(۱۶۱۳) ہے طلسم دہر میں صد حشر پاداش عمل
آگہی غافل کہ یک امروز بے فردا نہیں

دنیا کے طلسم یعنی اس کے اسرار میں یہ بات بھی ہے۔ کہ یہاں صد حشر پاداش عمل ہے۔ یعنی جیسا کوئی کرتا ہے ویسا ہی وہ پاتا ہے۔ اور ایسا صد ہا مرتبہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ حشر یعنی روز قیامت بدلا دیا جائیگا۔ لہٰذا اب اے غافل تجھے معلوم ہو کہ یہاں کوئی بھی ایسی آج نہیں ہے۔ کہ جس کی کل نہ ہو مراد یہ کہ ہر شخص جو کچھ کرتا ہے۔ اُس کا بدلہ اُس کو دنیا ہی میں ہمیشہ مل جاتا ہے۔

(۱۶۱۴) بسمل اُس تیغ دو دستی کا نہیں بچتا اسد
عافیت بیزار شغل کعبتین اچھا نہیں

کعبتین۔ دو پانسوں سے کھیلتے ہیں۔ اسی لئے اُس کو "تیغ دو دستی" سے منسوب کیا ہے۔

حل شعر۔ کعبتین کا شغل کچھ اچھا نہیں ہوتا۔ اس سے عافیت جاتی رہتی ہے۔ اور اس دو ہاتھوں سے چلائی جانے والی تلوار کا مقتول یعنی شایق کبھی بچتا ہی نہیں۔

(۱۶۱۵) ہے وطن سے باہر اہل دل کی قدر و منزلت
عزلت آباد صدف میں قیمت گوہر نہیں

اہل دل یعنی صاحب دل وطن سے باہر جا کر ہی قدر و منزلت حاصل کرتے ہیں۔ کیونکہ سیپ کی عزلت آباد یعنی تنہائی میں جہاں گوہر پڑا ہوتا ہے وہاں گوہر کی کوئی قدر نہیں ہوا کرتی۔ ذوق سے

اہل جوہر کو وطن میں رہنے دیتا گر فلک
لعل کیوں اس رنگ سے آتا بدخشاں چھوڑ کر

(۱۶۱۶) باعث ایذا ہے برہم خوردن بزم سرور
لخت لخت شیشۂ بشکستہ جز نشتر نہیں

عیش و عشرت کی محفل جب برہم ہو جائے تو تکلیف کا باعث بنجاتی ہے چنانچہ ایسی محفل میں کا کوئی ٹوٹا ہوا شیشہ شراب ہو۔ تو اس کا لخت لخت یعنی ریزہ ریزہ سوائے ایک نشتر کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ اور ظاہر ہے کہ نشتر ہمیشہ ایذا کا باعث ہے۔

(۱۶۱۷) حیف بیجا صلی اہل ریا پر غالب
یعنی ایں ماندہ ز آں سو وا زیں سو راندہ

اے غالب اہل فریب کی بیجا صلی یعنی محرومی پر افسوس آتا ہے۔ کیونکہ وہ آں سو راندہ اور ایں سو راندہ رہا کرتے ہیں۔ اس فارسی مثل وا آں سو راندہ وغیرہ کا مطلب یہ کہ وہ ہر کہیں دھتکارے جاتے اور ذلیل کئے جاتے ہیں۔

(۱۶۱۸) شکوہ و شکر کو ثمر بیم و امید کا سمجھ
خانۂ آگہی خراب دل نہ سمجھ بلا سمجھ

بیم و امید۔ خوف اور آس۔ یعنی دل میں کسی مقصد کے متعلق یا تو ڈر ہوتا ہے۔ کہ شاید وہ مقصد پورا نہ ہو سکے۔ تو یہ گویا بیم ہے۔ یا امید ہوتی ہے۔ کہ وہ مقصد شاید پورا ہو جائے۔ لیکن یہ دونوں صورتیں امید و بیم کی دل سے متعلق ہوتی ہیں۔ اور ان سے دل عموماً متاثر ہوتا رہتا ہے خانۂ آگہی دل۔ حل شعر۔ شکوہ اور شکر تو چونکہ امید و بیم کا نتیجہ ہیں۔ مگر امید و بیم میں دل مبتلا ہو کے گویا بلا بن جاتا ہے۔ تو اسے خانۂ آگہی (دل) تو برباد ہونا کہ بیم و امید نہ بند ہے۔

(۱۶۱۹) امیدوار ہوں تاثیر تلخکامی سے
کہ قند بوسۂ شیریں لباں مکرر ہو

حل۔ تلخکامی یعنی حلق کی بدمزگی اور اس کے کڑوے ذائقے کا یہ اثر ہے۔ کہ میں امید لگائے بیٹھا ہوں۔ کہ اس تلخکامی کو دور کرنے کے لئے ان شیریں لب معشوقوں کے بوسوں کی شیرینی مجھے مکرر یعنی دوبارہ حاصل ہو گی۔

(۱۶۲۰) صدف کی ہے تیرے نقش قدم میں کیفیت
سرشک چشم اسد کیوں نہ اس میں گوہر ہو

تیرے نقش قدم میں سیپ کے ایسے خواص پائے جاتے ہیں۔ یعنی سیپ میں ایک قطرہ آب گرے تو گوہر بن جایا کرتا ہے۔ لہذا اسد کی آنکھ کا آنسو جو کہ تیرے نقش قدم پر گرا ہے وہ اس سیپ میں کیونکر گوہر نہ بن جائے۔

(۱۶۲۱) کہتا تھا کل وہ نامہ رساں سے بسوز دل
درد جدائی اسد اللہ خاں نہ پوچھ

کل وہ میرے قاصد سے بڑے رنج کے ساتھ کہتا تھا۔ کہ اسد اللہ خاں کی جدائی سے جو غم پہنچا ہے اس کا کچھ حال نہ پوچھ (جدائی سے یہاں مراد غالباً وفات ہے۔

(۱۶۲۲) ہے فلک بالانشیں، فیض خم گردیدگی
عاجزی سے ظاہرا رتبہ کوئی برتر نہیں

آسماں اگرچہ بلند ہوتا ہے۔ تاہم اس کا کچھ حصہ دور سے دیکھیں تو زمین سے لگا ہوتا ہے۔ آسمان اسی زیریں حصہ پہ بالانشین بنا ہوا ہے۔ فیض خم گردیدگی۔ آسمان کا خمیدہ ہو کے اپنا زیریں حصہ بنانا۔ اور اس سے مستفید ہونا۔ جیسے کہ یہاں بیان کیا گیا ہے۔

حل شعر۔ آسمان نیچے کی طرف جو جھکا ہوا یعنی خمیدہ ہے۔ اسی خم ہونے کے فیض سے یا اس کی بدولت بالانشین ہے۔ یعنی اتنا بلند نظر آتا ہے۔ ظاہر ہوا کہ عاجز اور فروتن ہونے سے اور کوئی مرتبہ بلند نہیں ہے۔

(۱۶۲۳) کب تلک پھیرے اسد لبہائے تفتہ پر زباں
طاقت لب تشنگی اے ساقی کوثر نہیں

جلے ہوئے یعنی خشک ہونٹوں پر اسد کب تک اپنی زبان کو پھیرا کرے۔ اے ساقی کوثر شراب طہور کا جام پلا دے۔ کہ لب تشنگی یعنی پیاس کے برداشت کرنے کی قوت نہیں رہی ہے۔

(۱۶۲۴) اگر وہ آفت نظارہ جلوہ گستر ہو
ہلال ناخنک دیدۂ ہائے اختر ہو

ناخن در دیدہ و ریختن ۔ ایک فارسی محاورہ ہے ۔ جس کے معنی دنیا ہے کمال رنج و عذاب پہنچانا ہے ۔ لہذا ناخنک دیدہ ہائے اختر سے مراد ستاروں کی آنکھوں کو تکلیف دہ ثابت ہونا ہے ۔

حل شعر ۔ اگر وہ آفت نظارہ (یعنی جس کے دیکھنے سے عاشق پر گویا بجلی سی گر جاتی ہے) اپنا جلوہ دکھائے ۔ تو ہلال بھی ستاروں کی آنکھوں میں کھٹکنے لگے ۔ یعنی اُس دوست کے حسن کے مقابل وہ ہلال کو موجب عذاب سمجھ کے دیکھنا ہی چھوڑ دیں ۔

(۱۶۲۵) بہ یاد قامت اگر ہو بلند آتش غم
ہر ایک داغ جگر آفتاب محشر ہو

آفتاب محشر کہتے ہیں قیامت کے دن آفتاب بہت قریب ہو جائیگا ۔ اور سخت گرم ہوگا ۔

حل ۔ اگر دوست کے فراق میں اس کی قامت کا خیال بند ہے ۔ تو غم کی آگ اتنی بلند یعنی اس میں اس قدر گرمی ہو ۔ کہ ہمارے جگر کا ہر داغ (جو بوجہ غم پیدا ہو ۔) قیامت کے گرم آفتاب کا نمونہ بنجائے ۔

(۱۶۲۶) ستم کشی کا کیا دل نے حوصلہ پیدا
اب اُس سے ربط کروں جو بہت ستمگر ہو

چونکہ میرے دل نے ظلم برداشت کرنے کی طاقت اب پیدا کر لی ہے ۔ لہذا اب اُس ظالم معشوق سے تعلق پیدا کروں ۔ کہ جو سخت ظالم ہو ۔

(۱۶۲۷) وحشت درد بیکسی بے اثر اسقدر نہیں
رشتۂ عمر خضر کو نالۂ نارسا سمجھ

بیکسی ۔ کوئی رفیق و ہمدرد نہ ہونا ۔ رشتۂ عمر ۔ مراد سالگرہ ۔ رشتۂ عمر خضر ۔ یعنی خضر کی ہر سال عمر بڑھنا ۔ نالہ نارسا سمجھ ۔ ایک ایسا نالہ تصور کر کہ بے حصول مقصد ہو ۔

حل ۔ بیکسی کے درد سے جو وحشت یا جی کا اُکتانا محسوس ہوتا ہے وہ اسقدر بے اثر یعنی بے مقصد اور فضول نہیں ہوتا ۔ جتنا کہ عمر خضر کا ہر سال بڑھنا ۔ اور حضرت خضر کا ہمیشہ بے کس یعنی تن تنہا رہنا ۔ اور بے مقصد زندگی بسر کرنا ۔ جو در اصل ایک نالۂ نارسا ہے ۔ کہ جس کا کچھ حاصل حصول نہیں ہوا کرتا ۔

(۱۶۲۸) دلی کے رہنے والو اسد کو ستاؤ مت
بیچارہ چند روز کا یہاں مہمان ہے

اے دلی کے ساکنو ۔ اسد بیچارہ تو چند روز کا مہمان ہے ۔ اسے تم ستاؤ نہیں ۔

(۱۶۲۹) نظر بہ نقص گدایاں کمال بے ادبی ہے
کہ خار خشک کو بھی دعوئ چمن نسبی ہے

فقیروں کے نقص نکالنا سخت بے ادبی ہے ۔ کیونکہ خشک کانٹا بھی یہ دعوی کرتا ہے ۔ کہ اس کا حسب و نسب چمن سے ہے ۔ یعنی اسی سے جنم لیا تھا ۔

(۱۶۳۰) امام ظاہر و باطن امیر صورت و معنی
علی ولی اسد اللہ جانشین نبی ہے

وہ کہ ظاہر و باطن کا امام یعنی پیشوا ہے۔ اور حقیقت و مجاز کا امیر یا سردار ہے۔ یعنی حضرت علی۔ ولی۔ اسد اللہ (حضرت علی کا لقب) کہ پیغمبر صاحب کا جانشین ہے۔

(۱۶۳۱) بے چشم دل نہ کر ہوس سیر لالہ زار
یعنی یہ ہر ورق ورق انتخاب ہے

دل کی آنکھ کے بغیر چمن کی سیر کی آرزو نہ کر۔ کیونکہ یہ ہر ورق یعنی پھول کا ہر صفحہ یا اس کی ہر سطر ایک ایسا ورق ہے۔ کہ جس کو قدرت نے انتخاب کیا ہے۔ اور اس کی خوبیاں پہچاننے کے لئے تجھے چشم دل ہونی چاہیئے۔ لہذا اسی کی آرزو کر اور پھر چمن میں جا۔

(۱۶۳۲) تا چند پست فطرتیٔ طبع آرزو
یا رب ملے بلندیٔ دستِ دعا مجھے

فارسی محاورہ میں "دعا کردن" کا مفہوم کسی کے لئے دعا کر کے اس سے وداع ہو جاتا ہے۔ یہاں مراد ترک کرنا۔ شاعر کہتا ہے۔ کہ میں کب تک طبع آرزو یعنی مانگنے کی خصلت میں پست فطرت رہوں گا۔ یعنی مانگنے سے ذلیل ہوتا رہوں گا۔ اے خدا مجھے تو دست دعا یعنی "ترک" کرتے یا ہوا و ہوس چھوڑنے کی بلندی (اعلیٰ خصلت) عنایت کر۔

دوسرے معنی یہ کہ کسی کے آگے دست دعا کچھ فرو تر کر کے پھیلائے جاتے اور اس سے مانگا جاتا ہے۔ تو شاعر کہتا ہے کہ یہ دست دعا فرو تر نہ ہوں۔ بلکہ ان کو بلندی حاصل ہو۔ جس صورت میں مفہوم شعر یہ ہوگا۔ کہ دعا کے ہاتھ بلند کئے جائیں۔ یعنی اٹھا ہی لئے جائیں۔ تو اس سے انسان ذلیل تو نہ ہو۔ مصنف ایک اور جگہ کہتا ہے۔ ؎

گر ہے تجھے یقین اجابت دعا نہ مانگ
یعنی بغیر یک دل بے مدعا نہ مانگ

(۱۶۳۳) یک بار امتحان ہوس بھی ضرور ہے
اے جوش عشق بادۂ مرد آزما مجھے

اے جوش عشق کہ بادۂ مرد ہے۔ یعنی مرد آدمیوں کے لائق شراب ہے (جیسے کہ غالب ایک اور شعر میں کہہ چکا ہے ؎
عشق نبرد پیشہ طلبگار مرد تھا)
ایک بار تو میری ہوس یا شوق عشق کے امتحان کے لئے ضرور مجھے آزما کے دیکھ۔ کہ آیا میں مرد عشق ہوں یا نہیں ہوں۔

(۱۶۳۴) میں نے جنوں سے کی جو اسد التماس رنگ
خون جگر میں ایک ہی غوطہ دیا مجھے

رنگ سے یہاں مراد عیش و مستی ہے۔

حل شعر۔ اے اسد میں نے جنون سے عیش و مستی کی خواہش کی۔ تو اس نے خون جگر میں مجھے ڈبو ہی دیا۔ مراد الٹا خون جگر یعنی رنج و غم میں سرتاپا مبتلا کر دیا۔ بجائیکہ عیش کے سامان بہم پہنچاتا۔

(۱۶۳۵) کہوں کیا گرم جوشی میکشی میں شعلہ رویاں کی
کہ شمع خانہ دل آتش مے سے فروزاں کی

بوقت شراب خواری حسینوں کی گرم جوشی یعنی ہمیں بڑے تپاک سے ملنے جلنے کی نسبت کیا بیان کروں کہ ہمارے خانہ دل کی شمع کو گویا آتش مے یعنی شراب کی ایسی گرمی سے روشن کر دیا۔ گویا گرمیٔ اختلاط سے ہمارا دل

بیحد متاثر کیا۔

(۱۶۳۶) ہمیشہ مجھ کو طفلی میں بھی مشق تیرہ روزی تھی
سیاہی ہے مرے ایام میں لوحِ دبستاں کی

یعنی مجھ کو بچپن میں بھی ہمیشہ سیاہ تختی کی مشق کرائی جاتی تھی۔ کیونکہ میرے ایام میں یعنی میری قسمت ہی میں لوحِ دبستاں یعنی مکتب کی تختی (اپر لکھنے) کی سیاہی لکھی ہے۔ جو بہت سیاہ ہوا کرتی ہے۔

(۱۶۳۷) دریغ آہ سحرگاہ کار بادِ صبح کرتی ہے
کہ ہوتی ہے زیادہ سرد مہری شمع رویاں کی

چونکہ سرد مہری (یا کرم جوشی محبت کا فقدان) حسینوں میں بہت ہی زیادہ ہے۔ اور ہم اس غم میں مبتلا ہیں۔ اسی لئے افسوس ہے کہ ہم صبح کو جو آہیں بھرتے ہیں تو ہماری آہ صبح کی ہوا کا کام دیتی ہے۔ یعنی اس کثرت سے ہم آہیں بھرتے ہیں۔

(۱۶۳۸) خدایا کس قدر اہلِ نظر نے خاک چھانی ہے
کہ ہیں صد رخنہ جوں غربال دیواریں گلستاں کی

اہلِ نظر = تاک جھانک لگانے والے۔ خاک چھانی ہے۔ یعنی کوشش اور جستجو کی ہے۔

حل شعر۔ خدایا اہلِ نظر نے تاک جھانک لگانے میں کس قدر کوشش کی ہے۔ کہ غربال یا چھلنی کی طرح باغ کی دیواریں (ان کی نظروں سے) صد رخنہ ہو گئی ہیں۔ یعنی ان میں صدہا چھید پڑ گئے ہیں۔

(۱۶۳۹) ہوا شرم تہیدستی سے وہ بھی سرنگوں آخر
بس اے زخمِ جگر اب دیکھ لی سوزش نمکداں کی

شورشِ نمکداں۔ یعنی نمکدان میں نمک کی بہتات اور اس کی تیزی۔

حل۔ نمکدان بھی سب اپنا نمک ہمارے زخم پر خالی کر کے آخر سرنگوں ہوا۔ یعنی ہمارے زخم سے عاجز آ گیا۔ بس اے زخمِ جگر ہم نے نمکدان کے افراطِ نمک اور اُس کی تیزی کا امتحان کر لیا۔

(۱۶۴۰) بیادِ گرمیٔ صحبت برنگِ شعلہ دہکے ہے
چھپاؤں کیونکہ غالبؔ شورشیں داغِ نمایاں کی

دوست کی گرمیٔ صحبت کی یاد میں میرا داغِ دل شعلے کی طرح دہکتا ہے۔ اب ایسے نمایاں داغ کی شورشیں یعنی فساد یا تاثیرات کو (جیسے کہ شعلے کی طرح دہکنا وغیرہ ہے۔) کیونکر چھپاؤں۔

(۱۶۴۱) اسدؔ کو بوریے میں دھر کے پھونکا موجِ ہستی نے
فقیری میں بھی باقی ہے شرارت نوجوانی کی

دھر کے پھونکا سے مراد یہاں بھڑکانا ہے۔

حل شعر۔ موجِ ہستی۔ یعنی زندگی کی موج یا عیش مزے کی خواہش نے اسدؔ کو بوریے میں یعنی حالتِ فقر میں بھی کچھ بھڑکا دیا ہے۔ یعنی بُری باتوں کی خواہش دلائی ہے۔ گویا فقیر ہو گئے بھی وہ شرارتیں جو انسان جوانی میں کیا کرتا ہے۔ اس میں موجود ہیں۔

(۱۶۴۲) نکلتی ہے تپش میں بسملوں کے برق کی شوخی
غرض اب تک خیال گرمیٔ رفتار قاتل ہے

مقتول عشاق کی تڑپ میں بجلی کی سی تیزی پائی جاتی ہے۔ غرض اب تک اُسی قاتل کی چال کی گرمی کا خیال بندھا ہوا ہے۔

(۱۶۴۳) کثرتِ جور و ستم سے ہو گیا ہوں بیدماغ
خوبرویوں نے بنایا غالبؔ بد خو مجھے

میں ظلم کی کثرت کی وجہ سے بد دماغ ہو گیا ہوں۔ گویا انہی خوبرو معشوقوں نے مجھے بد خو یعنی بد دماغ بنا دیا ہے۔ (قاعدہ ہے کہ بہت مظلوم ہو کر انسان خفقانی سا ہو جاتا ہے۔

(۱۶۴۴) اسدؔ اُٹھنا قیامت قامتوں کا وقتِ آرایش
لباسِ نظم میں بالیدنِ مضمونِ عالی ہے

قیامت قامت سے مراد جن معشوقوں کی قامت۔ قیامت کا اثر کرنے والی یعنی بے حد موثر ہے۔

حل۔ اے اسد ان قیامت قامت معشوقوں کا آرایش کے وقت اُٹھ کھڑے ہونا ایسا ہے۔ کہ جیسا لباسِ نظم میں یعنی شعر و شاعری میں ایک اعلیٰ خیال کے مضمون کا بڑھنا۔ اور نشو و نما پانا ہوتا ہے۔

(۱۶۴۵) ہنگامِ تصور ہوں دریوزہ گرِ بوسہ
یہ کاسۂ زانو بھی اک جامِ گدائی ہے

کاسۂ زانو سے مراد یہاں زانو پر سر رکھا ہوا۔ کسی کے غم یا تصور میں۔ بیٹھنا۔

حل شعر۔ تمہاری یاد میں سر بزانو بیٹھا ہوا۔ بوسے کی دریوزہ گری یعنی طلب کیا کرتا ہوں۔ یہ کاسۂ زانو یعنی میرا سر بھی گویا ایک بھیک مانگنے کا پیالہ ہے۔

(۱۶۴۶) بعد از وداعِ یار بخوں در تپیدہ ہیں
نقشِ قدم ہیں ہم کفِ پائے نگار کے

دوست کی الوداع یا جدائی کے بعد ہم خون میں پڑے تڑپتے رہتے ہیں۔ گویا ہم اس معشوق کے رنگین پاؤں کے تلوے کے نقشِ قدم ہیں کیونکہ بخوں تپیدہ یعنی سرخ رنگت کے ہیں۔ بوجہ خون میں لتھڑے کے۔

(۱۶۴۷) ہم مشقِ فکرِ وصل و غمِ ہجر سے اسدؔ
لائق نہیں رہے ہیں ستمِ روزگار کے

اے اسد۔ ہم وصل کے فکر یا غم کی مشق یا اس میں منہمک رہ کے اور غمِ جدائی کے سبب اب اس قابل ہی نہیں رہے۔ کہ دکوئی اور ظلم برداشت کر سکیں۔ جیساکہ) ستمِ روزگار (یہاں ستمِ روزگار کے دو معنی ہیں۔ ایک تو اہلِ دنیا کا ظلم جو عشاق پر ہوا کرتا ہے۔ دوسرے روزی روزگار یا کاروبارِ دنیوی کی مصیبت)

(۱۶۴۸) پیدا کریں دماغِ تماشائے سرو و گل
حسرت کشوں کو ساغر و مینا نہ چاہیے

جو لوگ معشوق کے وصال کے حسرت کش ہیں۔ یعنی اُن کو اس کی حسرت ہے۔ ان کو ساغر اور مینا نہیں چاہیے۔ کیونکہ یہ ساز و سامانِ عیش ہیں۔ بلکہ ان کو تو سرو اور گل کی سیر کا احساس ہونا چاہیے۔ کیونکہ سرو پر تو قمری عاشق ہے۔ اور پھول پر بلبل۔ تو گویا وہ ہر دو معشوق ہیں۔ گیا عشاق کو انہیں دیکھنا چاہیے۔ یا ساغر و مینا۔ جن کو کہ عشق سے کچھ تعلق نہیں ہے۔

(۱۶۴۹) ساقی بہار موسمِ گل ہے سرور بخش
پیماں سے ہم گزر گئے پیمانہ چاہیے

پیماں۔ اقرار۔ یا عہد۔ یہاں یہ اقرار کہ پھر کبھی شراب نہیں پئیں گے۔

حل ۔ اے ساقی موسم گل کی یہ بہار بہت نشہ یا خوشی پہنچانے والی ہے۔ ہم نے اقرار یا توبہ سے درگزر کیا ۔ یعنی اس کو چھوڑ دیا ۔ اب تو ہمیں شراب کا ایک ساغر چاہیئے ۔

(۱۶۵۰) ہاتھ پر گر ہاتھ مارے یار وقت قہقہہ
کرمک شب تاب آسا مہ پر افشانی کرے

اگر ہاتھ پر ہاتھ مارے یعنی بوجہ مسرت ۔ پر افشانی کرے ۔ یہاں مراد کرمک شب تاب یعنی جگنو کی طرح پیروں کو جھلملائے ۔ یا پروں کو پھڑ پھڑا کے چمک پیدا کرے ۔

حل ۔ اگر دوست ہنستے وقت اپنے ہاتھ پر ہاتھ مارے تو جگنو کی طرح چاند بھی جھلملانے لگ جائے ۔ یعنی وہ بھی دوست کی اس طرح کی ہنسی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے ۔

(۱۶۵۱) یارب ہمیں تو خواب میں بھی مت دکھائیو
یہ محشر خیال کہ دنیا کہیں جسے

یارب تو ہم کو یہ محشر خیال یعنی طرح طرح کے وسوسوں کا میدان جسے دنیا کہتے ہیں ۔ ہرگز خواب میں بھی نہ دکھانا ۔ گویا دنیاداری سے الگ تھلگ ہی رکھنا ۔ جیسا کہ عشاق دنیا و اہل دنیا سے بے نیاز ہوا کرتے ہیں ۔

(۱۶۵۲) بیخودی زبسکہ خاطر بے تاب ہو گئی
مژگان باز ماندہ رگِ خواب ہو گئی

مژگان باز ماندہ ۔ مراد وہ پلکیں جو کام سے رہ چکی ہیں ۔ یا بیکار ۔ رگِ خواب ۔ نیند کی رگ ۔ یا نس ۔ حل ۔ چونکہ میری بے قرار جان

(غم سے) بیخودی یعنی بے حال ہو چکی ہے ۔ میری بیکار پلکیں یہ کام دے رہی ہیں کہ وہ خواب کی نس بن گئی ہیں ۔ مراد یہ کہ عالم بیخودی میں جب پلکیں نہیں کھل سکتیں تو وہ گویا ذریعہ خواب ہیں ۔ ورنہ بے قراری میں خواب کہاں ؟

(۱۶۵۳) موج تبسم لب آلودہ مسی سے
میرے لئے تو تیغ سیاہ تاب ہو گئی

وہ جب مسی آلودہ لبوں سے مجھ پہ ہنسا ۔ تو اس کی ہنسی کی لہر میرے لئے ایک سیاہی مائل تلوار بن گئی ہے ۔ یعنی سیاہ لوہے کی بنی ہوئی ۔

(۱۶۵۴) رخسار یار کی جو ہوئی جلوہ گستری
زلف سیاہ بھی شب مہتاب ہو گئی

دوست کے چہرے نے جو اپنا جوبن دکھایا ۔ تو کالی کالی زلف بھی چاندنی رات کی طرح ہو گئی ۔ یعنی اس قدر خوش وضع دکھائی دینے لگی ۔

(۱۶۵۵) غالب زبسکہ سوکھ گئے جسم میں سرشک
آنسو کی بوند گوہر نایاب ہو گئی

چونکہ میرے بدن میں اے غالب آنسو تک خشک ہو گئے ۔ اس لئے آنسو کی ایک بوند گویا ایک نایاب موتی بن گئی ہے ۔ (آنسو کو گوہر یا موتی سے نسبت دی جاتی ہے ۔) مراد میں نے رو رو کے اپنے آپ کو اتنا خالی کر دیا ہے ۔

(۱۶۵۶) خدایا دل کہاں تک دن بصد رنج و تعب کاٹے
خم گیسو ہو شمشیر سیاہ تاب اور شب کاٹے

اے خدا میرا دل کب تک صدہا رنج و غم میں دن کاٹا کرے گا۔ اے کاش زلف کے کنڈل سے سیاہی مائیل تلوار بنے۔ اور وہ میری رات کو کاٹ دے۔ مراد دوست میرے پاس آجائے تاکہ میری شب فرقت کا خاتمہ ہو۔

(۱۶۵۷) کریں گر قدر اشکِ دیدہ عاشق خود آرایاں
صدف دندان گوہر سے بہ حسرت اپنے لب کاٹے

اگر خود آرا محبوب عاشق کی آنکھ کے آنسو کی کچھ قدر کریں تو سیپ موتی کے دانوں سے (کیونکہ دانت موتی کی مانند ہوا کرتے ہیں) حسرت کے ساتھ اپنے لب کو کاٹے۔ یعنی اُس کو یہ رنج ہو کہ بجائے قطرہ آب کے اس میں عاشق کے آنسو کی بوندکیوں نہ پڑی۔ جس سے ایک زیادہ قیمتی جوہر نمودار ہوتا۔

(۱۶۵۸) دریغا وہ مریض غم کہ فرط ناتوانی سے
بقدر یک نفس جادہ بصد رنج و تعب کاٹے

بقدر یک نفس جادہ۔ یعنی اتنی راہ سے گزرنا کہ جس قدر گذرنے کو صرف ایک سانس درکار ہو۔ مراد نہایت قلیل راہ۔

حل۔ افسوس آتا ہے اس مریض غم پر کہ جو کمزوری کی انتہا کی وجہ سے نہایت ہی قلیل راہ کو بڑی مصیبت اور تکلیف کے ساتھ کاٹے یعنی مطلق چل پھر ہی نہ سکے۔

(۱۶۵۹) یقیں ہے آدمی کو دستگاہ فقر حاصل ہو
دم تیغ توکل سے اگر پائے سبب کاٹے

اگر انسان توکل کی تلوار سے سبب کے پاؤں کاٹ دے یعنی کوئی

وسیلہ یا حیلہ ترک کرکے توکل پر دارومدار رکھے۔ تو یقین ہے کہ اس کو فقیری کی دستگاہ یا قوت حاصل ہو جائے۔ گویا فقر کی بنیاد توکل پر ہے۔

(۱۶۷۰) اسد مجھ میں ہے اُس کے بوسۂ پا کی کہاں جرأت
کہ میں نے دست و پا باہم بہ شمشیر ادب کاٹے

اسد مجھ میں اب اس کے پاؤں کا بوسہ لینے کی جراءت یا حوصلہ کہاں ہے۔ جبکہ میں نے ادب کی تلوار سے اپنے ہاتھ اور پاؤں دونوں کو ایک ساتھ کاٹ دیا۔ مراد ادب مانع ہے کہ میں اُس کو چوم لوں۔

(۱۶۷۱) دیکھ لے جوش جوانی کی ترقی بھی کہ اب
بدر کی مانند کاہش روز افزوں ہے مجھے

اس شعر کا یہ مضمون ہے ؎

بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے
جتنے زیادہ ہو گئے اُتنے ہی کم ہوئے

یعنی اب اُس جوش جوانی کی ترقی یا بے اعتدالیوں کی انتہا بھی دیکھ لے۔ کہ چودھویں کے چاند کی طرح مجھے اب ہر روز کاہش یعنی کم ہونا ہی نصیب ہو رہا ہے۔ مراد روز بروز زوال پذیر ہوں۔

(۱۶۷۲) بادشاہی کا جہاں یہ حال ہو غالب تو پھر
کیوں نہ دلی میں ہر اک ناچیز نوابی کرے

بہادر شاہ ظفر کی سلطنت صرف قلعہ کی چار دیواری تک محدود تھی اور وہاں بھی [illegible]ادے شب و روز آپس میں لڑتے جھگڑتے۔ ۔ ۔ اور مطلق العنا[illegible] کیا کرتے تھے۔ اس کے متعلق کہتا ہے۔ کہ اے غالب جہاں سلطنت کا یہ [illegible]ال ہو۔ پھر دلی میں ہر ایک ادنی شخص بھی کیوں نہ اپنے

آپ کو تو اب سمجھ کے اکڑا کرے۔

(۱۶۶۳) صبح سے معلوم آثارِ ظہورِ شام ہے

غافلو آغازِ کار آئینۂ انجام ہے

صبح جب نکلتی ہے۔ تو معلوم ہو جاتا ہے کہ اب اس کا خاتمہ بھی ہوگا۔ یعنی شام ضرور نمودار ہو کے اپنا اثر آثار دکھائیگی۔ تو اے غافلو سمجھ لو کہ اسی طرح جب کسی کام کا آغاز ہو۔ تو وہی گویا اُس کے انجام کا بھی آئینہ ہوا کرتا ہے۔ یعنی آغاز کار ہی سے اس کے انجام کا حال معلوم ہو جایا کرتا ہے۔

(۱۶۶۴) توڑ بیٹھے جبکہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا

آسماں سے بادۂ گلفام اگر برسا کرے

ہم جب شراب کا پیالہ اور ٹھلیا ہی توڑ بیٹھے تو پھر ہم کو کیا پرواہ اگر اس کے بعد آسمان سے گلرنگ شراب کی برسات ہوا کرے۔ مراد یہ کہ توبہ کرلی تو پھر مفت بھی ملے تو ہرگز نہیں پئیں گے۔

(۱۶۶۵) تا چند نازِ مسجد و بت خانہ کھینچیے

جوں شمع دل بہ خلوتِ جانانہ کھینچیے

ہم کب تک مسجد اور بت خانہ کی ناز برداری کیا کریں گے۔ اب تو دل میں ہے کہ ان کو چھوڑ کر اُس محبوب کے خلوت خانے کی شمع بننے پر دل لگائیں۔ یعنی جس طرح کسی کے ساتھ شمع کمرے میں تنہا ہوتی ہے ہم بھی اسی طرح محبوب کے ساتھ رہیں۔

(۱۶۶۶) عجز و نیاز سے تو نہ آیا وہ راہ پر

دامن کو اُس کے آج حریفانہ کھینچیے

منت اور عاجزی سے تو وہ راہ راست پر نہ آیا۔ اب یہ مناسب ہے

کہ اس کے دامن کو حریف یعنی مقابلہ کرنے والوں یا مخالفوں کی طرح کھینچ لیں۔ اور اس کو بزورِ قوت راہِ راست پر لائیں۔

(۱۶۶۷) خود نامہ بن کے جائیے اُس آشنا کے پاس

کیا فائدہ کہ منتِ بیگانہ کھینچیے

اس دوست کے پاس ہم خود ہی پیغام بن کے جائیں۔ یعنی خود اُس کے پاس جا کے زبانی پیغام دیں۔ کیا فائدہ کہ کسی غیر کا احسان اُٹھائیں۔ یعنی اُس کو دوست کے پاس بھیجیں۔

(۱۶۶۸) ہے ذوقِ گریہ عزمِ سفر کیجئے اسدؔ

رختِ جنوں بہ سیل بہ ویرانہ کھینچیے

اے اسد رونے کا شوق اب سفر کے عرض کریں۔ یعنی اُس کی نذر کر دیں۔ مراد گھر بار چھوڑ کے باہر نکلیں۔ اور سفر میں رو یا کریں۔ گویا اس رختِ جنوں (یا دیوانگی کا اسباب یہاں مراد ذوقِ گریہ) کو سیل بہ ویرانہ کھینچیے۔ یعنی کسی جنگل کے سیلاب میں بہا دیجئے۔ حاصل شعر یہ کہ گھر سے نکل کر سفر کریں اور خوب رویا کریں۔

(۱۶۶۹) ہے مشقِ وفا جانتے ہیں لغزشِ پا تک

اے شمع تجھے دعوئ ثابت قدمی ہے

لغزشِ پا تک جانتے ہیں۔ مراد ہم عشق میں لغزش کرکے بھی تجربہ کر چکے ہیں۔ صرف وفا ہی کو نہیں جانتے۔

حل شعر۔ اے شمع تجھ کو تو استقلال و استقامت ہی پر ناز ہے اور ہم عشق میں خوب مشقِ وفا کر چکے ہیں۔ بلکہ لغزشِ پا تک یعنی بیوفائی بھی کرکے تجربہ کار بن چکے ہیں۔ (لہٰذا اے شمع تو ہمارے سامنے

کیا دعوے کرتی ہے۔

(۱۷۷۰) واماندۂ ذوقِ طرب وصل نہیں ہوں
اے حسرتِ بسیار تمنا کی کمی ہے

میں وصل کی خوشی کی لذت سے واماندہ یعنی مایوس و عاجز نہیں رہ گیا ہوں - بلکہ اے حسرتِ بسیار یعنی اے رنج جو اس قدر کا ہے کہ امید وصل پر بھی غالب ہے۔ یہ تیری ہی بدولت "تمنا کی کمی" ہے یعنی میرے دل میں آرزوئے وصل تک ماند پڑ گئی ہے۔

(۱۷۷۱) نہ حیرت چشم ساقی کی نہ صحبت دورِ ساغر کی
مری محفل میں غالبؔ گردشِ افلاک باقی ہے

نہ تو ساقی کی آنکھ کی حیرت ہے۔ یعنی حیرت سے اُس کی آنکھ میری محفل میں پھرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اور نہ پیالۂ شراب کی گردش سے مجھے اپنی محفل میں صحبت حاصل ہے۔ (گویا نہ ساقی ہے نہ شراب صرف میری محفل میں اے غالب آسمان کی گردش ہی باقی رہ گئی ہے (یہاں گردشِ افلاک گردشِ ساغر اور گردشِ چشم ساقی کو آپس میں نسبت دی گئی ہے)

مندرجہ ذیل اشعارِ غالب مولانا حسرت موہانی کی شرح غالب کے ضمیمہ میں سے منتخب ہوئے۔

(۱۷۷۲) لطفِ نظارۂ قاتل دمِ بسمل آئے
جان جائے تو بلا سے پہ کہیں دل آئے

بلا سے جان جاتی ہے تو جائے۔ کہیں نہ کہیں مجھ کو عاشق ہو جانا

چاہیئے۔ تاکہ وہ معشوق قاتل مجھے قتل کرے۔ تو اُس وقت وہ قاتل مجھے اپنا نظارہ تو دکھائیگا۔ (پس خواہ قتل ہو جاؤں۔ مجھے ایک بار اُس کا دیکھنا منظور ہے)

(۱۷۷۳) اُن کو کیا علم کہ کشتی پہ مری کیا گذری
دوست جو ساتھ مرے تالبِ ساحل آئے

جو دوست دریا کے ساحل تک میرے ساتھ آئے تھے۔ اور مجھ کو کشتی میں چھوڑ گئے تھے۔ اُن کو کیا خبر کہ مجھ پر کشتی میں کیا کچھ گذرا۔

(۱۷۷۴) وہ نہیں ہم کہ چلے جائیں حرم کو اے شیخ
ساتھ حجاج کے اکثر کئی منزل آئے

اے شیخ ہم وہ نہیں ہیں۔ کہ تیری طرح حرم یا خانہ کعبہ کو تنہا چلے جائیں۔ ہم تو حاجیوں کے ساتھ تکلیفیں اُٹھانے کو کئی منزل اکثر اوقات آئے یعنی ان کے ہمراہ اکثر سفر کئے۔

(۱۷۷۵) آئیں جس بزم میں وہ لوگ پکار اُٹھتے ہیں
لو وہ برہمزنِ ہنگامۂ محفل آئے

ہم جس محفل میں آئیں وہ لوگ پکار اُٹھتے ہیں کہ لو وہ رونق محفل کو مٹا دینے والے آ گئے۔

(۱۷۷۶) دیدۂ خونبار ہے مدت سے ولے آج ندیم
دل کے ٹکڑے بھی کئی خون کے شامل آئے

اے ندیم یعنی دوست میری آنکھ مدت سے خون بہاتی ہے۔ مگر آج تو کئی ٹکڑے دل کے بھی خون سے ملکر باہر نکل آئے۔

(۱۶۷۷) سامنا حور و پری نے نہ کیا ہے نہ کریں
عکس تیرا ہی مگر تیرے مقابل آئے

حور و پری تیرے مقابلے کو سامنے نہیں آتے ۔ اور نہ کبھی آئیں گے ہاں شاید تیرا عکس ہی تیرے مقابلے کو آ جائے ۔ مراد یہ کہ تو آپ ہی اپنی نظیر ہے ۔

(۱۶۷۸) اب ہے دلی کی طرف کوچ ہمارا غالبؔ
آج ہم حضرتِ نواب سے بھی مل آئے

آج ہم نواب صاحب سے بھی مل آئے (غالباً نواب رامپور سے مراد ہے) اب غالب ہمارا کوچ دہلی کی طرف ہے ۔

(۱۶۷۹) میں ہوں مشتاقِ جفا مجھ پہ جفا اور سہی
تم ہو بیداد سے خوش اس سے سوا اور سہی

میں ظلم کا شائق ہوں ۔ مجھ پر اور بھی ظلم سہی ۔ اسی طرح تم ظلم کرکے خوش ہوتے ہو تو اس سے بھی زیادہ جفا کیجئے ۔

(۱۶۸۰) تم ہو بت پھر تمھیں پندارِ خدائی کیوں ہے
تم خداوند ہی کہلاؤ خدا اور سہی

تم تو ایک بت ہو کچھ خدا نہیں ہو ۔ پھر تم میں پندارِ خدائی یعنی اس قدر غرور و تکبر کیوں ہے ۔ کہ خدا بنا چاہتے ہو ۔ (حالانکہ خدا کہاں اور بت کہاں ۔) اچھا تم خداوند یا آقا ہی کہلاؤ ۔ اور خدا کوئی اور سہی ۔ یعنی خدا تو خدا تم خداوند سہی ۔ اس میں بھی تو خدائی کی سی عظمت پائی جاتی ہے ۔

(۱۶۸۱) خلد میں گئے تو دوزخ بھی ملا لیں یارب
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

یا خدا اگر حکم ہو تو بہشت میں دوزخ بھی ملا دیا جاوے ۔ تاکہ سیر کے لئے کچھ تھوڑا سا میدان اور وسیع ہو جائے ۔

(۱۶۸۲) ہم سے غالبؔ یہ علائی نے غزل لکھوائی
ایک بیداد گرِ رنج فزا اور سہی

علائی غالب کا دوست تھا ۔ اسی کی فرمائش پر غالب نے یہ غزل لکھی تھی ۔ لہذا کہتا ہے ۔ کہ غالب ہم سے علائی نے یہ غزل لکھوائی ہے ۔ اچھا ہمارے رنج کو بڑھانے والا ایک اور ظالم بھی سہی ۔

(۱۶۸۳) وقت اس افتادہ کا خوش جو قناعت سے اسدؔ
نقشِ پائے مور کو تختِ سلیمانی کرے

اس افتادہ یعنی عاجز اور حقیر انسان کا وقت ہمیشہ خوش ہوتا ہے یا خوشی سے اس کا وقت گزرے جو کہ اے اسد اپنی قناعت کے سبب چیونٹی کے پاؤں کے نقش کو اپنے لئے تختِ سلیمان تصور کر لے ۔

(۱۶۸۴) اے سرِ شوریدہ نازِ عشق و پاسِ آبرو
یک طرف سودا و یک سو منتِ دستار ہے

اے میرے دیوانے سر تجھ کو نازِ عشق بھی ہے ۔ یعنی عشق کے ناز یا تکلیفیں بھی برداشت کرتا ہے ۔ اور اپنی عزت کا خیال بھی ہے ۔ لہذا ایک طرف تو عشق کی بدولت تو مبتلائے جنون ہے ۔ اور دوسری طرف تو سر پہ پگڑی باندھ کے پگڑی کا احسان اٹھا رہا ہے ۔ (لوجہ پاسِ آبرو) حالانکہ عشق میں انسان کو دیوانہ ہو کے پگڑی کا کچھ خیال نہیں کرنا چاہئے ۔

(۱۶۸۵) وصل میں دل انتظارِ طرفہ رکھتا ہے مگر
فتنہ تاراجِ تمنا کے لئے درکار ہے

طرفہ - غیر معمولی طور پر - فتنہ کے حقیقی معنی آزمانا ہے - تاراجِ تمنا سے یہاں مراد تمنا کو ملیا میٹ کر دینا - دوست کا خیال ہی ہٹا دینا -

حل - میرا دل اُس کے وصل میں غیر معمولی طور پر انتظار محسوس کرتا ہے - لیکن تمنا کے ملیا میٹ کر دینے کو (جو دوست کی دلی منشا ہے) فتنہ یعنی میری آزمائش درکار ہے - مطلب یہ کہ وہ دوست مجھے سخت انتظار دے کے آزماتا ہے - کہ تمنا ہی وصل کی میرے دل سے جاتی رہے -

(۱۶۸۶) عزیزو وصلِ ذکرِ غیر سے مجھ کو نہ بہلاؤ
کہ یاں افسونِ خواب افسانۂ خوابِ زلیخا ہے

عزیز دوستو! غیر کے وصل کا تذکرہ کر کے مجھے بہلانے کی کوشش نہ کرو - کہ یہاں (اس سے پہلے ہی) زلیخا کی خواب کا افسانہ ایسا افسون یا جادو ہے - کہ جس کو سُنکر مجھے نیند آ جاتی ہے - (خواب زلیخا - یوسف کا خواب میں دیکھنا - لفظ عزیز یہاں زلیخا کی رعایت سے مستعمل ہوا ہے کیونکہ العزیز زلیخا کا خاوند تھا -)

(۱۶۸۷) مجھے شب ہائے تاریکِ فراق شعلہ رویاں ہیں
چراغِ خانۂ دل سوزشِ داغِ تمنا ہے

ان شعلہ رو معشوقوں کے فراق کی کالی کالی راتوں میں مجھے جو غم پہنچا ہے - اور اس سے داغِ تمنا یعنی امید وصال کا جو داغ نصیب ہوا ہے - اُس کی سوزش ہی میرے دل کے تاریک گھر کا چراغ بنگئی ہے -

(۱۶۸۸) تیرے نوکر تیرے در پر اسد کو ذبح کرتے ہیں
ستمگر ناخدا ترس آشنا کُش ماجرا کیا ہے

اے ناخدا ترس - ظالم - دوستوں کو مارنے والے - تیرے نوکر اسد تیرے دروازے ہی پر ذبح کئے دیتے ہیں - یہ کیا ماجرا ہے - (کیا تو نے اپنے نوکروں کو ایسا کرنے کا حکم دیا ہے -)

(۱۶۸۹) عرضِ سرشک پر ہے فضائے زمانہ تنگ
صحرا کہاں کہ دعوتِ دریا کرے کوئی

زمانہ کی فضا یعنی زمانہ کے حالات عرضِ سرشک یا آنسو بہانے پر ے تنگ ہوتے ہیں - یعنی یہ بات گوارا نہیں کرتے - آہ! صحرا کہاں وہ اس دریا کی یعنی ہمارے آنسوؤں کی دعوت کرے - مطلب یہ کہ ہمارے نسو دریا ہیں - کہ جن کے لئے صحرا درکار ہے -

(۱۶۹۰) پیامِ تعزیت پیدا ہے اندازِ عیادت سے
شبِ ماتم تہِ دامانِ دودِ شمعِ بالیں ہے

پیام تعزیت - یعنی موت کا پیغام - عیادت - کسی کے سرہانے کھڑا اُس کی بیمار پُرسی کرنا -

حل - ہمارے سرہانے جو شمع ہے - اُس کے دھوئیں کے دامن لے تلے شب ماتم یعنی غم کی رات جو سیاہ ہوا کرتی ہے - ٹھکانہ کئے ہوئے ہے - یعنی ہر دئے کے تلے جو اندھیرا ہوا کرتا ہے - یہاں مصنف اس کو عاشق شبِ ماتم قرار دیتا ہے - لہذا شمع بالیں جس سے عیادت کے آثار نمایاں ہیں - اسی شمع بالیں کے تلے ہماری شب ماتم بھی موجود ہے - جس سے ہماری ت کا پیام صاف ظاہر ہوتا ہے -

(۱۶۹۱) پرافشاں شرم ہے باوصفِ شوخی اہتمام اس کا
نگیں میں جوں شرارِ سنگ ناپیدا ہے نام اس کا

باوجودیکہ وہ محبوب اس قدر شوخ ہے۔ مگر اس کا اہتمام یعنی سب کاروبار رہن شرم ہے۔ یعنی اس پر خاموشی اور پوشیدگی چھائی ہے جس طرح کہ نگینہ میں شرارِ سنگ چھپا ہوتا ہے۔ اور اس کا نام ونشان نگینے سے ظاہر نہیں ہوتا۔ مراد یہ کہ خدا اگرچہ اس قدر ظاہر ہو رہا ہے۔ پھر بھی وہ اس طرح چھپا ہوا ہے۔ جیسے نگینے میں شرارہ۔

(۱۶۹۲) مسی آلودہ ہے مُہر نوازش نامہ ظاہر ہے
کہ داغ آرزوئے بوسہ دیتا ہے پیام اُس کا

اس کے نوازش نامے یعنی خط کی مہر پر کچھ مسی ملی ہوئی ہے۔ اور اس سے سیاہ داغ اُس پر پڑ گیا ہے۔ جس سے ظاہر ہے۔ کہ اس کا خط ہمارے لئے بوسے کی خواہش کا داغ اپنے ساتھ لایا ہے۔ مراد یہ کہ اُس کے تو خط ہی سے ظاہر ہے کہ وہ بوسے کے متعلق ہمیں ناامید کیا چاہتا ہے۔

(۱۶۹۳) بامیدِ نگاہِ خاص ہوں محمل کشِ حسرت
مبادا ہو عنانگیرِ تغافل لطفِ عام اس کا

میں اُس ایک نگاہِ خاص کی امید پر یہ سب رنج اٹھا رہا ہوں یعنی محمل کشِ حسرت ہوں۔ کہیں اس کا لطفِ عام تغافل کا عنانگیر نہ بن جائے یعنی وہ دوست ایک نظرِ خاص مجھ پر کرنے کے بجائے مجھ سے غافل نہ ہو جائے۔

(۱۶۹۴) شب کہ ذوقِ گفتگو سے تیرے دل بیتاب تھا
شوخیِ وحشت سے افسانہ فسونِ خواب تھا

رات کو تیری باتوں کی لذت سے دل بیتاب ہو رہا تھا۔ اور اس وحشت یعنی ہماری بیقراری کی شوخی یعنی تیز تاثیر کے سبب ہمارے سلانے کو جو افسانہ سنایا گیا تھا، وہ فسونِ خواب مراد خواب اور طلسم بن گیا تھا یعنی اس قدر بے خوابی اور بیقراری چھائی ہوئی تھی۔

(۱۶۹۵) واں ہجومِ نغمہائے سازِ عشرت تھا اسدؔ
ناخنِ غم یاں سرِ تارِ نفس مضراب تھا

اے اسد دوست کے ہاں عیش وعشرت کے باجے کے راگوں کی کثرت تھی۔ اور یہاں غم کا ناخن ہمارے سانس کے تار کا گویا مضراب بن گیا تھا۔ (مضراب ستار بجانے کا آوزار)

(۱۶۹۶) معزولیِ تپش ہوئی افراطِ انتظار
چشمِ کشودہ حلقۂ بیرونِ در ہے آج

معزولیِ تپش۔ یعنی تڑپنے پر معزول یا موقوف ہو گئی۔ چشمِ کشودہ۔ کھلی آنکھ یا بیدار آنکھ۔ جو کسی کے انتظار میں کھلی رہا کرتی ہے۔

مطلب۔ افراطِ انتظار یعنی انتظار کی انتہائی حالت۔ موقوف بر اضطراب وتپشِ دل ہو گئی۔ جس سے ہماری منتظر آنکھ گویا حلقۂ بیرونِ در بن گئی۔ یعنی کسی کے انتظار میں دروازے پر بیٹھے دیکھا کرتے ہیں۔ سو ہماری آنکھیں اس انتظار میں اپنے دروازے ہی کی بیرونی زنجیر بن گئی ہیں۔

(۱۶۹۷) مے کشی کو نہ سمجھ بے حاصل
بادہ غالبؔ عرقِ بید نہیں

اے غالب میخواری کو بے حاصل یعنی بے نتیجہ خیال نہ کر۔ یہ کوئی

بید یعنی بید مجنوں کے پیڑ کا عرق نہیں ہے، کہ جس سے کچھ نتیجہ (طبی یا غیر طبی) حاصل نہیں ہوتا۔ حالانکہ شراب بااختلاف نیک و بد ہرگز نہیں رہی۔ بید مجنوں کو ویسے بھی کوئی پھل نہیں لگتا)

(۱۶۹۸) ظاہر ہیں مری شکل سے افسوس کے نشاں
خارِ الم سے پشت بدنداں گزیدہ ہوں

پشت بدنداں گزیدن - ایک فارسی محاورہ ہے۔ جس کا مفہوم پچھتانا اور افسوس کرنا ہے۔

حل - میری تو شکل و صورت ہی سے غم کے نشان ظاہر ہیں چنانچہ میں اپنے خارِ الم کی وجہ سے یعنی غم کی بدولت پچھتاتا اور افسوس کرتا ہوں۔

(۱۶۹۹) ہوں گرمیٔ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں

میں ایک خیالی خوشی کے تصور کی گرمی کی بدولت خوشی سے گا رہا ہوں۔ گویا کہ ایک ایسے باغ کی میں بلبل ہوں کہ جو ابھی پیدا ہی نہیں ہوا ہے۔ یعنی میں ایک خیالی باغ سے دل میں خوش ہو رہا ہوں۔

(۱۷۰۰) ابر روتا ہے کہ بزمِ طرب آمادہ کرو
برق ہنستی ہے کہ فرصت کوئی دم ہے ہم کو

ابر تو گرجکر گویا روتا ہے۔ اس بات کے لئے کہ خوشی کی محفل قایم کرو۔ یعنی برسات ہو رہی ہے خوب رنگ رلیاں مناؤ۔ مگر برق اس بات پر ہنستی ہے۔ کہ انسان کی زندگی کی فرصت تو اس قدر کم ہے وہ عیش کیا منائیگا۔

(۱۷۰۱) ہندوستان سایۂ گل پائے تخت تھا
جاہ و جلالِ عہدِ وصالِ بتاں نہ پوچھ

سایۂ گل پائے تخت تھا۔ یعنی دار السلطنت کے پھول کا سایہ تھا مراد پائے تخت سے عیش و آرام۔ اور فیض حاصل کرتا تھا۔

حل شعر - تمام ہندوستان اپنے پائے تخت یعنی دلّی سے عیش و آرام اور فیض حاصل کرتا تھا۔ لہٰذا اس عہد وصال بتاں یعنی خوشی کے زمانے کے جاہ و جلال یا علو مرتبہ کا کچھ حال نہ پوچھ۔

(۱۷۰۲) ہر داغِ تازہ یکدل داغِ انتظار ہے
عرضِ فضائے سینۂ دردِ امتحاں نہ پوچھ

ہمارا ہر تازہ داغ گویا تمام تر انتظار کا داغ ہے۔ لہٰذا ہمارے درد امتحان سینہ کے میدان کی وسعت کا کچھ حال نہ پوچھ۔ (درد امتحاں یعنی درد پہنچا کے آزمائش کی جا رہی ہے کہ میں کس قدر درد برداشت کر سکتا ہوں)۔

(۱۷۰۳) ہجومِ ریزشِ خوں کے سبب رنگ اڑ نہیں سکتا
حنائے پنجۂ صیاد مرغِ رشتہ بر پا ہے

ہجوم ریزش خوں سے مراد۔ صیاد کا بکثرت قتل و خون کرنا۔ یا خون بہانا۔

حل۔ صیاد قاتل کے ہاتھوں پر جو مہندی لگی ہے۔ اس کا رنگ اس لئے نہیں اڑ سکتا۔ کہ وہ بکثرت خون بہاتا۔ اور وہ خون اس کے ہاتھوں کو لگ جاتا ہے۔ تاکہ وہ سرخ رہیں۔ لہٰذا صیاد کے ہاتھ کی مہندی ایک ایسا مرغ ہے کہ جس کے پاؤں دھاگے میں بندھے ہیں۔ تاکہ

وہ اڑ نہ سکے۔ (رنگِ حنا سے مرغ کو اس لئے مشابہ کیا ہے۔ کہ مہندی کا رنگ بھی اڑ جایا کرتا ہے۔ اور مرغ بھی)

(۱۴۰۴) بہا ہے یہاں تک آنکھوں میں غبارِ کلفتِ خاطر
کہ چشمِ تر میں ہر اک پارۂ دل پائے در گل ہے

میرے دل کے رنج کا غبار اس قدر آنکھوں میں بہہ رہا ہے۔ کہ میری روتی ہوئی آنکھ میں جو آنسو بھر گئے ہیں۔ وہ اس غبارِ کلفت میں مل کے گویا گل یعنی کیچڑ بن گئے ہیں۔ اور جب میرے آنسوؤں کے ساتھ ایک ٹکڑا دل کا بھی باہر آتا ہے۔ تو وہ اس کیچڑ میں پائے در گل ہو جاتا ہے۔ یعنی اس کا پاؤں کیچڑ میں بھر جاتا ہے۔

(۱۴۰۵) حیران ہوں شوخیٔ رگِ یاقوت دیکھ کر
یاں ہے کہ صحبتِ خس و آتش برار ہے

صحبت برار شدن ایک فارسی محاورہ ہے۔ جس کے معنی ہیں۔ باہم صحبت راست آنا۔

حلِ شعر۔ یاقوت کی رگ کی شوخی یعنی اس کی لال لال رنگت دیکھ کر حیران ہوں۔ کہ کس طرح ایک پتھر کی رگ سے ایسی شوخ رنگت ٹپک رہی ہے۔ یہاں ہے۔ یعنی اس موقع کے لئے کہہ سکتے ہیں۔ کہ گویا صحبتِ خس و آتش برار ہے۔ یعنی گھانس پھونس کی آگ سے صحبت راس آگئی ہے۔

قصائد و قطعات و رباعیات

قصیدہ حیدری بہ تمہید بہار مغفرت

(۱۴۰۶) ساز یک ذرہ نہیں فیضِ چمن سے بیکار
سایۂ لالۂ بے داغ سویدائے بہار

(۱۴۰۷) مستیِ بادِ صبا سے ہے بعرضِ سبزہ
ریزۂ شیشۂ مے جوہرِ تیغِ کہسار

(۱۴۰۸) سبز ہے جامِ زمرد کی طرح داغِ پلنگ
تازہ ہے ریشۂ نارنج صفت روئے شرار

(۱۴۰۹) مستیِ ابر سے گلچیں طرب ہے حسرت
کہ اس آغوش میں ممکن ہے دو عالم کا فشار

(۱۴۱۰) کوہ و صحرا ہمہ معموریِ شوقِ بلبل
راہ خوابیدہ ہوئی خندۂ گل سے بیدار

(۱۴۱۱) سونپے ہے فیض ہوا صورتِ مژگانِ یتیم
سرنوشتِ دو جہاں ابر بیک سطرِ غبار

(۱۴۱۲) کاٹ کر پھینکئے ناخن تو باندازِ ہلال
قوتِ نامیہ اُس کو بھی نہ چھوڑے بیکار

(۱۶۱۳) کفِ ہر خاک بگردوں شدہ قمری پرواز
دامِ ہر کاغذِ آتش زدہ طاؤس شکار

میکدے میں ہو اگر آرزوئے گلچینی (۱۶۱۴)
بھول جا یک قدحِ بادہ بطاقِ گلزار

(۱۶۱۵) موجِ گل ڈھونڈھ بہ خلوت کدۂ غنچۂ باغ
گم کرے گوشۂ میخانہ میں گر تو دستار

کھینچے گر مانیِ اندیشہ چمن کی تصویر (۱۶۱۶)
سبز مثلِ خطِ نوخیز ہو خطِ پرکار

(۱۶۱۷) لعل سے کی ہے پئے زمزمۂ مدحتِ شاہ
طوطیِ سبزۂ کہسار نے پیدا منقار

وہ شہنشاہ کہ جس کی پئے تعمیرِ اسل (۱۶۱۸)
چشمِ جبریل ہوئی قالبِ خشتِ دیوار

(۱۶۱۹) فلک العرش ہجومِ خمِ دوشِ مزدور
رشتۂ فیضِ ازل سازِ طنابِ معمار

سبزۂ نُہ چمن و یک خطِ پشتِ لبِ بام (۱۶۲۰)
رفعتِ ہمتِ صد عارف و یک اوجِ حصار

(۱۶۲۱) واں کی خاشاک سے حاصل ہو جسے یک پرِ کاہ
وہ رہے مروحۂ بالِ پری سے بیزار

خاکِ صحرائے نجف جوہرِ سیرِ عرفا (۱۶۲۲)
چشمِ نقشِ قدم آئینۂ بختِ بیدار

(۱۶۲۳) ذرہ اس گرد کا خورشید کو آئینۂ ناز
گرد اس دشت کی امید کو احرامِ بہار

آفرینش کو وہاں سے طلبِ مستیِ ناز (۱۶۲۴)
عرضِ خمیازۂ ایجاد ہے ہر موجِ غبار

(۱۶۰۶) چمن میں ایک ذرہ تک بھی ایسا نہیں ہے۔ کہ جس کا س
یعنی بناوٹ (باوجود) چمن کے فیضان کی بدولت بیکار ثابت ہو۔ مثا
بے داغ گل لالہ کا سایہ (جو بظاہر بے مصرف نظر آتا ہے۔) در حقیقت
وہ بھی دل بہار کا سویدا ہے۔ یعنی سایۂ گل لالہ جب زمین پر پڑتا ہے
تو اس قدر خوشنما دکھائی دیتا ہے۔ کہ گویا یہ بھی موسم بہار کا کوئی عنص
جزو ہے۔ یعنی اس کا سویدا ہے۔ اور سویدے سے بہار کی کیفیت کا ا
ہوتا ہے۔ کیونکہ انسان کے دل پر سویدے کا نشان جذبات انسانی
سرچشمہ خیال کیا گیا ہے۔ ایسا ہی سویدائے بہار ہے یعنی سایہ سے
باغ کے پھولوں یا پودوں سے نمودار ہو کیفیت بہار آشکارا ہوتی
لہٰذا یہ بیکار نہیں ہوتا۔

(۱۶۰۷) بادِ صبا کی مستی کی وجہ سے تیغ کہسار یعنی قلعہ کوہ
پہاڑ کا نکلا ہوا سرا بھی کہ جو بعرض سبزہ ہے۔ یعنی باغ کی حدود سح
کے اندر ہے۔ وہ شیشہ شراب کا ریزہ بن گیا ہے۔ مطلب یہ
قلعہ کوہ تک بھی بادِ صبا کی مستی سے متاثر ہو گیا ہے۔ (چونکہ شی
کی کرچیں یعنی ریزے سبز بھی ہوا کرتے ہیں۔ لہٰذا قلعہ کوہ کو وہ س
نسبت دی۔)

(۱۷۰۸) بہار کے اثر سے چیتے کا سیاہ داغ جام زمرد کی طرح سبز ہوگیا ہے۔ اور پتھر سے جو شرارہ نکلا کرتا ہے۔ نارنگی کے ریشہ کی طرح اُس کا منہ (باوجود آتشی ہونے کے) شاداب و تر و تازہ ہے۔

(۱۷۰۹) ابر مست ہر طرف چھایا ہے۔ اور اس ابر میں کیا عالمگیر ہے۔ بوجہ بدمستی کے دوسروں کو آغوش میں لے کے بھینچنے کی بھی ہوس ہے۔ (جیساکہ نشئی آدمی سب سے گلے لپٹ کر اُن سے ہم آغوش ہونا چاہتا ہے) لہٰذا ممکن ہے کہ یہ ابر مست اپنے آغوش میں ہر دو عالم کو لے سکے اس قدر فشار پیدا کرے۔ کہ ساری حسرت نکل جائے ناچار ایسا ہوا ہے کہ اب حسرت بھی خوشی کی گلچینی کر رہی ہے۔

(۱۷۱۰) معموری، آبادی۔ شوقِ بلبل۔ مراد گل و گلستاں۔ جن سے بلبل کو ذوق و شوق ہوتا ہے۔ راہ خوابیدہ۔ سنسان راہ۔ خندہ گل۔ پھولوں کا کھلنا۔ بیدار ہوئے۔ یہاں مراد بارونق ہوگئے۔
حل شعر۔ پہاڑ اور جنگل سب گل و گلستاں سے آباد ہوگئے۔ ہر سنسان راہ کھلے ہوئے پھولوں سے بارونق ہوگئی۔

(۱۷۱۱) صورتِ مژگانِ یتیم۔ یعنی جس طرح یتیم بچے کی مژگاں وقت رونے کے تر رہتی ہے۔ سرنوشتِ دو جہان ابر۔ یعنی بہت پھیلے ہوئے ابر کی قسمت۔ مراد ایک وسیع بادل جس طرح بہت مرطوب کرتا ہے۔ سطر غبار۔ گرد کی ایک لکیر۔ یعنی تھوڑی سی گرد۔
حل شعر۔ فیض ہوا ایک سطر باغ یعنی تھوڑی سی گرد کو بھی جہان ابر کی قیمت۔ بہ صورت مژگان یتیم سونپے ہے۔ مراد یہ کہ ہوا اس قدر مرطوب ہے۔ کہ ایک تھوڑی سی خشک مٹی کو بھی گہر سے

بادلوں کی قسمت دے کے اس کو اتنا مرطوب کر دیتی ہے۔ کہ وہ گریہ یتیم کی طرح تر اور جل تھل ہو جاتی ہے۔

(۱۷۱۲) اگر ناخن کاٹ کر پھینکئے۔ تو وہ بھی کی صورت سے بڑھنے لگتا ہے۔ اور وہ بدر بن جاتا ہے۔ کیونکہ قوت بالیدگی اُس کو بیکار نہیں رہنے دیتی۔

(۱۷۱۳) ہر مٹھی بھر خاک جب آسمان کی طرف اڑتی ہے۔ تو قمری پرواز ہو جاتی ہے۔ یعنی ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ گویا وہ قمری ہے جو اُڑ رہی ہے۔ اسی طرح ہر جلے ہوئے کاغذ کے گول گول ٹکڑے ایک ایسا جال بن جاتے ہیں۔ کہ جو طاؤس شکار ہیں۔ یعنی مور کو شکار کرتے ہیں۔ مراد یہ کہ گرد اور مٹی اور جلے ہوئے کاغذ بھی کہ بیجان اشیا ہیں۔ فیض ہوا سے جاندار ہو جاتے ہیں۔

(۱۷۱۴) اگر میخانے میں تجھے پھول چننے کی آرزو ہے۔ تو ایک شراب کا پیمانہ باغ کے طاق میں کہیں رکھ کر بھول جا۔ (بس اس سے ہزارہا پھول پیدا ہو جائیں گے)

(۱۷۱۵) اگر تیری دستار میکدہ میں گم ہو جائے۔ تو پھر تو اسکو بطور دستار نہ ڈھونڈھ بلکہ موج گل سمجھ کر غنچۂ باغ کے خلوت کدے میں تلاش کر۔ (یہاں غنچہ باغ میں اضافت بیانیہ ہے۔ مراد غنچہ کو بطور باغ تصور کر کے ڈھونڈ۔ پگڑی لمبی ہوتی ہے۔ اس لئے موج گل سے مشابہ کیا ہے)

(۱۷۱۶) اگر خیال کا مانی مصور باغ کی تصویر کھینچے۔ تو اُس کی

پرکار سے کھنچا ہوا خط بھی کسی نوخیز کے خط کی طرح سبز دکھائی دیگا۔ (گویا سقدر سبزہ کا زور ہے)

(۱۷، ۱۷) سبزہ کوہ کو ایک طوطی قرار دے کے کہتا ہے۔ کہ اس طوطی نے پہاڑ کے لعل سے اپنی چونچ بنالی ہے۔ تاکہ وہ بادشاہ کی تعریف کا ترانہ گائے۔ (طوطی کی چونچ لعل کی طرح لال ہوتی ہے۔)

(۱۸، ۱۷) وہ (عالی مرتبہ) شہنشاہ کہ جس کی محل سرا کی تعمیر دیوار کے لئے جو اینٹیں مستعمل ہوئیں۔ ان کا سانچہ جبرئیل کی آنکھیں ہیں۔ مراد یہ کہ ہر اینٹ جبرئیل کی آنکھ سے اس لئے تیار کرائی گئی ہے۔
کہ اس پر جبرئیل کی نظر توجہ رہے۔ اور جب کوئی دشمن اس محل سرا کو گرانے لگے تو وہ اس دشمن کی روح کو قبض کرلے۔ (مگر یہاں محل سرا کا مفہوم سرائے نجف یا روضہ حضرت علی ہے۔ جن کو شہنشاہ دو جہاں قرار دیا ہے۔)

(۱۹، ۱۷) فلک العرش۔ ساتواں آسمان۔ ہجوم۔ یہاں مراد کسی پر چھا جانا۔ ہجوم کرنا یا جمع ہونا۔ خم دوش مزدور۔ مزدور کے کندھے پر پانی یا عمارت کا مصالحہ لانے کا مٹکا۔ ساز طناب معمار۔ معمار کی ڈوری کا بناؤ۔ (جس سے دیوار کی سیدھ نکالتے ہیں۔) ساز و سامان ازل۔ مراد ہمیشہ سے۔

حل شعر۔ تیرے مزدور کے کندھے پر جو مٹکا (تعمیر محل سرا کے لئے) ہے۔ وہ مٹکا نہیں۔ در اصل فلک ہفتم اس پر ہجوم کرکے آپڑا ہے یعنی چھایا ہوا ہے۔ تاکہ تیری محل سرا پر کوئی آسمانی آفت نازل نہ ہو۔ اور رشتہ فیض ازل یعنی ہمیشہ سے چلے آنے کے فیض کا دھاگہ تیرے

معمار کی ڈوری کا سامان ہے۔ یعنی تیری محل سرا ازلی اور ہمیشہ سے چلی آتی ہے۔ اسی لئے اس کی سیدھ رشتہ فیض ازل سے درست کی گئی ہے۔

(۲۰، ۱۷) سبزہ نو چمن سے مراد نو آسمان کی سبز رنگت۔ (و) کو یہاں مساوات کے فائدے کے لئے استعمال کیا ہے۔ خط پشت لب بام۔ یہاں مراد بادشاہ کی محل سرا کے ایک جانب کی منڈیر کا خط۔ جو غالبا سبز رنگ کا ہوگا۔ رفعت ہمت صد عارف۔ صدہا عارفوں کی ہمت کی بلندی۔ کیونکہ عارف لوگ زہد و تقوی میں بڑی ہمت سے کام لیتے ہیں۔ اوج حصار۔ قلعہ کی بلندی۔

حل شعر۔ نو آسمان کا سبز رنگ اور تیری محل سرا کی ایک طرف کی منڈیر کا سبز سبز خط دونوں برابر ہیں۔ اسی طرح سینکڑوں عارفوں کی بلندی ہمت اور تیری محل سرا کی بلندی برابر ہیں۔

(۲۱، ۱۷) مروحہ۔ پنکھا۔ مروحہ بال پری۔ یعنی پری کے پرواز سے پنکھا جھلا جانا۔

حل شعر۔ واں (مراد بادشاہ کی محل سرا) کی خس و خاشاک سے جسے ایک تنکا گھانس کا بھی میسر آئے۔ وہ پرواز پری کے پنکھے سے نفرت کرنے لگے۔

(۲۲، ۱۷) زائران نجف کے نقش قدم کی آنکھیں وہ آئینہ ہے کہ جس میں زائروں کا بخت بیدار دکھائی دیتا ہے۔ اور اس آئینہ کا جوہر وہ خاک صحرائے نجف ہے۔ کہ جو سیر عرفا یعنی عارفانہ زائروں کے سفر زیارت کے وقت ان کے پاؤں کے نیچے روندی جاتی ہے۔ (مراد یہ کہ زیارت نجف سے زائروں کا نصیبہ جاگ اٹھتا ہے)

(۱۶۲۳) اُس گرد سے مراد خاک روضۂ نجف ۔ اور اس دشت کی گرد کا مفہوم خاک دشت نجف ہے۔

حل شعر۔ روضۂ نجف کی خاک کا ایک ایک ذرہ ذرہ آفتاب کے لئے باعث فخر ہے۔ اور وہ دشت نجف کی مٹی زائروں کی امید کے لئے گویا احرام بہار ہے۔ یعنی وہ اس مٹی کو پاس رکھتے ہیں۔ تو اس سے امید مغفرت کی بہار یا اس کی خوشی کی بنیاد قایم ہوتی ہے۔

(۱۶۲۴) آفرینش یا پیدائش کو وہاں سے (مراد روضہ نجف سے) مستی ناز یعنی اپنے جوش فخر کی طلب ہے۔ اور ہر موج غبار یعنی دشت نجف کی خاک کی ہر لہر عرض خمیازۂ ایجاد ہے۔ مراد خاک دشت نجف کو ایجاد یا پیدائش کے شوق کا اظہار کرنا منظور ہے۔ (خمیازہ بمعنی شوق۔ اور ایجاد۔ پیدا کرنا۔ عرض۔ اظہار) حاصل شعر یہ کہ سب کچھ نجف ہی کی خاک سے پیدا ہوا۔ اور اس پر نازاں ہے۔

مطلع ثانی

فیض سے تیرے ہے اے شمع شبستان بہار (۱۶۲۵)
دل پروانہ چراغاں پر بلبل گلزار
(۱۶۲۶) شکل طاؤس کرے آئینہ خانہ پرواز
ذوق میں جلوے کے تیرے بہوائے دیدار

تیری اولاد کے غم سے ہے بروئے گردوں (۱۶۲۷)
سلک اختر میں مہ نو مژۂ گوہر بار
(۱۶۲۸) ہم عبادت کو ترا نقش قدم مُہر نماز
ہم ریاضت کو ترے حوصلے سے استظہار
مدح میں تیری نہاں زمزمۂ نعت نبی (۱۶۲۹)
جام سے تیرے عیاں بادۂ جوش اسرار
(۱۶۳۰) جوہر دست دعا آئینہ یعنی تاثیر
یک طرف نازش مژگاں و دگر سو غم خار
مردمک سے ہو عزا خانۂ اقبال نگاہ (۱۶۳۱)
خاک در کی ترے جو چشم نہ ہو آئینہ دار
(۱۶۳۲) دشمن آل نبی کو بہ طرب خانۂ دہر
عرض خمیازۂ سیلاب ہو طاق دیوار
دیدہ تا دل اسدؔ آئینۂ یک پرتو شوق (۱۶۳۳)
فیض معنی سے خط ساغر راقم سرشار

(۱۶۲۵) اے شمع شبستان بہار۔ یعنی موسم بہار کو رات گذارنے کی شمع۔ تیرے فیضان سے پروانہ اس قدر مستفید ہوا۔ کہ خود اس کا دل ہی چراغاں بن گیا۔ اور اسے اور کہیں جانے کی حاجت نہیں رہی۔ اسی طرح بلبل کے لئے اُس کے پر ہی گلزار بن گئے ہیں۔ مراد یہ کہ پروانہ اب تجھ سے وابستہ ہو کے کسب فیض کرتا ہے۔ اور اسی طرح موسم بہار میں بلبل۔

(۱،۲۶) تیرے دیدار کی خواہش کے سبب شوق جلوہ میں بھر کے آئینہ خانہ مثل مور کے پرواز کرتا ہے۔ یعنی آئینہ خانہ اڑ کر تیرے جلوۂ دیدار کا استقبال کرتا ہے۔

(۱،۲۷) حضرت علیؓ کی طرف مخاطب ہو کے کہتا ہے۔ کہ تیری اولاد کے شہادت کے غم میں۔ آسمان پر مہ نو (یعنی ہلال تاروں کی لڑی میں مل کر گویا اپنے مژہ کو ہر بار ہونے کا اظہار کر رہا ہے۔ (مژہ گوہر بار۔ ایسی پلکوں سے مراد۔ کہ جن سے رونے میں آنسو ٹپکیں۔ تو وہ موتی قرار دیئے گئے۔ اور ہلال تو مژہ ہی کی صورت لئے ہوتا ہے)

(۱،۲۸) مُہر نماز۔ کوئی ایسی چیز (مثلاً خاکِ نجف وغیرہ) جس کو شیعہ لوگ منہ کے آگے رکھکر نماز پڑھا کرتے ہیں۔

حل شعر۔ تیرا نقش قدم نماز کے لئے بھی مُہر نماز ہے! اور ریاضت کے لئے بھی تیرے حوصلے (یہاں مراد حضرت علیؓ کی بے نظیر شجاعت) سے ہماری استظہار یعنی پشت پناہی ہوتی ہے۔ (ریاضت کا مفہوم محنت کرنا۔ نفس کشی کرنا۔

(۱،۲۹) تیری تعریف و ثنا میں پیغمبر خدا کی نعت کا راگ پوشیدہ ہے۔ یعنی تیری نعت خوانی گویا پیمبر کی نعت خوانی ہے۔ اور تیرے جام یعنی تیرے جام محبت سے وہ بادہ یا شراب عیاں ہوتی یعنی جھلکتی ہے جو کہ دراصل جوشش اسرار نبی ہے۔ یعنی وہ اسرار یا راز توحید جس سے نبی کو جوش آتا تھا۔ وہ تیرے جام محبت میں موجود ہے۔

(۱،۳۰) جوہر آئینے میں وہ خط جسے آئینہ کا جوہر کہتے ہیں۔ دست دعا آئینہ۔ دست دعا وہ ہاتھ کہ جسے اُٹھا کر دعا مانگتے ہیں۔ اور اس کی

طرف یوں دیکھتے ہیں۔ کہ جیسے آئینہ کو اُٹھا کر۔ اسی لئے دست دعا آئینہ کہا۔ چونکہ جوہر کے معنی ایک خط آئینہ کے بھی ہیں۔ اور یہاں آئینے کا لفظ مستعمل بھی ہوا ہے۔ لہذا بغرض تخصیص جوہر کے معنی مصنف نے خود ہی ""تاثیر"" بتا دیئے ہیں۔ لہذا دست دعا کا جوہر۔ اس جملے سے مراد دست دعا کا آئینہ۔ جس کا جوہر۔ خط جوہر نہیں بلکہ تاثیر ہے۔ مراد یہ کہ مجسم تاثیر ہے۔ کہ جس کی طرف ذرا دیکھا۔ اور دعا پوری ہوئی۔ لہذا جب ایک طرف کوئی اچھی دعا اپنے یا کسی دوست کے حق میں مانگی جائے۔ تو اس وقت اس "" دست دعا آئینہ "" کے دیکھنے سے ہماری مژگان ناز کرتی ہے۔ کہ ایسی اچھی دعا ہمارے اس دعا بہ آئینہ کی بدولت پوری ہوگئی۔ اور اگر اس کے مخالف دوسری طرف کوئی بددعا کسی غیر یا دشمن کے حق میں کی جاتی ہے۔ تو وہ پوری تو ضرور ہوتی ہے۔ مگر اس حالت میں ہمارے اس دست دعا آئینہ کی طرف دیکھنا ""زخم خار"" ہوتا ہے۔ یعنی ہماری مژگان بھی ایسی بددعا کی تلخی سے خار کی ایسی خلش محسوس کرتی ہے۔ (اس شعر کے حل کرنے میں حضرت آسی اور نظم طباطبائی دونوں نے بہت کوشش کی ہے۔ مگر تحقیقی معنی تک کوئی شارح غالب نہیں پہنچ سکا۔ چونکہ دعا مانگتے وقت دست دعا آئینہ کی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔ تو آنکھ کی مژہ سے آئینے میں گویا جوہر پیدا ہوا۔ وہی یہاں مترادف تاثیر یعنی مقبولیت دعا ہے)

(۱،۳۱) وہ نگاہ جو تیرے دروازے کی مٹی کی آئینہ دار یعنی غلام اور تابع فرمان نہ ہو۔ وہ اپنی پتلی سے (کہ جو سیاہ رنگ کی ہوا کرتی ہے۔) اقبال کی ماتم خانہ بن جائے۔ (یہاں چشم سے مراد حضرت علی کے مخالف کی نگاہ ہے) مطلب یہ کہ تیرے مخالف کو سوگوار ہونا نصیب ہو۔

(۱۴۳۲) دشمن آل نبی یعنی جو شخص حضرت علیؓ وغیرہ یا اولادِ نبی کا دشمن ہو۔ عرض۔ پیش کرنا۔ بالمقابل۔ خمیازہ۔ یہاں مراد لہر۔

حل شعر۔ جو شخص آل نبی کا دشمن ہے اس طرب خانۂ دہر میں یعنی دنیا کے ایسے آسودہ حال گھرانے میں اس کا طاق دیوار سیلاب کی لہر کے بالمقابل ہو جائے۔ (مراد یہ کہ اس کا وہ گھر ہی بہہ جائے۔)

(۱۴۳۳) اسد۔ آنکھوں سے لے کر دل تک شوق و محبت علی کے پرتو یعنی عکس کا ایک آئینہ ہے۔ لہٰذا اس فیض معنی سے یعنی حضرت علیؓ کے اوصاف نظم کرنے سے یہ خط ساغر راقم۔ مراد میرے ساغر دل کی تحریر سرشار ہو گئی ہے۔ یعنی یہ تحریر جو میرے دل پر لکھی گئی ہے۔ بہت خوشی منا رہی ہے۔ کیونکہ میں سرا سر محبت علی کی محبت کا آئینہ یا اس کا مظہر ہوں۔

قصیدہ

(۱۴۳۴) دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خودبیں

(۱۴۳۵) بے دلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بیکسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دین

(۱۴۳۶) ہرزہ ہے نغمۂ زیر و بم ہستی و عدم
لغو ہے آئینۂ فرق جنون و تمکیں

(۱۴۳۷) نقش معنی ہمہ خمیازۂ عرض صورت
سخن حق ہمہ پیمانۂ ذوق تحسیں

(۱۴۳۸) لاف دانش غلط و نفع عبادت معلوم
دُردِ یک ساغر غفلت ہے چہ دنیا و چہ دیں

(۱۴۳۹) مثل مضمون وفا باد بدست تسلیم
صورت نقش قدم خاک بفرق تمکیں

(۱۴۴۰) عشق بے ربطیٔ شیرازۂ اجزائے حواس
وصل زنگار رخ آئینۂ حسن یقیں

(۱۴۴۱) کوہکن گرسنہ مزدور طرب گاہ رقیب
بے ستون آئینۂ خواب گران شیریں

(۱۴۴۲) کس نے دیکھا نفس اہل وفا آتش خیز
کس نے پایا اثر نالۂ دلہائے حزیں

(۱۴۴۳) سامع زمزمۂ اہل جہاں ہوں لیکن
نہ سر و برگ ستایش نہ دماغ نفریں

(۱۴۴۴) کس قدر ہرزہ سرا ہوں کہ عیاذاً باللہ
یک قلم خارج آداب وقار و تمکیں

(۱۴۴۵) نقش لاحول لکھ اے خامۂ ہذیاں تحریر
یا علی عرض کر اے فطرت وسواس قریں

(۱۴۴۶) مظہر فیض خدا جان و دل ختم رسلؐ
قبلۂ آل نبی کعبۂ ایجاد یقیں

(۱۴۴۷) ہو وہ سرمایۂ ایجاد جہاں گرم خرام
ہر کف خاک ہو واں گردۂ تصویر زمیں

(۱۶۴۸) جلوہ پرواز ہو نقش قدم اُس کا جس جا
وہ کفِ خاک ہے ناموسِ دو عالم کی امیں

نسبتِ نام سے اس کی ہے یہ رتبہ کہ رہے (۱۶۴۹)
ابدًا پشتِ فلک خم شدۂ نازِ زمیں

(۱۶۵۰) فیضِ خلق اُس کا ہی شامل ہے کہ ہوتا ہے سدا
بوئے گل سے نفسِ بادِ صبا عطر آگیں

بُرشِ تیغ کا اُس کی ہے جہاں میں چرچا (۱۶۵۱)
قطع ہو جائے نہ سر رشتۂ ایجاد کہیں

(۱۶۵۲) کفر سوز اُس کا وہ جلوہ ہے کہ جس سے ٹوٹے
رنگِ عاشق کی طرح رونقِ بتخانۂ چیں

جاں پناہا دل و جاں فیضِ رسانا شاہا (۱۶۵۳)
وصیِ ختمِ رسل تو ہے بہ فتوائے یقیں

(۱۶۵۴) جسمِ اطہر کو ترے دوشِ پیمبر منبر
نامِ نامی کو ترے ناصیۂ عرش نگیں

کس سے ممکن ہے تری مدح بغیر از واجب (۱۶۵۵)
شعلۂ شمع مگر شمع پہ باندھے آئیں

(۱۶۵۶) آستاں پر ہے ترے جوہرِ آئینۂ سنگ
رقمِ بندگیٔ حضرتِ جبریلِ امیں

تیرے در کے لئے اسبابِ نثار آمادہ (۱۶۵۷)
خاکیوں کو جو خدا نے دیے جان و دل و دیں

(۱۶۵۸) تیری مدحت کے لئے ہیں دل و جاں کام و زباں
تیری تسلیم کو ہیں لوح و قلم دست و جبیں

کس سے ہو سکتی ہے مداحیٔ ممدوحِ خدا (۱۶۵۹)
کس سے ہو سکتی ہے آرایشِ فردوسِ بریں

(۱۶۶۰) جنسِ بازارِ معاصی اسد اللہ اسد
کہ سوا تیرے کوئی اُس کا خریدار نہیں

شوخیٔ عرضِ مطالب میں ہے گستاخِ طلب (۱۶۶۱)
ہے ترے حوصلۂ فضل پہ از بسکہ یقیں

دے دعا کو مری وہ مرتبۂ حسنِ قبول
کہ اجابت کہے ہر حرف پہ سو بار آمیں

غمِ شبیر سے ہو سینہ یہاں تک لبریز (۱۶۶۳)
کہ رہیں خونِ جگر سے مری آنکھیں رنگیں

(۱۶۶۴) طبع کو الفتِ دلدل میں یہ سرگرمیٔ شوق
کہ جہاں تک چلے اُس سے قدم اور مجھ سے جبیں

دلِ اُلفت نسب و سینۂ توحید فضا (۱۶۶۵)
نگہِ جلوہ پرست و نفسِ صدق گزیں

(۱۶۶۶) صرفِ اعدا اثرِ شعلۂ دودِ دوزخ
وقفِ احباب گل و سنبلِ فردوسِ بریں

(۳۴، ۱) کہتے ہیں جب کہ خدا نے تخلیق کائنات سے قبل اپنے جمال کو دیکھنا چاہا۔ تو محض اسی غرض سے قدرت کا ظہور ہوا۔ کہتا ہے یہ دنیا ایک معشوق حقیقی کی یکتائی کے جلوسے کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔ (مراد مسئلہ ہمہ اوست کی بدولت یہاں سب کچھ وحدت وجود میں داخل ہے۔) لہذا وہ حسن یا معشوق حقیقی کا جلوہ اگر خود بیں نہ ہوتا۔ یعنی اگر خدا شامل بہ قدرت ہوکے اپنے آپ کو دیکھنا نہ چاہتا تو ہم کہاں پیدا ہوتے۔

(۳۵، ۱) دنیا کے سیر و تماشے ہمیں بیعمل کی ہے۔ کیونکہ نہ تو ایسے تماشوں کا ہمیں شوق ہے۔ اور نہ ان سے کوئی عبرت یا سبق ہمیں حاصل ہوتا ہے۔ اسی طرح ہماری تمنا کی بے بسی ہے۔ کہ ہمیں نہ دنیا کا شوق نہ دین کی خواہش۔ مراد یہ "ہمہ اوست" کے تصوف نے کچھ مردنی سی ہم میں پیدا کردی ہے۔ (اس غزل میں اکثر اشعار کا ماحصل وہی مضمون ہے۔ جس کو مطلع میں شروع کیا گیا ہے۔)

(۳۶، ۱) ہمارے نزدیک جب وجود و عدم ایک ہی ہے۔ تو ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا یعنی ان کو نیچے اور اونچے سروں والے نغمے سے مشابہ کرنا فضول ہے۔ اسی طرح جنون و خودداری کے فرق کو دکھانے والا آئینہ بالکل لغو ہے۔ (کیونکہ یہ دونوں ایک ہی ہیں بقول ہمہ اوست)

(۳۷، ۱) حقیقت کا نقشہ تمامتر صورت یا ظاہریت ہی کے عرض یا اوصاف کا خمیازہ یا خواہش ہے۔ (خمیازہ مراد کسی چیز کی خواہش میں انگڑائی لینا) اسی طرح سخن حق۔ بالکل اپنے شوق تحسین یا ذوق خود ستائی کا ایک ناپ ہے۔ مطلب یہ کہ حق گوئی تو بے غرض ہونی چاہیے۔

مگر یہ بھی شوق تحسین سے بے تعلق نہیں۔ کیونکہ شاعر سب کیفیتوں کو ایک وجود واحد تصور کرتا ہے۔

(۳۸، ۱) لاف دانش یعنی دنیوی امور میں بہت فائق ہونے کی شیخی غلط ہے۔ اور عبادت سے نفع اٹھانے کی قابلیت بھی ہمیں معلوم ہے۔ کہ یہ کوئی بیں نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ ہر شخص کی دنیا اور دین ایک ہے۔ یعنی ان دونوں پر غفلت کے پردے ایسے چھائے ہوئے ہیں۔ کہ گویا یہ ایک ہی ساغر غفلت کی تلچھٹ ہیں۔ (مراد ہمہ اوست میں دنیا بھی دین سے جدا نہیں ہو سکتی۔ تو پھر دین کیسا)

(۳۹، ۱) جس طرح وفا کا مضمون یعنی اس کی اصلیت باد بدست ہے۔ یعنی ہاتھ کی ہوا مراد ہیچ۔ اسی طرح تسلیم و رضا کا مسئلہ ہے۔ یعنی خدا پر بھروسہ کرکے راضی برضا رہنا۔ کیونکہ نقش قدم (جس میں حرکت کا اطلاق پایا جاتا ہے۔) وہ اسی طرح کا ہے۔ جس طرح کہ تمکین یعنی ایک جگہ جمے رہتا ہو۔ مگر جس کی پیشانی پر خاک جمی ہو۔ کہ جس سے اس امر کا اظہار ہوتا ہے۔ کہ یہ بھی گویا نقش قدم ہی کا کوئی نشان ہے۔ (حاصل شعر وہی ہمہ اوست کا راگ یہاں بھی گایا گیا ہے۔)

(۴۰، ۱) ہمارا عشق کیا ہے ارکان ہوس کے ساز و سامان کی بے ترتیبی۔ حالانکہ عشق ہمیشہ ایک حال پر مضبوط و قایم ہوا کرتا ہے۔ مگر عشق و ہوس دونوں ملے جلے ہیں۔ اسی طرح حسن یقین یعنی ہمارے ایمان کے آئینہ کے رخ پر زنگار ہے۔ اور ہمیں یہ (خدا سے) وصال کی صورت سے نظر آرہا ہے۔ گویا ان امور میں بھی ہمارا حسن اعتقاد یعنی عشق حق و وصال بہ حق ایک چیز نہیں۔

(۱۷۴۱) کوہکن نے بے ستون کا پہاڑ شیریں سے وصال حاصل کرنے کے وعدے پر کاٹا تھا۔ تو وہ گویا ایک حریص مزدور تھا۔ اور چونکہ بے ستون کوہکن کے رقیب خسرو کی عیش کے کام آیا تھا۔ تو گویا فرہاد اپنے رقیب کا ایک مزدور تھا۔ (کوئی خالص بے طمع عاشق نہیں تھا) اسی طرح بے ستون میں شیریں کا محل بنا۔ تو وہ اس کی گہری نیند سونے کے کام آیا۔ حالانکہ جذبۂ فرہاد سچا ہوتا تو اُس کی معشوقہ یوں خواب غفلت میں نہ پڑی رہتی۔ مراد یہ کہ ہمارا عشق بھی خود غرضیوں سے خالی نہیں۔

(۱۷۴۲) آجکل کس نے اہل وفا کی آہ کو آگ بھڑکاتے دیکھا ہے۔ یعنی اس میں صداقت نہیں ہے۔ اسی طرح اب عشاق کے غمناک دلوں کی فریاد کا اثر کہاں پایا گیا ہے۔ مراد یہ کہ وفا اور غم عشق میں صداقت کی بو نہیں ہے۔

(۱۷۴۳) سامع۔ علم تصوف میں وہ شخص کہ سمع و توحید کا راگ سنکے وجد میں آجائے۔ مگر طنز سے کہتا ہے۔ کہ اہل جہاں کا جو عموماً حقیقت سے معرا ہوا کرتے ہیں ایک میں بھی سامع ہوں۔ کہ ان کے زمزمے یا توحیدی نغمے سنکے نہ تو یہ قابلیت مجھ میں ہے۔ کہ ان کی تعریف کر سکوں۔ اور نہ یہ عملی لیاقت کہ ایسے زمزموں پر اظہار تنفر کر سکوں۔ (مراد یہ کہ آجکل کے جاہل پیروں اور جاہل مریدوں کی حالت اس قسم کی دیکھی گئی ہے)

(۱۷۴۴) نعوذ باللہ میں کس قدر ہرزہ سرائی یعنی یاوہ گوئی کر رہا ہوں۔ کہ جو باتیں آجکل کے صوفیوں کے متعلق اوپر بیان کی گئی ہیں۔ وہ سب کی سب وقار و تمکنت کے آداب یا درجے سے خارج (مراد گری ہوئی) تھیں۔

(۱۷۴۵) اے میرے قلم جو اس قدر بہکی بہکی باتیں لکھنے والا ہے اب لاحول کا نقش کھینچ یعنی ایسی بے ہودہ باتوں سے گریز کر اور اے میری فطرت (عادت اور سرشت) جو وسواس یعنی شک اور بد اعتقادی سے ملوث ہے۔ (اب سنبھل اور) "یا علی" "یا علی" کا وظیفہ پڑھ۔

(۱۷۴۶) حضرت علی، خدا کے احسانوں کے اظہار کرنے والے ہیں۔ اور ختم رسل یعنی تمام پیمبروں کے آخری پیغمبر (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کے دل و جان ہیں۔ اور وہ نبی کی اولاد میں سب سے بڑے تھے۔ اور کعبہ ایجاد یقیں۔ یہاں کعبہ سے مراد خانہ کعبہ۔ اور ایجاد دنیا۔ یقین بہ معنی ایمان گویا وہ دنیائے ایمان کے خانۂ کعبہ بھی تھے۔

(۱۷۴۷) وہ سرمایۂ ایجاد یعنی ایجاد کرنے کا خزینہ (جو بکثرت ایجادیں کر سکتا ہے۔) جہاں کہیں چلنے پھرنے میں مصروف ہو۔ وہاں کی ہر مٹھی بھر خاک ایک ایسا گردہ (حلقہ) یا گرہ بن جائے کہ جو ایک نئی دنیا کی تصویر یا مجوزہ نقشہ ہو۔ (مراد یہ کہ اس کا ہر نقش قدم گویا ایک دنیا کی تصویر ہے۔ یہ اس لئے کہا کہ خانہ کعبہ کو ناف زمین تصور کیا جاتا ہے)

(۱۷۴۸) اس کا نقش قدم جس جگہ جلوہ افگن ہو۔ اس مٹھی بھر خاک کو دونوں جہانوں کی عزت کا محافظ تصور کرنا چاہئے۔

(۱۷۴۹) نسبت نام سے اس کے۔ یعنی حضرت علی کی کنیت ابوتراب (مٹی کا باپ) ہے۔ اسی طرح زمین جو مٹی ہی ہے۔ اس کا یہ مرتبہ ہے۔ کہ آسمان بھی اس پر فخر کرتا ہے۔ اور اسی فخر کے بوجھ سے ہمیشہ کے لئے آسمان کی پشت خم ہی آتی ہے یعنی آسمان کا جھکاؤ جو زمین کی طرف ہے۔ اسی باعث سے ہے۔

(۱،۵۰) اے اسد پھولوں کی خوشبو سے بادِ صبا کا وجود جو معطر رہتا ہے۔ تو یہ اس باعث۔ کہ اس میں ممدوح کے خلق کا فیض شامل ہو گیا ہے۔ یعنی حضرت علی کے اخلاق کی خوشبو کا اثر بوسطہ نسیم تک کو فیض پہنچا رہا ہے۔

(۱،۵۱) حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شہادت بے مثل تھی۔ اسی لئے کہتا ہے۔ کہ اس کی تلوار کی کاٹ کا دنیا بھر میں چرچا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ سلسلہ ایجاد منقطع ہو جائے۔ جو کہ نئی نئی اشیا کو وجود میں لاتا ہے (اس خوف سے کہ پیدا کرنا فضول ہے۔ جبکہ وہ چیز حضرت موصوف کی تلوار سے ضرور کاٹ دی جائیگی)

(۱،۵۲) اس کا جلوہ ایسا کفر کو جلا کے فنا کرنے والا ہے۔ کہ جس کے آگے بت خانہ چین کی رونق بھی عاشق کے اڑے ہوئے رنگ کی طرح اڑ نکل جاتی رہے۔

(۱،۵۳) اے بادشاہ۔ کہ جس سے ہماری جان کو امان ملتی ہے اور دل و جان کو فیض بہ فتوائے یقین یعنی ایمان نے یہ فتویٰ دیدیا ہے۔ کہ تو ہی آنحضرت یعنی اخیری پیغمبر کا وصی ہے۔ یعنی آپ کی وصیت سے تو ہی آپ کا جانشین ہے۔ (وصی حضرت علی رض کا خاص خطاب ہے) جس کا مفہوم وصیت کیا گیا ہے۔ یعنی آنحضرت کا جانشین ہونا۔

(۱،۵۴) تیرے پاک جسم کو پیمبر کا کندھا منبر ہے۔ اس سے مراد ہے کہ آنحضرت فرط محبت سے تجھ کو کندھے پر چڑھا کے لئے لئے پھرتے تھے۔ (یہ بات حدیث سے مروی ہے) اور تیرے مشہور نام کا نگین۔ عرش کی پیشانی ہے۔ مراد عرش معلی پر تیرا نام لکھا ہوا ہے۔

(۱،۵۵) واجب یعنی واجب الوجود یا خدا کے سوا کون تیری تعریف کر سکتا ہے۔ جس طرح کہ شمع کے آئین باندھنا یعنی اس کی آئین بندی یا حد توصیف کا قائم کرنا۔ شعلہ ہی سے شاید ہو سکتا ہے۔ مراد یہ کہ شعلہ اگر بلند ہے تو شمع کو فروغ ہے۔ اور اگر شعلہ افسردہ ہے۔ تو شمع بھی افسردہ ہے۔ غرض شمع کی تعریف بجز شعلہ عموماً غیر ممکن ہے۔

یا مادح اور ممدوح ایک ذات ہونے چاہئیں۔ تاکہ تعریف ہو سکے۔ لہذا تیری تعریف بھی محض خدا ہی سے ہو سکتی ہے۔ کہ جو تیرے ساتھ ایک ذات ہے۔ (اس شعر میں بھی مسئلہ وحدت الوجود کی طرف شاعر کا خیال راجع ہے)

(۱،۵۶) تیرے آستان پر جبریل نے جو بندگی یعنی سجدہ کیا ہے۔ اس کی رقم یعنی تحریر یا نشان اس آئینے پر جو (پتھر کے عوض) تیری دہلیز پر لگا یا گیا ہے۔ ایک نشان جوہر بن گیا۔ (جو کسی طرح اب مٹ ہی نہیں سکتا۔)

(۱،۵۷) خدا نے جو جو سامان مثلاً جان اور دل اور دین اپنے خاکی بندوں کو عطا کئے ہیں۔ وہ اسباب تیرے در پر قربان ہونے کے لئے آمادہ ہیں۔

(۱،۵۸) تیری تعریف ہی کے لئے بنائے گئے ہیں۔ لوگوں کے دل۔ جان۔ حلق اور زبان اور تیری ہی فرمانبرداری کو لوح ازل۔ قلم دست ازل اور جبین لوح ازل بنائے گئے تھے۔

(۱،۵۹) جس کی تعریف خدا نے کی ہو۔ اُس کی تعریف کون کر سکتا ہے۔ جس طرح خدا کے واسطے آرایش کوئی نہیں کر سکتا۔

(۱،۶۰) گناہوں کے بازار کی ایک جنس یعنی اسد اللہ خاں اسد

کہ جس کو تیرے سوا اور کوئی مول لینے یعنی منہ لگانیوالی نہیں ہے۔

(۱، ۶۱) اے خدا میں عرضِ مطالب میں شوخی کرتے کرتے گستاخ طلب ہو گیا ہوں۔ یعنی اپ ڈھٹائی سے مانگتا ہوں۔ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ (بندوں پر) رحمت کرنے میں تیرا حوصلہ بہت بڑھا ہوا ہے۔

(۱، ۶۲) میری دعا کو وہ حسن قبول کا رتبہ دے۔ کہ جب میں دعا مانگوں۔ تو اس کا مقبول ہونا یعنی اجابت صد ہا بار اس پر آمین کہے۔

(۱، ۶۳) میرا سینہ حضرت شبیر کی شہادت کے غم سے اس قدر بھر جائے کہ میری آنکھیں ہمیشہ خون جگر سے رنگین رہیں۔

(۱، ۶۴) دُلدل کی محبت میں میری طبیعت کو وہ مصروفیت شوق پیدا ہو۔ کہ جہاں تک دُلدل کا قدم چلے۔ میں وہاں تک اپنی پیشانی کے بل سے جاؤں۔

(۱، ۶۵) دُلدل کو تیری الفت سے قریبی تعلق ہو۔ اور میرے سینے کی فضا (ماحول) توحید ہو۔ میری نظر جیسے دیدار کی پرستش کرنے والی اور نفس صدق شعار ہو۔

(۱، ۶۶) دوزخ کی آگ کی جلن (اثر) اور اس کا دھواں تیرے دشمنوں کے کام میں آئے۔ اور بہشت برین کے گل و سنبل دوستوں کے لئے وقف ہوں۔

بہ تقریب عید مندرجہ ذیل قصیدے میں مصنف نے ہلالِ عید سے تخاطب کیا ہے۔

قصیدہ

ہاں مہ نو سنیں ہم اُس کا نام (۱، ۶۷)
جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

(۱، ۶۸) دو دن آیا ہے تو نظر دم صبح
یہی انداز اور یہی اندام

بارے دو دن کہاں رہا غائب (۱، ۶۹)
بندہ عاجز ہے گردشِ ایام

(۱، ۷۰) اُڑ کے جاتا کہاں کہ تاروں کا
آسمان نے بچھا رکھا تھا دام

مرحبا اے سرور خاص خواص (۱، ۷۱)
حبذا اے نشاط عام عوام

(۱، ۷۲) عذر میں تین دن نہ آنے کے
لے کے آیا ہے عید کا پیغام

اُس کو بھولا نہ چاہئے کہنا (۱، ۷۳)
صبح جو جائے اور آئے شام

(۱، ۷۴) ایک میں کیا کہ سب نے جان لیا
تیرا آغاز اور ترا انجام

راز دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے (۱، ۷۵)
مجھ کو سمجھا ہے کیا کوئی نمّام

(۱۶۷۶) جانتا ہوں کہ آج دنیا میں
ایک ہی ہے اُمید گاہ انام

میں نے مانا کہ تو ہے حلقہ بگوش (۱۶۷۷)
غالب اُس کا مگر نہیں ہے غلام

(۱۶۷۸) جانتا ہوں کہ جانتا ہے تو
تب کہا ہے بطرزِ استفہام

مہرِ تاباں کو ہو تو ہو اے ماہ (۱۶۷۹)
قرب ہر روزہ بر سبیلِ دوام

(۱۶۸۰) تجھ کو کیا پایہ روشناسی کا
جز بہ تقریبِ عیدِ ماہِ صیام

جانتا ہوں کہ اُس کے فیض سے تو (۱۶۸۱)
پھر بنا چاہتا ہے ماہِ تمام

(۱۶۸۲) ماہ بن ماہتاب بن میں کون
مجھ کو کیا بانٹ دے گا تو انعام

میرا اپنا جدا معاملہ ہے (۱۶۸۳)
اور کے لین دین سے کیا کام

(۱۶۸۴) ہے مجھے آرزوئے بخششِ خاص
گر تجھے ہے اُمیدِ رحمتِ عام

جو کہ بخشے گا تجھ کو فرِّ فروغ (۱۶۸۵)
کیا نہ دے گا مجھے مئے گلفام

(۱۶۸۶) جب کہ چودہ منازلِ فلکی
کر چکی قطع تیری تیزیٔ گام

تیرے پرتو سے ہوں فروغ پذیر (۱۶۸۷)
کوئے و مشکوئے و صحن و منظر و بام

(۱۶۸۸) دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز
اپنی صورت کا ایک بلوریں جام

پھر غزل کی روش پہ چل نکلا (۱۶۸۹)
توسنِ طبع چاہتا تھا لگام

(۱۶۶۷) ہاں اے مہِ نو یعنی ہلال تو ہم کو اس کا نام بتا دے - کہ جس کے آگے جھک کر تو سلام کر رہا ہے۔

(۱۶۶۸) تو وہ دن صبح کے وقت نظر آیا - یہی تیری شکل اور یہی نازک جسم تھا۔ (چاند چھبیس اور ستائیس تاریخ قمری ایک طرح کا دکھائی دیا کرتا ہے۔)

(۱۶۶۹) بارے دو دن تو دکھائی دیا۔ مگر پھر کہاں غائب ہو گیا۔

(جواب) گردشِ ایام سے بندہ عاجز تھا

(۱۶۷۰) میں کہاں اڑ کے جاتا۔ کہ آسمان نے تاروں کا جال بچھا رکھا تھا۔ اس لئے خوف سے باہر نہ نکلا۔

(۱۶۷۱) اے خاص الخاص لوگوں کو سرور پہنچانے والے مرحبا۔ اور اے عام لوگوں کو خوش کرنے والے مرحبا۔ یعنی عید کے چاند کو امیر آدمی دیکھ کر تو نشہ شراب سے مسرور ہو جاتے ہیں۔ اور عوام ویسے

ہی پھوٹے نہیں سماتے۔

(۱، ۷۲) اب چاند دو دن یعنی رمضان کی ۲۷ و ۲۸ کو نہ نکلا تو اس کے بعد نمودار ہو کے غیر حاضری کا عذر رشانے کو عید کا چاند بن کے نکلا۔

(۱، ۷۳) اچھا۔ جو شخص صبح کا بھولا شام کو آ جائے۔ تو اسے بھولا نہیں کہنا چاہئے۔ گویا ۲۷ و ۲۸ کو چاند نہ نکلا تو اُنتیس کو نکل آیا۔ تو کچھ مضائقہ نہیں ہے۔

(۱، ۷۴) ایک میں کیا سب نے اے چاند تیرا آغاز اور انجام دیکھا۔ کہ کس طرح تو گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔

(۱، ۷۵) تو مجھ سے اپنا راز دل چھپاتا ہے۔ کیا تو نے مجھ کو کوئی چغل خور خیال کیا ہے۔ کہ وہ بادشاہ جس کو تو جھک کر سلام کرتا ہے۔ اس کو دو دن تو سلام کرنے نہیں آیا۔ تو اس کا سبب یہ کہ گردش ایام نے مجبور کیا۔ اور پھر آیا۔ تو پیغام عید لے کے آیا۔

(۱، ۷۶) میں جانتا ہوں کہ آج دنیا میں عوام کے لئے ایک ہی بارگاہ ایسی ہے جہاں لوگوں کی امیدیں پوری ہوتی ہیں۔ اور تو بھی اسی بارگاہ کا امیدوار ہے۔

(۱، ۷۷) میں نے مانا کہ تو بادشاہ دہلی کا غلام ہے۔ تو کیا میں اس کا غلام نہیں ہوں۔ (حلقہ بگوش۔ غلام)

(۱، ۷۸) میں جانتا ہوں کہ جس بادشاہ کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے۔ تو اس کو خوب جانتا ہے۔ اس لئے بطرز استفہام اقراری اس کا بیان کیا ہے۔ (استفہام کسی بات کی نسبت سوال کرنا)

(۱، ۷۹، ۸۰) اے چاند آفتاب عالمگیر ہر روز اس بادشاہ سے قرب حاصل ہو تو ہو۔ ورنہ تجھ کو یہ رتبہ کہاں کہ تو اس سے روشناس ہو سکے۔ ہاں روزہ کے مہینے کی عید کا چاند بن کے تو بھی اس تقریب پر بادشاہ سے (بطور ماہ ہلال) ملاقات کر سکتا ہے۔

(۱، ۸۱) کیونکہ میں جانتا ہوں۔ اس کے فیض سے پھر تو پورا چاند بنا چاہتا ہے۔

(۱، ۸۲) اچھا تو چاند بن یا چاندنی میں کون ہوں۔ کہ تیرے معاملات میں دخل دوں۔ کیا تو مجھکو کوئی انعام بانٹ دیگا۔

(۱، ۸۳) میرا خاص معاملہ ہے۔ کہ کسی سے کچھ تعلق نہیں رکھتا۔ مجھے اور کسی کے لین دین سے کیا واسطہ۔

(۱، ۸۴) مجھ کو تو بادشاہ سے خاص بخشش کی امید ہے۔ اگر تجھکو رحمت عام کی آرزو ہے۔ یعنی تو تو خدا کی طرف سے رحمت عام چاہتا ہے۔ اور میں بادشاہ کی خاص عنایتوں کا متمنی ہوں۔

(۱، ۸۵) جو خدا تجھکو فر فروغ بخشیگا۔ یعنی فروغ بمعنی روشنی یا چاندنی کی کرو فر یا ایک شان ایزدی تجھے عطا کریگا۔ وہ کیا مجھ کو شراب گلفام نہ دیگا۔

(۱، ۸۶) جبکہ تیری تیزگامی چودہ آسمانی منزلیں طے کریگی۔ یعنی تو چودھویں رات کا چاند بن گیا۔

(۱، ۸۷) تو تیرے بہ تو یا عکس سے یہاں مراد چاندنی سے ہر گلی کوچہ۔ محل سرا۔ صحن۔ اور منظر گاہ۔ اور کوٹھا چاندنی کا نور حاصل کرتا ہے۔

(۱۶۸۸) تو میرے ہاتھ میں بھی اپنی شکل و صورت کا ایک بلوری جام لبریز دیکھیگا۔

(۱۶۸۹) میری طبع کا گھوڑا جو ایک لگام یعنی اشارہ ہی چاہتا تھا۔ پھر غزل سرائی کی طرف مائل ہوگیا۔ جیسے مرزا صاحب ایک اور جگہہ فرماتے ہیں (دیکھو شعر سند بجہ بالا) توسن طبع چاہے ہے اشارہ مُراد شراب پی کر گویا ہے

پھر دیکھئے انداز گل افشانی گفتار
رکھدے کوئی پیمانہ صہبا مرے آگے

غزل

زہر غم کر چکا تھا میرا کام (۱۶۹۰)
تجھکو کس نے کہا کہ ہو بدنام

(۱۶۹۱) مے ہی پھر کیوں نہ میں پئے جاؤں
غم سے جب ہوگئی ہو زیست حرام

بوسہ کیسا یہی غنیمت ہے (۱۶۹۲)
کہ نہ سمجھیں وہ لذتِ دشنام

(۱۶۹۳) کعبہ میں جا بجائیں گے ناقوس
اب تو باندھا ہے دیر میں احرام

اُس قدح کا ہے دور مجھکو نقد (۱۶۹۴)
چرخ نے لی ہے جس سے گردش دام

(۱۶۹۵) بوسہ دینے میں اُنکو ہے انکار
دل کے لینے میں جن کو تھا ابرام

چھیڑتا ہوں کہ اُن کو غصہ آئے (۱۶۹۶)
کیوں رکھوں ورنہ غالب اپنا نام

(۱۶۹۰) غم کا زہر جب میرا کام تمام کر چکا تھا۔ یعنی اُس نے مجھ میں کچھ طاقت باقی نہیں چھوڑی تھی۔ تو پھر تو کس لئے مجھے مارنے کے درپے ہوکے بدنام ہوا۔

(۱۶۹۱) یعنی پھر شراب ہی کیوں نہ پئے جاؤں۔ جبکہ میری زندگی غم کی بدولت حرام ہوگئی ہے۔

(۱۶۹۲) بوسے کی طلب کرنے سے میں درگذرا۔ کہیں وہ اپنی گالیوں ہی کی اُس لذت سے جو حاصل ہوتی ہے۔ خبر پاکر مجھ سے کنارہ کش نہ ہو جائیں۔

(۱۶۹۳) کسی دن ہم کعبہ میں بھی ناقوس لے کے بجا دیں گے۔ یعنی عشقِ بت میں اس قدر بے باک ہو جائیں گے۔ ابتو بتخانہ میں احرام باندھکے یعنی پورے معتقد عشق ہوکے بیٹھے ہوئے ہیں۔

(۱۶۹۴) مجھکو وہ دور شراب اس وقت بھی حاصل ہے۔ کہ جس قدح یا جام سے آسمان نے ابھی ایک گردش قرض لی ہے۔ کہ وہ اس گردش کو جب تمام کرلیگا۔ تو دوسروں کے نصیبے جاگیں گے۔ مگر میں اس گردش چرخ سے مستغنی ہوں۔

(۱۶۹۵) جنھوں نے اصرار کرکے میرا دل لیا تھا۔ اب اُنکو ایک

بوسہ مجھے دینے میں انکار ہے۔
(۱۷۹۶) یعنی اُن کو چھیڑ کر غصہ دلانے کی غرض سے اپنا نام غالب رکھ لیا ہے۔ ورنہ میں ایسا نام کیوں رکھتا۔ میں تو گویا مغلوبِ عشق ہوں۔ نہ کہ معشوق پر غالب۔

غزل

کہہ چکا میں تو سب کچھ اب تو کہہ (۱۷۹۷)
اے پری چہرہ پیک تیز خرام
(۱۷۹۸) کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا
ہیں مہ و مہر و زہرہ و بہرام
تو نہیں جانتا تو مجھ سے سن (۱۷۹۹)
نام شاہنشۂ بلند مقام
(۱۸۰۰) قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ
مظہر ذوالجلال والاکرام
شہسوار طریقۂ انصاف (۱۸۰۱)
نو بہار حدیقۂ اسلام
(۱۸۰۲) جس کا ہر فعل صورتِ اعجاز
جس کا ہر قول معنی الہام
بزم میں میزبان قیصر و جم (۱۸۰۳)
رزم میں اوستادِ رستم و سام

(۱۸۰۴) اے ترا لطف زندگی افزا
اے ترا عہد فرخی فرجام
چشم بد دور خسروانہ شکوہ (۱۸۰۵)
لوحش اللہ عارفانہ کلام
(۱۸۰۶) جاں نثاروں میں تیرے قیصر روم
جرعہ خواروں میں تیرے مرشد جام
وارثِ ملک جانتے ہیں تجھے (۱۸۰۷)
ایرج و تور و خسرو و بہرام
(۱۸۰۸) زور بازو میں جانتے ہیں تجھے
گیو و گودرز و بیژن و رہام
مرحبا موشگافی ناوک (۱۸۰۹)
آفریں آبداری صمصام
(۱۸۱۰) تیر کو تیرے تیر غیر ہدف
تیغ کو تیری تیغ خصم نیام
رعد کا کر رہی ہے کیا دم بند (۱۸۱۱)
برق کو دے رہا ہے کیا الزام
(۱۸۱۲) تیرے فیل گراں جسد کی صدا
تیرے رخش سبک عناں کا خرام
فن صورت گری میں تیرا گرز (۱۸۱۳)
گر نہ رکھتا ہو دستگاہ تمام

(۱۸۱۴) اس کے مضروب کے سروتن سے
کیوں نمایاں ہو صورت ادغام

جب ازل میں رقم پذیر ہوئے (۱۸۱۵)
صفحہ ہائے لیالی و ایام

(۱۸۱۶) اور ان اوراق میں بکلک قضا
مجملاً مندرج ہوئے احکام

لکھدیا شاہدوں کو عاشق کش (۱۸۱۷)
لکھدیا عاشقوں کو دشمن کام

(۱۸۱۸) آسمان کو کہا گیا کہ کہیں
گنبد تیز گرد نیلی فام

حکم ناطق لکھا گیا کہ لکھیں (۱۸۱۹)
خال کو دانہ اور زلف کو دام

(۱۸۲۰) آتش و آب و باد و خاک نے لی
وضع سوز و نم و رم و آرام

مہر رخشاں کا نام خسرو روز (۱۸۲۱)
ماہ تاباں کا نام شحنۂ شام

(۱۸۲۲) تیری توقیع سلطنت کو بھی
دی بدستور صورت ارقام

کاتب حکم نے بموجب حکم (۱۸۲۳)
اس رقم کو دیا طراز دوام

(۱۸۲۴) ہے ازل سے روائی آغاز
ہو ابد تک رسائی انجام

(۱۷۹۶) میں جو کچھ کہنا چاہتا تھا، سب کچھ کہہ چکا۔ اب تو کہہ اے پری چہرہ تیز چلنے والے بادشاہ کے قاصد، یعنی اس کا عید کا پیغام لانے والے۔

(۱۷۹۸) وہ کون ہے جس کے دروازے پر پیشانی گھستے ہیں چاند سورج، زہرہ اور ستارہ مریخ۔

(۱۷۹۹) اگر تو نہیں جانتا، تو میں اس بلند درجے والے بادشاہ کا نام بتاتا ہوں۔

(۱۸۰۰) میری آنکھوں اور دل کا قبلہ یعنی میرا واجب التعظیم بادشاہ، بہادر شاہ جو کہ مظہر ذوالجلال والاکرام ہے۔ یعنی دکھانے والا ہے، خدا کی صفت جلالی، (مراد قہر و غضب) کو اور شان اکرام یعنی رحم و بخشش کو۔

(۱۸۰۱) وہ طریقہ انصاف کا شہسوار ہے۔ اور حدیقہ اسلام یعنی باغ اسلام کی تازہ بہار ہے۔

(۱۸۰۲) جس کا ہر کام معجزے کی صورت رکھتا ہے۔ یعنی فوق العادت ہے۔ اور جس کی ہر بات گویا الہام ہے۔

(۱۸۰۳) اس کی محفل کے قیصر و جمشید مہمان ہیں۔ اور وہ جنگ میں رستم و سام کا بھی استاد ہے۔

(۱۸۰۴) اے تیری مہربانی زندگی بڑھانے والی اور تیرا دبدبہ

سلطنت ایک مبارک زمانہ ہے۔

(۱۸۰۵) چشم بد دور۔ تیری شان تو بادشاہوں کیسی ہے۔ اور ماشاءاللہ تیرا کلام عارف درویشوں جیسا ہے۔

(۱۸۰۶) تیرے جاں نثاروں میں روم کا بادشاہ ہے۔ اور تیرے عارفانہ کلام کے جرعہ خواروں یعنی لطف اٹھانیوالوں میں مرشد جام (مراد مولانا جامی) بھی ہے۔

(۱۸۰۷) تجھکو ایران کے بادشاہ ایرج۔ تور، خسرو۔ اور بہرام گور اپنے ملک کا وارث جانتے ہیں۔

(۱۸۰۸) تیرے جسمانی طاقت ماننے والوں میں گیو۔ گودرز۔ بیژن اور رہام ہیں۔

(۱۸۰۹) قطعہ۔

(۱۸۱۰) تیرے تیر کی موشگافی (بال کی کھال کھینچنے کا کیا کہنا۔ اور تیری تلوار کی آبداری قابل تعریف ہے۔ غیروں کا تیر۔ گویا تیرے تیر کا نشانہ بن جاتا ہے۔ یعنی وہ اس کو نشانہ مارکے اڑا دیتا ہے۔ اور دشمن کی تلوار تیری تلوار کے لئے نیام ہے۔ یعنی وہ اس کو کاٹ دیتی ہے۔ جیسے کہ تلوار نیام کو۔

(۱۸۱۱) قطعہ۔ تیرے بڑے ہاتھی کی آواز رعد کا کیسا دم بند کر رہی ہے۔ اور

(۱۸۱۲) تیرے سبک عناں یعنی ایک ذرا سے اشارے پر چلنے والے گھوڑے کی چال بجلی کو بھی الزام دے رہی ہے۔ یعنی اس کے سامنے وہ کچھ تعریف کے قابل نہیں ہے۔

(۱۸۱۳) قطعہ۔ اگر تیرا اگرز ایک صورت وضع کرنے میں پوری

مہارت نہ رکھتا ہوتا۔

(۱۸۱۴) تو پھر اس کے مقتول کے سر و تن سے ایک ادغام کی صورت کس طرح ظاہر ہوجاتی ہے۔ ادغام۔ مراد گڈمڈ ہونا۔ یعنی اس کا سر و تن آپس میں ملکر

(۱۸۱۵) جب لوح ازل میں راتوں اور دنوں کے یہ صفحے رقم ہوئے یعنی رات اور دن بنائے گئے۔

(۱۸۱۶) تو ان صفحات یعنی اوراق میں قضا و قدرت کے قلم کے ساتھ مختصر طور پر سب احکام درج کئے گئے۔

(۱۸۱۷) معشوقوں کی نسبت لکھدیا۔ کہ وہ عاشق کش رہیں گے۔ اور عاشقوں کی بابت لکھدیا۔ کہ وہ دشمنوں کے حسب منشا مبتلائے مصیبت رہیں گے۔

(۱۸۱۸) آسمان کی نسبت کہا گیا۔ کہ سب اس کو تیز پھرنے والا نیلا گنبد بولا کریں گے۔

(۱۸۱۹) پھر یہ فیصلہ کن حکم لکھا گیا۔ کہ معشوق کے خال کو دانہ۔ اور زلف کو عاشق کے مرغ دل کے پکڑنے کا جال لکھدیں۔

(۱۸۲۰) آگ پانی ہوا اور مٹی نے پھر جلن۔ نمی۔ اڑتے پھرنے۔ اور بہ حالت سکون رہنے کی صورت اختیار کی۔

(۱۸۲۱) چمکنے والے سورج کا نام دن کے بادشاہ اور چمکنے والے چاند کا نام شام کا کوتوال مقرر کیا گیا۔

(۱۸۲۲) تیرے فرمان سلطنت کو بھی حسب دستور۔ لوح ازل پر رقم کردیا گیا۔

(۱۸۲۳) قضائے بموجب حکم۔ تیری سلطنت کے متعلق جو فرمان

لکھا گیا تھا۔ اس پر ہمیشگی کا طغرا لگا دیا کہ یہ سلطنت ہمیشہ رہے۔
(۱۸۲۴) تیری اس سلطنت کا آغاز روزِ اول سے ہوا۔ خدا کرے کہ اب اس کا انجام ابد پر ہو یعنی بقائے دوام نصیب ہو۔

قصیدہ

صبح دم دروازۂ خاور کھلا (۱۸۲۵)
مہرِ عالمتاب کا منظر کھلا

(۱۸۲۶) خسروِ انجم کے آیا صرف میں
شب کو تھا گنجینۂ گوہر کھلا

وہ بھی تھی اک سیمیا کی سی نمود (۱۸۲۷)
صبح کو رازِ مہ و اختر کھلا

(۱۸۲۸) ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازیگر کھلا

سطحِ گردوں پر پڑا تھا رات کو (۱۸۲۹)
موتیوں کا ہر طرف زیور کھلا

(۱۸۳۰) صبح آیا جانبِ مشرق نظر
اک نگارِ آتشیں رُخ سر کھلا

تھی نظر بندی کیا جب ردِّ سحر (۱۸۳۱)
بادۂ گلرنگ کا ساغر کھلا

(۱۸۳۲) لا کے ساقی نے صبوحی کے لئے
رکھ دیا ہے ایک جامِ زر کھلا

بزمِ سلطانی ہوئی آراستہ (۱۸۳۳)
کعبۂ امن و اماں کا در کھلا

(۱۸۳۴) تاجِ زریں مہرِ تاباں سے سوا
خسروِ آفاق کے منہ پر کھلا

شاہِ روشن دل بہادر شہ کہ ہے (۱۸۳۵)
رازِ ہستی اُس پہ سر تا سر کھلا

(۱۸۳۶) وہ کہ جس کی صورتِ تکوین میں
مقصدِ نہ چرخ و ہفت اختر کھلا

وہ کہ جس کے ناخنِ تاویل سے (۱۸۳۷)
عقدۂ احکامِ پیغمبر کھلا

(۱۸۳۸) پہلے دارا کا نکل آیا ہے نام
اُس کے سرہنگوں کا جب دفتر کھلا

رُوشناسوں کی جہاں فہرست ہے (۱۸۳۹)
واں لکھا ہے چہرۂ قیصر کھلا

(۱۸۴۰) توسنِ شہ میں ہے وہ خوبی کہ جب
تھان سے وہ غیرتِ صرصر کھلا

نقشِ پا کی صورتیں وہ دل فریب (۱۸۴۱)
تو کہے بت خانۂ آذر کھلا

(۱۸۴۲) مجھ پہ فیضِ تربیت سے شاہ کی
منصبِ مہر و مہ و محور کھلا

لاکھ عقدے دل میں تھے لیکن ہر ایک (۱۸۴۳)
میری حد وسع سے باہر کھلا

(۱۸۴۴) تھا دلِ وابستہ قفلِ بے کلید
کس نے کھولا کب کھلا کیونکر کھلا

باغِ معنی کی دکھاؤں گا بہار (۱۸۴۵)
مجھ سے گر شاہِ سخن گستر کھلا

(۱۸۴۶) ہو جہاں گرمِ غزل خوانی نفس
لوگ جانیں طبلۂ عنبر کھلا

(۱۸۲۵) صبح کے وقت۔ خاور یعنی مشرق کا دروازہ کھلا۔ اور آفتاب جو مشرق سے نکلا کرتا ہے۔ اس مہر عالمتاب (چمکنے والا سورج) کا وہ منظر یعنی نظارہ دکھانے والی جگہ۔ مراد کھڑکی کھلی۔ (گویا سورج نکل آیا۔)

(۱۸۲۶) رات کو وہ جو موتیوں کا خزانہ بکھرا پڑا تھا یعنی ستارے وہ بادشاہ یعنی سورج کے تصرف میں آیا۔ مراد وہ ستارے جاتے رہے اور سورج نکل آیا۔

(۱۸۲۷) سیمیا۔ وہ فن ہے۔ جس کے ذریعہ وہ شکلیں بھی دکھلائی دینے لگتی ہیں۔ کہ جو محض وہمی ہوں۔

حل۔ رات کو جو چاند اور تارے نکلے ہوئے تھے۔ اور صبح کو وہ نامعلوم

طور پر کہیں گم ہوگئے۔ تو گویا سیمیا کا سا ایک نظارہ دکھائی دیا تھا۔ چاند سورج ہرگز نہیں تھے۔

(۱۸۲۸ و ۱۸۲۹) یہ ستارے اصلیت میں کچھ اور ہیں۔ اور نظر کچھ اور آتے ہیں۔ گویا یہ بازیگر کھلم کھلا سب کو دھوکا دیتے رہتے ہیں۔ یعنی رات کو یہ ایک موتیوں کا سا زیور ہر طرف بکھرا ہوا صفحۂ آسمان پر پڑا تھا۔ مگر دن نکلتے ہی کچھ بھی نہ رہا۔

(۱۸۳۰) صبح کو مشرق کی طرف ایک آتشیں رخسار معشوق نے سر دکھائی دیا۔ مراد سورج نکلا۔

(۱۸۳۱) مگر دراصل یہ ہماری نظر بندی کی گئی تھی۔ یعنی جادو سے آنکھیں بند ہوگئی تھیں۔ جب ہم نے اس نظر بندی یعنی جادو کا رد کیا۔ تو وہی آفتاب ایک گلرنگ شراب کا ساغر ثابت ہوا۔

(۱۸۳۲) پس ساقی نے ہماری صبوحی (صبح کے نقل شراب) کی خاطر وہ ایک پرزر جام ہمارے آگے لاکے رکھ دیا۔

(۱۸۳۳) بادشاہ کی محفل آراستہ ہوئی۔ اور اس امن امان کے کعبہ کا دروازہ کھلا۔

(۱۸۳۴) اس خسروِ آفاق (دنیا کے بادشاہ۔) کے سر پر جو تاج زریں سجا تو مہر تاباں سے زیادہ زیبندہ نظر آیا۔

(۱۸۳۵) شاہ روشن دل بہادر شاہ۔ کہ جس پر زندگی کے بھید کھلے ہوئے ہیں۔

(۱۸۳۶) وہ ایسا ہے۔ کہ اس کے پیدا ہونے کے سبب نو آسمانوں اور سات ستاروں کا یہ مقصد معلوم ہوا۔ کہ سب اسی کی خاطر پیدا کئے

گئے تھے۔

(۱۸۳۷) ناخن تاویل۔ شرح کرنے والے ناخن۔ مراد مطلب کو واضح کرنے والا۔ وہ کہ جس کے ناخن تاویل سے نبی کے حکموں کی گرہ کھلی یعنی وہ احکام اس نے بیان کئے۔

(۱۸۳۸) جب اس کے سپاہیوں کی فہرست کھلی۔ تو سب سے پہلے بادشاہ دارا ہی کا نام نکل آیا۔

(۱۸۳۹) اس کے روشناس اشخاص کی جو فہرست ہے۔ وہاں قیصر روم کا چہرہ لکھا ہوا ہے۔

(۱۸۴۰) بادشاہ کے گھوڑے کی یہ صفت ہے۔ کہ وہ صرصر باد رفتار گھوڑا جب اپنے

(۱۸۴۱) تھان سے کھلا۔ تو اس کے نقش پا کی صورتیں ایسی دلفریب ہوتی ہیں۔ کہ تو کہیگا کہ بتخانہ آذر کھل گیا۔

(۱۸۴۲) مجھکو بادشاہ کے فیضان تربیت سے یہ بات معلوم ہو گئی۔ کہ سورج چاند اور زمین کا محور کیا کام کرتے ہیں۔ (محور وہ فرضی خط زمین جس کے اردگرد دنیا گھومتی ہے۔

(۱۸۴۳) میرے دل میں لاکھوں عقدے تھے۔ لیکن ہر ایک میری حد کوشش سے زیادہ (بادشاہ کی فیض کی بدولت) کھلا۔

(۱۸۴۴) میرا ایک بند ہو چکا ہوا دل ایسا تالا تھا۔ کہ جس کی کنجی نہیں ملتی تھی۔ مگر کیا کہوں کس نے کھولا۔ کب کھلا۔ اور یہ کس طرح کھلا۔ (مراد بادشاہ کی بدولت۔)

(۱۸۴۵) میں باغ معانی کی بہار دکھاؤں گا۔ اگر مجھ پر وہ شاہ سخن

گستر یعنی شاعر بادشاہ مجھ پہ متوجہ ہوا۔

(۱۸۴۶) جس وقت میرا نفس (سانس) غزل سرائی میں مصروف ہو میں چاہتا ہوں کہ لوگ یہ جانیں۔ کہ مشک عنبر کا ڈبہ کھل گیا۔ گویا میری غزل کی خوشبو سے دربار مہک جائے۔

غزل

(۱۸۴۷) کنج میں بیٹھا رہوں یوں پر کھلا
کاش کہ ہوتا قفس کا در کھلا

(۱۸۴۸) ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائے
یار کا دروازہ پائیں گر کھلا

(۱۸۴۹) ہم کو ہے اس رازداری پر گھمنڈ
دوست کا ہے راز دشمن پر کھلا

(۱۸۵۰) واقعی دل پر بھلا لگتا تھا داغ
زخم لیکن داغ سے بہتر کھلا

(۱۸۵۱) ہاتھ سے رکھ دی کب ابرو نے کمان
کب کمر سے غمزہ کی خنجر کھلا

(۱۸۵۲) مفت کا کس کو برا ہے بدرقہ
رہروی میں پردۂ رہبر کھلا

سوز دل کا کیا کرے باران اشک (۱۸۵۳)
آگ بھڑکی مینہ اگر دم بھر کھلا

(۱۸۵۴) نامہ کے ساتھ آگیا پیغام مرگ
رہ گیا خط میری چھاتی پر کھلا

دیکھو غالبؔ سے اگر اُلجھے کوئی (۱۸۵۵)
ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھُلا

(۱۸۴۶) میں کب تک ایک کوٹھے میں پڑا رہوں۔ کاش کہ پنجرے کا دروازہ کھلا ہوتا اور میں اڑ جاتا۔

(۱۸۴۸) ہم دوست کے دروازہ پر جاکر دروازہ کھولے جانے کی استدعا کریں۔ اور وہ ہمارے لئے کھولا جائے۔ تو ہم خوشی سے اُس میں جائیں گے۔ (کیونکہ ہمیں معلوم ہو جائیگا۔ کہ ہماری کچھ چاہت دوست کے دل میں ہے۔ کہ اُس نے دروازہ کھولا) ورنہ یوں ہم اُس کے در پر گئے۔ اور وہاں پہلے ہی دروازہ کھلا ہوا دیکھا تو ہمارا دل کب گوارا کریگا۔ کہ اندر جائیں۔ ہمیں تو اُسی وقت کھٹک جائیگا۔ کہ غیر ضرور اس گھر کے اندر موجود ہے۔ یا اور کوئی شخص۔ کیونکہ دروازہ کھلا ہوا ہے۔

(۱۸۴۹) ہم کو جس راز عشق پر گھمنڈ تھا۔ کہ وہ کسی کو معلوم نہیں وہ دوست کا راز جب دشمن پر کھل گیا ہے۔ تو پھر یہ گھمنڈ کیسا ہے۔

(۱۸۵۰) داغ ہمارے دل پر فی الحقیقت خوشنما معلوم ہوتا تھا۔ لیکن یہ زخم جگر تو اس داغ سے بھی کچھ زیادہ اچھا نظر آتا ہے۔

یعنی پہلے حرف غم تھا۔ اب وہ غم ترقی کرکے زخم جگر بن گیا ہے۔)

(۱۸۵۱) آپ کی بھوؤں نے کب تیر نظر کی کمان رکھدی یعنی دیکھنا چھوڑ دیا۔ اور کب آپ نے ناز و غمزے کے خنجر چلانے کا قصد ترک کر دیا (مرے کھولا مراد ترک قصد کر دیا۔)

(۱۸۵۲) راہبری میں راہبر کا یہ پردہ کھُلا کہ وہ راستہ ہی نہیں جانتا (یعنی اس کا یہی پردہ کھل سکتا تھا۔ کہ وہ راستہ سے ناواقف ہو۔ سو وہ کھل گیا۔) اب وہ ہمارا ایک ساتھی ہے۔ تو ایسا بدرقہ یا رہبر کس کو برا معلوم ہوگا۔ کیونکہ اب اس کو کچھ دینا نہیں پڑیگا۔

(۱۸۵۳) قاعدہ ہے کہ گرمی کی برسات زمین کی حرارت کو زیادہ پیدا کرتی ہے۔ لہذا کہتا ہے کہ آنسوؤں کی بارش سے کہ جو سوز دل پر پڑی تھی۔ اور سوز دل بھڑک اُٹھا۔ اب اس کا کیا بندوبست کیا جائے یہ تو ایسا ہے جیسا کہ مینہ ذرا برس کے تھم جائے تو زمین سے اور زیادہ حرارت اُٹھنے لگتی ہے۔

(۱۸۵۴) دوست کا خط اُس وقت پہنچا۔ کہ پیام مرگ بھی ساتھ ہی آگیا۔ اور وہ خط بن دیکھے میری چھاتی پر کھلا پڑا تھا۔ کہ میرا دم نکل گیا۔

(۱۸۵۵) ذرا ہوشیار رہنا۔ غالب سے کوئی لڑائی بھڑائی مت کر بیٹھے وہ بظاہر کافر سا نظر آتا ہے۔ مگر درحقیقت ایک ولی ہے۔ اور ولی سے سب ڈرا کرتے ہیں۔

پھر ہوا مدحت طرازی کا خیال (۱۸۵۶)
پھر مہ و خورشید کا دفتر کھلا

(۱۸۷۱) بادشاہ کے آگے جو آئینہ دھرا ہے۔ اس سے سکندر کو اپنی سعی کے انجام کا حال کھلا۔ یعنی اُس نے جانا ہے کہ اسی بادشاہ کے لئے یہ آئینہ بنایا تھا۔

(۱۸۷۲) طغرل اور سنجر کے فریب کی اب قلعی کھلی۔ کہ وہ اصل وارث ملک نہیں تھے۔ بلکہ ہمارا بادشاہ کہ جس کو اب لوگوں نے صرف دیکھا ہے کہ وہ وارث ملک ہے۔

(۱۸۷۳) اس کی تعریف تو کیا ہو سکتی ہے۔ ہاں ایک کہنے کی بات ہے کہ اس زمانے کے بادشاہ کی تعریف کا دفتر کھل ہوا ہے۔

(۱۸۷۴) اگرچہ سخن گستر یعنی شاعر کی فکر اچھی ہے۔ مگر جب مدح کا اتمام ہو گیا۔ تو ظاہر ہو گیا کہ وہ اپنا مجاز رکھنے سے قاصر رہا۔

(۱۸۷۵) اے نامور خاقان (بادشاہ) میں جانتا ہوں کہ تم پر لوحِ ازل کے خط یعنی اس کی تحریر کا حال معلوم ہے۔ یعنی تو غیب دان ہے۔ تو پھر میرا حال ہے میں کیا عرض کروں۔

(۱۸۷۶) جب تک اس دنیا میں دن اور رات کے خلیہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ یعنی شب و روز اپنے عجیب و غریب تماشے دکھا رہے ہیں۔ اے بادشاہ تم بھی اس دولت تک صاحبقراں بنے رہو۔ (صاحبقراں وہ جلیل القدر بادشاہ کہ جس کی قسمت کا ستارہ موافق واقع ہوا ہو۔)

در صفت انبہ

(۱۸۷۸) ہاں دلِ درد مند زمزمہ ساز
کیوں نہ کھولے درِ خزینۂ راز

(۱۸۷۹) خامہ کا صفحہ پر رواں ہونا
شاخ گل کا ہے گلفشاں ہونا

(۱۸۸۰) مجھ سے کیا پوچھتا ہے کیا لکھیے
نکتہ ہائے خرد فزا لکھیے

(۱۸۸۱) بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے
خامہ نخل رطب فشاں ہو جائے

(۱۸۸۲) آم کا کون مرد میدان ہے
ثمر و شاخ گوئے و چوگان ہے

(۱۸۸۳) تاک کے جی میں کیوں رہے ارمان
آئے یہ گوئے اور یہ میدان

(۱۸۸۴) آم کے آگے پیش جاوے خاک
پھوڑتا ہے جلے پھپھولے تاک

(۱۸۸۵) نہ چلا جب کسی طرح مقدور
بادۂ ناب بن گیا انگور

(۱۸۸۶) یہ بھی ناچار جی کا کھونا ہے
شرم سے پانی پانی ہونا ہے

(۱۸۷۷) مجھ سے پوچھو تمہیں خبر کیا ہے
آم کے آگے نیشکر کیا ہے

نہ گل اُس میں نہ شاخ و برگ نہ بار (۱۸۷۸)
جب خزاں آئے تب ہو اُسکی بہار

(۱۸۷۹) اور دوڑائیے قیاس کہاں
جانِ شیریں میں یہ مٹھاس کہاں

جان میں ہوتی گر یہ شیرینی (۱۸۸۰)
کوہکن باوجود غمگینی

(۱۸۸۱) جان دینے میں اُس کو یکتا جان
پر وہ یوں سہل دے نہ سکتا جان

نظر آتا ہے یوں مجھے یہ ثمر (۱۸۸۲)
کہ دوا خانۂ ازل میں مگر

(۱۸۸۳) آتشِ گل پہ قند کا ہے قوام
شیرے کے تار کا ہے ریشہ نام

یا یہ ہوگا کہ فرطِ رافت سے (۱۸۸۴)
باغبانوں نے باغِ جنت سے

(۱۸۸۵) انگبیں کے بہ حکمِ رب الناس
بھر کے بھیجے ہیں سر بمہر گلاس

یا لگا کر خضر نے شاخِ نبات (۱۸۸۶)
مدتوں تک دیا ہے آبِ حیات

(۱۸۸۷) تب ہوا ہے ثمر فشاں یہ نخل
ہم کہاں ورنہ اور کہاں یہ نخل

تھا ترنجِ زر ایک خسرو پاس (۱۸۸۸)
رنگ کا زرد پر کہاں بو باس

(۱۸۸۹) آم کو دیکھتا اگر یک بار
پھینک دیتا طلائے دست افشار

رونقِ کارگاہِ برگ و نوا (۱۸۹۰)
نازشِ دودمانِ آب و ہوا

(۱۸۹۱) رہرو راہِ خلد کا توشہ
طوبیٰ و سدرہ کا جگر گوشہ

صاحبِ شاخ و برگ و بار ہے آم (۱۸۹۲)
نازپروردۂ بہار ہے آم

(۱۸۹۳) خاص وہ آم جو نہ ارزاں ہو
نو برِ نخلِ باغِ سلطاں ہو

وہ کہ ہے والیِ ولایتِ عہد (۱۸۹۴)
عدل سے اُس کے ہے حمایتِ عہد

(۱۸۹۵) فخرِ دیں عزِ شان و جاہ و جلال
زینتِ طینت و جمالِ کمال

کارفرمائے دین و دولت و بخت (۱۸۹۶)
چہرہ آرائے تاج و مسند و تخت

(۱۸۹۷) سایہ اُس کا ہُما کا سایہ ہے
خلق پر وہ خدا کا سایہ ہے
اے مفیض وجود سایہ و نُور (۱۸۹۸)
جب تلک ہے نمود سایہ و نُور
(۱۸۹۹) اس خداوند بندہ پرور کو
وارث گنج و تخت و افسر کو
شاد و دل شاد و شادماں رکھیو (۱۹۰۰)
اور غالبؔ پہ مہرباں رکھیو

(۱۸۶۸) ہاں اے میرے دکھیا دل جو زمزمہ ساز یعنی شعر بناتا ہے تو کس لئے بھید کے خزانے کا منہ نہیں کھولتا۔ یعنی کس لئے اپنے دل کی باتیں نہیں بتاتا۔

(۱۸۶۹) قلم کا صفحہ کاغذ پر چلنا۔ مراد لکھنا۔ گویا پھولوں کی ٹہنی کا پھول پر سانا ہے۔

(۱۸۷۰) اے دل تو مجھ سے کیا پوچھتا ہے۔ کہ کیا لکھنا چاہیے ایسے نکتے اور قیمتی باتیں لکھئے۔ کہ جن سے پڑھنے والے کی عقل بڑھے۔

(۱۸۷۱) بارے یعنی غرض۔ المختصر۔

حل شعر۔ غرض آموں کا کچھ بیان لکھا جائے۔ تاکہ ہمارا قلم نخل رطب فشاں یعنی ایسا پودا بن جائے کہ جس سے شیرینی ٹپکتی ہو۔

(۱۸۷۲) آم کے سامنے کون "مرد میدان" ہے۔ یعنی کون

پہلوانوں کی طرح میدان میں نکل کر اس کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ گویا آم کا پھل یعنی خود آم تو گیند ہے۔ اور اس کی شاخ بلا ہے۔ مراد آم کا درخت مقابلے کو نکلا ہے۔ کہ باغ میں اس کے آگے اور پھلدار درخت کیا حقیقت رکھتے ہیں۔

(۱۸۷۳) تاک یا انگور کی بیل کے دل میں کچھ ارمان (جنگ کرنے کا) نہ رہ جائے۔ وہ آئے "یہ ہیں گو یہیں میدان" یعنی اس کا پھل تو گیند ہے (کیونکہ انگور گول مول سا ہوتا ہے) اور یہی میدان ہے۔ یعنی مقابلہ کرنے کا ساز و سامان۔ تو وہ بھی کہتا ہے کہ پھر آئے۔

(۱۸۷۴) بھلا انگور کی آم کے آگے کیا پیش چل سکتی ہے۔ یہ تاک (انگور) اپنے جلے پھپھولے پھوڑتا ہے۔ یعنی محض اپنا غصہ نکالتا ہے مراد پھپھولے پھوڑنا مراد حسد سے دل کا جلانا یا غصہ نکالنا)

(۱۸۷۵) انگور کا جب آم کے سامنے کچھ مقدور نہ چلا یعنی زور نہ چلا تو ایک خالص انگوری شراب بن گیا۔

(۱۸۷۶) یہ بھی آخرکار جی کا کھونا ہے۔ یعنی ہمت ہارنا ہے (کہ انگور ایک قسم کی شراب بن کے رہ گیا۔) گویا وہ شرم سے پانی پانی ہوا جاتا ہے۔

(۱۸۷۷) اجی تم کو خبر کیا ہے۔ مجھ سے پوچھو۔ یہ انگور تو خیر۔ آم کے آگے جو اس قدر مٹھاس سے بھرا ہے۔ اس کی بھی کچھ حقیقت نہیں ہے۔

(۱۸۷۸) نیشکر ہیں نہ تو کوئی پھول۔ نہ اس کی کوئی ٹہنی۔ نہ پتہ اور نہ پھل (لنڈ منڈ سا تو وہ ہے) اور جب خزاں آئے تو اس کی بہار

ہوتی ہے۔ یعنی موسم سرما میں گنا پیدا ہوتا ہے۔

(۱۸۷۹) گنے کے متعلق اور کیا کیا خیال دوڑائے۔ خود "جان شیریں" میں ایسی شیرینی کہاں جو آم سے حاصل ہوتی ہے۔ (مراد یہ کہ جان شیریں یعنی پیاری سہی وہ کوئی چکھی تو نہیں جا سکتی۔ کہ مٹھاس دے)

(۱۸۸۰ و ۱۸۸۱) اگر جان میں آم کیسی مٹھاس ہوتی۔ تو کوہکن (فرہاد) باوجود اپنے غم و رنج عشق کے۔ اپنی جان یوں آسانی سے ضائع نہ کر دیتا۔ (یعنی ایک تیشہ سر پر مار کر فوراً مر گیا۔) باوجودیکہ جان دینے میں وہ (بہ زمرہ عشاق) ایک بے مثل آدمی تھا۔ مطلب یہ کہ جان میں اگر کچھ مٹھاس ہوتی۔ جیسے کہ آم میں تو وہ اُس مٹھاس کے لالچ میں جان دینے میں کچھ دن اور لگاتا۔

(۱۸۸۲ و ۱۸۸۳) مجھ کو تو یہ پھل اس طرح کا دکھائی دیتا ہے۔ کہ شاید ازل کے دوائی خانہ میں (آم ایک قسم کا شربت بنایا گیا ہے۔ اور وہ اس طرح کہ) پھول کی آگ یعنی سُرخ گلاب کی شوخ رنگت جو آگ سے مشابہ ہوا کرتی ہے۔ اس پر کھانڈ کا قوام پکا لیا گیا ہے۔ اور اس قوام یا شیرہ میں جو تار ہے۔ (شربت میں تار ہوا کرتا ہے۔) وہ آم ہی کا ریشہ ہے (قوام میں تار پیدا کر کے امتحان کیا کرتے ہیں۔ کہ شربت گاڑھا ہے یا پتلا)۔

(۱۸۸۴ و ۱۸۸۵) یا یہ بات ہوگی۔ کہ وفور محبت کے باعث باغبانوں نے جنت کے باغ سے رب الناس یعنی رب العالمین کے حکم سے شہد کے گلاس بھر کے اور ان کو مُہر لگا کے دنیا میں بھیجدیا ہے۔ (آم کی مُہر وہ ڈنٹھل کا نشان یا گرہ سی جو آم کے منہ پہ ہوا کرتی ہے)

(۱۸۸۶ و ۱۸۸۷) یا یہ کہ خواجہ خضر نے ایک قند کی شاخ لگا کر مدت تک اس کو آب حیات سے پرورش کیا ہے۔ اور اس میں جو پھل لگا ہے۔ وہ آم ہے۔ ورنہ ہم کہاں۔ اور خواجہ خضر کا یہ پودا کہاں۔

(۱۸۸۸ و ۱۸۸۹) کہتے ہیں۔ کہ خسرو پرویز کے پاس ایک قسم کا نرم کندن تھا۔ کہ اس کو دبا کر جو چیز سونے کی طرح چمکنے والی چاہتے بنا سکتے تھے۔

حل شعر۔ خسرو کے پاس ایک کندن کا بنایا ہوا بڑا لیمو تھا۔ جو کہ ترنج تھا۔ اُس کا رنگ تو آم کی طرح زرد تھا۔ مگر آم کیسی خوشبو نہیں رکھتا تھا۔ اگر خسرو آم کو ایک دفعہ دیکھ پاتا تو وہ طلائے دست افشار یعنی ایسا سونا کہ ہاتھ سے دبائیں تو دب جائے۔ فوراً پھینک دیتا۔ مراد یہ کہ خسرو پرویز اس کندن کی ترنج بنا کے دسترخوان پر رکھا کرتا تھا۔ اگر آم سے واقف ہوتا۔ تو اسی کو اپنی میز پر رکھتا۔

(۱۸۹۰) آم کیا ہے۔ کارخانہ برگ و نوا۔ یعنی باغ کے کارخانے کی رونق ہے۔ اور یہ آب و ہوا کے خاندان کا فخر ہے۔ برگ بمعنی پتے۔ نوا۔ جانوروں کا گانا۔ یہ دونوں باتیں باغ سے تعلق رکھتی ہیں۔

(۱۸۹۱) آم اُس مسافر کا زادِ راہ ہے۔ جو کہ بہشت کی طرف جا رہا ہو۔ اور یہ جنت کے دو درختوں۔ طوبیٰ اور سدرہ کا جگر گوشہ یعنی ان کا ایک عزیز ہے۔ کہتے ہیں کہ جو شخص شہد کھا کر مرے اُس پر دوزخ کی آگ اثر نہیں کرتی۔ غالب یہاں آم کو وہ مرتبہ دینے کے لئے توشہ جنت کہتا ہے۔

(۱۸۹۲ و ۱۸۹۳) آم بہت سا ساز و سامان رکھنے والا

"ایک صاحب" ہے یعنی مالک برگ و بار و شاخ ہے۔ یہ موسم بہار کا ناز پروردہ یعنی اس کا لاڈلا ہے۔ کہ بہار بھی اس سے اپنا جی بہلاتی اور خوش ہوتی ہے۔ (آم فی الحقیقت بہت خوشنما نظر آتا ہے۔ جب کہ اس کی شاخیں پہلے نکلتی ہیں۔ پھر پتے پیدا ہوتے ہیں۔ بور آتا اور آخر پھل لگنے کے پودا اپنی بہار دکھانے لگتا ہے۔)

خصوصاً وہ آم جو کہ ارزاں یعنی بازاری نہ ہو۔ یعنی بادشاہ دہلی کے باغ کا نوبر نخل یعنی ایسا آم جو درخت میں تازہ لگا ہوا ہو یہ پہلی پھل (دلی کے قلعہ میں ایک بڑا باغ تھا۔ جس کے "آم" بادشاہوں اور بیگموں کے کھانے کے لائق ہوا کرتے تھے۔ یہاں اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔)

(۱۸۹۴) وہ بادشاہ (بہادر شاہ ظفر) جو کہ عہد یا اس وقت کی ولایت یا ملک کا والی وارث ہے۔ (مراد رعایا نے اپنا اسے بادشاہ جانا ہے) اور وہ اپنے عدل و انصاف سے، اہل زمانہ کی حمایت کرتا ہے۔

(۱۸۹۵) وہ دین کے لئے باعث افتخار ہے۔ اور جاہ و جلال کے لئے گویا موجب عزت و شان و شوکت ہے۔ اسی طرح وہ طینت یعنی خصلت کے لئے ایک زینت ہے۔ اور کمال کے لئے خوبصورتی و خوش وصفی۔

(۱۸۹۶) وہ دین۔ دولت۔ اور نصیب سب کا کارفرما یا سربراہ ہے۔ اسی سے تاج۔ تخت۔ اور مسند تکیہ لگا کر بیٹھنے کی جگہ مراد تکیہ گاہ جو امراء کے لئے ایک مکلف فرش بچھایا جاتا ہے) اپنی چہرہ آرائی کرتے ہیں۔ یعنی اس سے انکو یہ شکل و صورت مثلاً تاج اور تخت یہی حاصل ہوتی ہے۔

(۱۸۹۷) اس کا سایہ ہما کا سا سایہ ہے۔ (کہ جس پر پڑے اس کا نصیبہ جاگ اٹھتا ہے۔) اور خلقت کے لئے وہ ظل اللہ ہے۔ کہ جو بادشاہوں کا ایک خطاب ہے۔ یعنی "خدا کا سایہ" مراد ہے کہ وہ خدا کا سایہ ہے۔ اور اس کا یہ سایہ۔ سایہ ہما ہے۔ پھر اس کے سایہ میں رعایا کا نصیبہ کیوں نہ بیدار ہو۔

(۱۸۹۸ تا ۱۹۰۰) اے خدا جو سایہ اور نور کے وجود کو مستفید کرتا ہے۔ جب تک سایہ اور نور اپنی نمود دکھایا کریں۔ اس خداوند جہاں پرور۔ اور تاج و تخت کے خزانے کے وارث کو ہمیشہ شاد و دلشاد۔ اور بہت خوش رکھیو۔ اور خدایا وہ قالب پر مہربان رہے۔

قطعات

اے شہنشاہ فلک منظر بے مثل و نظیر (۱۹۰۱)
اے جہاندار کرم شیوۂ بے شبہ و عدیل
(۱۹۰۲) پاؤں سے تیرے ملے فرق ارادت اورنگ
فرق سے تیرے کرے کسب سعادت اکلیل
تیرا انداز سخن شانۂ زلف الہام (۱۹۰۳)
تیری رفتار قلم جنبش بال جبرئیل

(۱۹۰۴) تجھ سے عالم پہ کھلا رابطۂ قربِ کلیم
تجھ سے دنیا میں بچھا مائدۂ بذلِ خلیل

بہ سخن اوج دِہِ مرتبۂ معنی و لفظ (۱۹۰۵)
بہ کرم داغ نہ ناصیۂ قلزم و نیل

(۱۹۰۶) تا ترے وقت میں ہو عیش و طرب کی توفیر
تا ترے عہد میں ہو رنج و الم کی تقلیل

ماہ نے چھوڑ دیا ثور سے جانا باہر (۱۹۰۷)
زہرہ نے ترک کیا حوت سے کرنا تحویل

(۱۹۰۸) تیری دانش مری اصلاحِ مفاسد کی رہین
تیری بخشش مرے انجاحِ مقاصد کی کفیل

تیرا اقبالِ ترحم مرے جینے کی نوید (۱۹۰۹)
تیرا اندازِ تغافل مرے مرنے کی دلیل

(۱۹۱۰) بختِ ناساز نے چاہا کہ نہ دے مجکو اماں
چرخِ کجباز نے چاہا کہ کرے مجکو ذلیل

پیچھے ڈالے ہے سرِ رشتۂ اوقات میں گانٹھ (۱۹۱۱)
پہلے ٹھونکے ہے بنِ ناخنِ تدبیر میں کیل

(۱۹۱۲) تپشِ دل نہیں بے رابطۂ خوفِ عظیم
کششِ دم نہیں بے رابطۂ جرِ ثقیل

دُرِ معنی سے مرا صفحہ لقا کی ڈاڑھی (۱۹۱۳)
غمِ گیتی سے مرا سینہ عمر کی زنبیل

(۱۹۱۴) فکر میری گہر اندوزِ اشاراتِ کثیر
کلک میری رقم آموزِ عباراتِ قلیل

میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدق توضیح (۱۹۱۵)
میرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل

(۱۹۱۶) نیک ہوتی مری حالت تو نہ دیتا تکلیف
جمع ہوتی مری خاطر تو نہ کرتا تعجیل

قبلۂ کون و مکاں خستہ نوازی میں یہ دیر (۱۹۱۷)
کعبۂ امن و اماں عقدہ کشائی میں یہ ڈھیل

(۱۹۰۱ و ۱۹۰۲) اے بادشاہ جو کہ رتبے میں فلک منظر ہے۔ جیسے آسمان بہت بلند نظر آتا ہے۔ اور بے مثل اور لاثانی ہے۔ اور اے جہاندار (یا بادشاہ) کہ بے شک و شبہ کرم و بخشش کی عادت رکھنے والا ہے۔ اور عدیل یعنی ایک منصف بادشاہ بھی ہے۔ (مراد یہ کہ وہ بادشاہ جو بلند مرتبہ ہے سخی ہے۔ اور منصف ہے۔ تیرے پاؤں سے تخت اپنے اعتقاد و اعتماد کا سر لے۔ یعنی دل سے اس پر قربان رہے۔ اور اکلیل (تاج) جو تیرے سر پر ہے۔ وہ تیرے سر سے اپنی سعادت (خوش نصیبی) حاصل کرے۔

(۱۹۰۳) تیرا اندازِ سخن زلفِ الہام کو بھی شانہ یعنی کنگھی کرتا ہے۔ مراد وہ الہام کو بھی متحرک کر سکتا ہے۔ گویا اس قدر الہام اثر ہے۔ اور تیرے قلم کی رفتار جبریل فرشتہ کی پرواز کی حرکت ہے۔ یعنی جبریل جو وحی لایا کرتا ہے تو اس کی پرواز تیری رفتارِ قلم سے مستفید

ہوا کرتی ہے۔

(۱۹۰۴) تجھ کو خدا سے قریب دیکھکر معلوم ہوا۔ کہ موسٰی کا خدا کے ساتھ قرب کا تعلق یا واسطہ کیسا تھا۔ اور تجھ ہی سے دنیا میں وہ مہمان نوازی دیکھی گئی۔ کہ جس سے حضرت ابراہیم کی سخاوت کا دسترخوان بچھایا گیا تھا۔ مراد یہ کہ تو حضرت موسٰی اور ابراہیم کا نمونہ ہے۔

(۱۹۰۵) تیرے کلام سے لفظ اور اس کے معنی کا مرتبہ بلند ہو جاتا ہے۔ حضور تو ہی اپنے کرم سے قلزم اور نیل جیسے دریاؤں کی پیشانی پر داغ لگانے والا ہے۔ یعنی وہ تیری بخشش سے شرمندہ ہو جاتے ہیں۔

(۱۹۰۶ و ۱۹۰۷) تاکہ تیرے عہد میں عیش اور خوشی کی توفیر یعنی زیادتی ہو۔ اور تاکہ تیرے زمانہ میں رنج و غم کی تقلیل یعنی کمی ہو۔ چاند نے برج ثور سے باہر جانا چھوڑ دیا۔ اور زہرہ نے برج حوت سے تحویل کرنا یعنی اس سے پھر جانا۔ ترک کر دیا۔ (علم نجوم میں چاند اور زہرہ کا برج ثور و حوت میں ہونا مبارک سمجھا جاتا ہے)

(۱۹۰۸) تیری عقل سے میری خرابیوں یا بگڑے کاموں کی جو اصلاح ہوتی ہے۔ اس کار خیر میں گویا تیری عقل رہن (گرو شدہ ہے) یا شب و روز مصروف ہے۔ اور تیری بخشش میرے مقاصد کے انجاح (یعنی حل کرنے) کی ضامن ہے۔

(۱۹۰۹) اقبال ترحم۔ بہ معنی التفات رحم۔ یعنی رحم کی طرف مائل رہنا۔ میرے لئے جینے کی خوشخبری ہے۔ اور تیری غفلت کا رنگ ڈھنگ میرے لئے موت کا سبب ہے۔

(۱۹۱۰ و ۱۹۱۱) میرے ناموافق نصیبے نے چاہا کہ وہ مجھ کو امن سے نہ رہنے دے۔ اور اس کجباز (یعنی ہمیشہ ٹیڑھے چلنے والے) آسمان نے چاہا کہ وہ مجھ کو ذلیل کرے۔ لہذا پہلے ناخن تدبیر (جس سے میں کوئی عقدۂ مشکل حل کر سکتا تھا) اس کی جڑ میں ایک کیل ٹھونک دی۔ اور اس کے بعد میری اوقات بسری کے سر رشتے (دھاگے) میں گرہ ڈال دی ہے یعنی ناخن تدبیر بیکار کر کے میری بسر اوقات کا سلسلہ بند کر دیا۔

(۱۹۱۲) میرے دل کی بے چینی خوف عظیم کے رابطہ یا اس کے تعلق کے بغیر نہیں ہوتی۔ اور میرا دم لینا توجہ تقلیل کے ضابطہ یا عمل دخل کے بغیر گویا ممکن ہی نہیں۔ مراد یہ کہ دم کا آنا ایسا مشکل ہو گیا ہے کہ کشش ثقل ہی اس کو کھینچکر باہر لا سکتی ہے۔

(۱۹۱۳) میرا یہ صفحہ مدح شاہ معنی کے موتیوں کے لحاظ سے لقا کی ڈاڑھی بن گیا ہے۔ (لقا اپنی ڈاڑھی کے بالوں میں موتی پرو دیا کرتا تھا۔) اور دنیا کے غموں سے میرا سینہ گویا عمر عیار کی زنبیل ہے۔ (یعنی اس میں دنیا بھر کے رنج سمائے ہوئے ہیں جیسے کہ عمر عیار کے کاسہ میں تمام عالم کی اشیاء بھری رہتی تھیں۔)

(۱۹۱۴) میری یہ فکر یعنی فکر سخن یا شاعری ایسی ہے۔ کہ اس میں کثیر اشارات یا حوالات کے جوہر میں بھر دیتا ہوں۔ مگر باوجود اس کے میرا قلم بہت تھوڑی عبارت میں اتنے کثیر معانی کے لکھنے کی طرز سکھانے والا ہے۔ مراد یہ کہ میں کثیر المعانی مضامین کو بہت مختصر الفاظ میں ادا کر سکتا ہوں۔ کہ جس کی اور وں کو تقلید کرنی چاہئے۔

(۱۹۱۵) میرے ابہام یعنی مبہم و مشکوک شعروں پر بھی توضیح (یعنی کسی بات کا مفصل بیان) قربان ہوتا ہے۔ اور میرے اجمال یعنی

مجمل طور پر بیان کرنے سے تفصیل (مفصل تحریر کرنا) ٹپکا پڑتا ہے۔

(۱۹۱۶) اگر میری حالت اچھی ہوتی۔ تو یوں مدح سرائی کرکے کسی بخشش کی خاطر آپ کو تکلیف نہ دیتا۔ اور اگر مجھ کو دلجمعی حاصل ہوتی تو عرض مدعا کرنے میں ایسی جلدی نہ کرتا۔

(۱۹۱۷) اے قبلۂ کون و مکاں یعنی اے موجودات عالم کے بزرگ میرے جیسے خستہ (بدحال) شاعر پر مہربان ہونے میں اتنی دیر کیونکر ہوئی۔ اور اے امن و امان کی دنیا کے کعبہ یعنی تو جو سب کو دکھوں سے امن دینے والا ہے۔ میری مشکل کے حل کرنے میں اتنی دیر تو نے کیسے لگادی۔

قطعہ

گئے وہ دن کہ نادانستہ غیروں کی وفاداری (۱۹۱۸)
کیا کرتے تھے تم تقریر ہم خاموش رہتے تھے

(۱۹۱۹) بس اب بگڑے پہ کیا شرمندگی جانے دو ملجاؤ
قسم لو ہم سے گر یہ بھی کہیں کیوں ہم نہ کہتے تھے

(۱۹۱۸) اب وہ زمانہ گیا کہ تم (انجام سے) بےخبری کے باعث
(۱۹۱۹) غیروں کی وفاداری کے متعلق ہم سے بات چیت کیا کرتے تھے۔ اور ہم چپکے سنا کرتے تھے۔ اب اُن غیروں سے تمہاری بگڑ گئی تو بس جانے دو۔ اس میں شرم محسوس کرنے کی کونسی بات ہے۔ تم ہم سے ملجاؤ اور ہم سے قسم لے لو۔ اگر تم کو ہم اتنا بھی کہیں کہ "دیکھا کیا ہم کہا نہیں

کرتے تھے۔ کہ تم غیروں سے نہ ملا کرو۔ کیونکہ اس کا انجام اچھا نہیں ہوئیگا۔

قطعہ

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں (۱۹۲۰)
اک تیر میرے سینہ میں مارا کہ ہائے ہائے

(۱۹۲۱) وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب
وہ نازنین بتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے

صبر آزما وہ اُن کی نگاہیں کہ حف نظر (۱۹۲۲)
طاقت ربادہ اُن کا اشارا کہ ہائے ہائے

(۱۹۲۳) وہ میوہ ہائے تازہ و شیریں کہ واہ واہ
وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے

(۱۹۲۰) اپنے ایک مقدمے کے متعلق میرزا صاحب کلکتہ گئے
تا تھے۔ شاید بنگال کے میوہ جات۔ وہاں کی انگریز
(۱۹۲۳) شراب اور اس وقت دلی کی نسبت یورپین لیڈیوں
کا وہاں بافراط ہونا۔ اس قطعہ کی بنائے تصنیف ہے۔
کہتے ہیں۔ اے ہمدم تو نے جو کلکتہ کا ذکر کیا۔ تو گویا میرے سینے میں (کلکتہ
کی یاد دلاکے) ایک ایسا تیر مار دیا ہے۔ کہ سخت حسرت پیدا ہوگئی ہے۔
وہ سبزہ زار یعنی باغ اور درخت اور پودے جو اس قدر مطرا یعنی
برسات سے تروتازہ ہورہے ہیں۔ (کیونکہ بنگال میں بارش بکثرت ہوتی ہے

اور وہ نازنین خود آرا معشوق (اگی یاد غضب ہے)

ہائے ہائے ان کی وہ ہمارے صبر کو آزمانے والی نگاہیں کہ جن سے دشمن کی نظر دور رہے۔ اور آہ وہ اُن کے طاقت رُبا غمزے اور اشارے بس کیا کہوں۔

وہ تازہ بتازہ میوے جو اس قدر میٹھے تھے کہ واہ واہ۔ اور وہ دل کو پسند آنے والی خاص (بنگال کی انگریزی) شرابیں کہ اُن کا کیا کہنا ہے۔

در مدح ڈلی

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی (۱۹۲۴)
زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہئے

(۱۹۲۵) خامہ انگشت بہ دنداں کہ اسے کیا لکھئے
ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے

مہرِ مکتوب عزیزانِ گرامی کہئے (۱۹۲۶)
حرزِ بازوئے شگرفانِ خود آرا کہئے

(۱۹۲۷) مِسی آلودہ سر انگشتِ حسیناں لکھئے
داغ طرفِ جگرِ عاشقِ شیدا کہئے

خاتمِ دستِ سلیماں کے مشابہ لکھئے (۱۹۲۸)
سرِ پستانِ پریزادے مانا کہئے

(۱۹۲۹) اخترِ سوختۂ قیس سے نسبت دیجے
خالِ مشکینِ رخِ دلکشِ لیلا کہئے

حجرالاسودِ دیوارِ حرم کیجے فرض (۱۹۳۰)
نافہ آہوئے بیابانِ ختن کا کہئے

(۱۹۳۱) وضع میں اس کو سمجھ لیجئے قافِ تریاق
رنگ میں سبزۂ نوخیزِ مسیحا کہئے

صومعے میں اُسے ٹھیرایئے گر مہرِ نماز (۱۹۳۲)
میکدے میں اُسے خشتِ خُمِ صہبا کہئے

(۱۹۳۳) کیوں اسے قفلِ درِ گنجِ محبت لکھئے
کیوں اسے نقطۂ پرکارِ تمنا کہئے

کیوں اسے گوہرِ نایاب تصور کیجے (۱۹۳۴)
کیوں اسے مردمکِ دیدۂ عنقا کہئے

(۱۹۳۵) کیوں اُسے تکمۂ پیراہنِ لیلا لکھئے
کیوں اسے نقشِ پئے ناقۂ سلما کہئے

بندہ پرور کے کفِ دست کو دل کیجے فرض (۱۹۳۶)
اور اس چکنی سپاری کو سویدا کہئے

(۱۹۲۴) مصنف نے اردوئے معلیٰ میں تحریر کیا ہے کہ کلکتہ تا میں مولوی کرم حسین نے ایک چکنی ڈلی ہاتھ پر رکھکر
(۱۹۳۶) مجھ سے کہا کہ اس کے متعلق کچھ تشبیہات نظم کیجئے۔ میں نے نو دس شعر (جو اوپر درج کئے گئے ہیں) فی البدیہہ کہکر وہ

چکنی ڈلی اُن سے لی۔

قطعہ

آپ کی ہتھیلی پر جو چکنی ڈلی ہے۔ اس کی جس قدر تعریف کی جائے مناسب ہے قلم حیران ہے کہ اسے کیا لکھئے۔ اور زبان یا قوتِ گویائی تشویش میں ہے کہ اسے کیا کہنا چاہئے۔

اس کو اپنے گراں قدر عزیزوں کے خط کی مہر لکھ دیں۔ یا خود آرا معشوقوں کے بازو کا تعویذ کہنا چاہئے۔

اسے حسینوں کی مسی ملی ہوئی پور لکھئے۔ یا کسی عاشق شیدا کے جگر کے ایک طرف کا داغ تصور کیجئے۔

حضرت سلیمان کی انگوٹھی کے مشابہ سمجھئے۔ یا کسی پریزاد کے پستان کی بھٹنی سے متماثل کہا جائے (ماثا۔ مانند۔ متماثل)

مجنوں کے جلے ہوئے ستارے سے نسبت دیجئے۔ یا لیلےٰ کے دلکش رخسار کا سیاہ رنگ خال کہئے۔

اس کو خانہ کعبہ کی ایک دیوار میں جو سنگ اسود ہے۔ فرض کر لیجئے۔ یا دشت ختن کے ہرن کا مشک نافہ خیال کیجئے۔

اگر اس کو صورت میں تریاق کا "ق" سمجھئے۔ یعنی اس چھالیا کی شکل "ق" کی طرح گول مول ہے۔ تو اس کا رنگ کسی نو خیز مسیحا (نوجوان محبوب) کے سبزۂ رخ کی مانند ہے۔ (تریاق اور مسیحا کو بوجہ ایک مناسبت کے یہاں ایکساتھ استعمال کیا گیا ہے)

اگر عبادت خانے میں اس کو مہر نماز مان لیجئے۔ تو میکدے میں اسے

شراب کی شیشے کے نیچے کی اینٹ یا ٹھیکری فرض کر لیجئے۔ (صومعہ۔ عبادت خانہ۔ مہر نماز۔ کوئی ایسی چیز جس کو سامنے رکھکر سجدہ کیا جاتا ہے۔) دیکھو تشریح شعر ذیل سے

ہم عبادت کو ترا نقش قدم مُہرِ نماز
ہم ریاضت کو ترے حوصلے استظہار

اُسے کس لئے محبت کے فسانے کے دروازے کا تالا لکھئے۔ اور کیوں اس کو قضا کے پرکار کا نکتہ (جس پر پرکار حرکت کرتی ہے) مانیں۔

اس کو ایک نایاب موتی کس لئے فرض کریں۔ یا اسے عنقا کی آنکھ کی پتلی کیوں کہیں۔

کیا ضرورت اس کو لیلیٰ کے کرتے کا تکمہ تحریر کریں۔ یا اس کو سلما (عرب کی ایک معشوقہ) کے قدم کا نشان ٹھیرائیں۔

بندہ پرور یعنی آپ ہی کی ہتھیلی کو میرا دل فرض کر لیا جائے۔ اور اس چکنی سپاری کو میرے دل کا سویدا (کیونکہ وہ بھی سیاہ رنگ کا ہوا کرتا ہے جیسے کہ سپاری) لہذا یہ چکنی ڈلی مجھے دیدی جائے کہ میرے دل کا یہ سویدا ہے۔ یعنی میرا مدعائے خاطر ہے۔

روغنی روٹی

(۱۹۳۷) مجھ سے پوچھو اُس کی حقیقت حضور والا نے
مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی

(۱۹۳۸) نہ کھاتے گیہوں نکلتے نہ خلد سے باہر
جو کھاتے حضرت آدم یہ بیسنی روٹی

(۱۹۳۷) مجھ کو حضور والا یعنی بادشاہ نے جو بیسن کی روغنی روٹی بھیجی ہے۔ تو اس کی حقیقت کچھ نہ پوچھ۔ اگر حضرت
(۱۹۳۸) آدم یہ بیسنی روٹی کھاتے تو ان کو گیہوں کھانے نہ پڑتے۔ اور اس سے وہ بہشت سے نہ نکالے جاتے۔ مشہور ہے کہ بابا آدم کو بہشت میں گندم کھانے سے منع کیا گیا تھا۔ مگر وہ نہ مانے۔ اور اس کو کھالیا۔ تو باغ جنت سے نکالے گئے تھے۔)

سہرا

خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا (۱۹۳۹)
باندھ شہزادہ جواں بخت کے سر پر سہرا
(۱۹۴۰) کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے
ہے ترے حسن دل افروز کا زیور سہرا
سر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہے پر اے طرف کلاہ (۱۹۴۱)
مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا لمبر سہرا
(۱۹۴۲) ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہوں گے موتی
ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا

رخ پہ گرمی سے جو دولہا کے پسینہ ٹپکا (۱۹۴۳)
ہے رگ ابر گہربار سراسر سہرا
(۱۹۴۴) یہ بھی اک بے ادبی تھی کہ قبا سے بڑھ جائے
رہ گیا آن کے دامن کے برابر سہرا
جی میں اترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چیز (۱۹۴۵)
چاہئے پھولوں کا بھی ایک مقرر سہرا
(۱۹۴۶) جبکہ اپنے میں سماویں نہ خوشی کے مارے
گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر سہرا
رخ روشن کی دمک گوہر غلطاں کی چمک (۱۹۴۷)
کیوں نہ دکھلائے فروغ مہ و اختر سہرا
(۱۹۴۸) تار ریشم کا نہیں ہے یہ رگ ابر بہار
لائیگا تاب گرانباری گوہر سہرا
ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں (۱۹۴۹)
دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بڑھکر سہرا

(۱۹۳۹ تا ۱۹۴۹) یہ سہرا بہادر شاہ بادشاہ کے بیٹے جوان بخت کی شادی خانہ آبادی کے موقع پر غالب نے کہا تھا۔ پھر اسی کے جواب میں ذوق نے بھی ایک سہرا رقم کیا تھا۔
کہتا ہے۔ اے بخت یعنی نصیب تو خوش ہو کہ آج تیرے سر سہرا ہے (کسی کے سر سہرا ہونا۔ یہاں مصنف نے اس سے مراد یہ رکھی ہے کہ آج کی ساری عزت تیری ہی بدولت ہے۔) لہذا تو شہزادہ جوان بخت کے

سر پہ سہرا باندھ۔

تیری اس چاند جیسی صورت پر یہ سہرا کس قدر بھلا معلوم ہوتا ہے۔ گویا تیرے اس دل افروز حسن پر سہرے نے زیور کا کام کیا ہے۔ کہ خوش دلنشی کو دُگنا کر دیا ہے۔

اے کلاہ تجھے تو مٹے تیرا سر پر چڑھنا یعنی سر سے اونچا لگ جانا بہت پھبتا ہے۔ مگر مجھے ڈر ہے کہ تیرا لمبر (نمبر یا درجہ) سہرا نہ چھین لے۔ (انگریزی زبان جبتک عام نہیں ہوئی تھی لمبر بولتے تھے۔ اب نمبر کہتے ہیں۔ قدیم دواوین غالب میں لفظ لمبر ہی درج ہے)

یہ بھر کشتی میں (یا ایک چوڑی سینی میں) سہرے کو رکھکر لایا گیا ہے اس کا یہ مطلب ہے کہ سہرے میں کشتی بھر موتی پرو دیے گئے ہیں۔

یہ گز بھر کا لمبا سہرا ہے۔ تو اس لئے کہ سات سمندروں کے لعل جمع کرکے اس میں لگائے گئے تو سہرا اس قدر لمبا ہو گیا۔

دولھا کے رخسار پر بوجہ گرمی کے جو پسینہ قطرے بنکر نکلا ہے۔ (کیونکہ پانی جب ٹپکتا ہے۔ تو قطرے ہی کی صورت سے ٹپکتا ہے۔) تو یہ پسینے کے قطرے نہیں۔ بلکہ سہرا ہی ابر گہربار کی رگ بنگیا ہے۔ رگ۔ نس۔ ریشہ)
اگر سہرا تیرے چوغے یا اچکن سے آگے بڑھ جاتا تو بے ادبی سمجھی جاتی لہذا وہ قبلہ کے دامن کے برابر ہی پہنچکر رہ گیا۔

موتی اپنے جی میں نہ اترائیں۔ یعنی وہ کچھ غرور نہ کریں۔ کہ ہم ہی کوئی چیز ہیں۔ لہذا پھولوں کا ایک کر یعنی دوسرا سہرا بھی چاہیے۔ تاکہ وہ موتیوں کے ہار کی طرح سر پر اور گلے میں ڈالدیا جائے۔

جبکہ مارے خوشی کے اپنے ہی میں کوئی نہیں سما سکتا۔ تو پھر کوئی

وہ پھولوں کا سہرا کیونکر گوندے گا یا پرو کر دولھا کو ڈالیگا۔ (کہ جسکو موتیوں کا مد مقابل بنانا منظور ہے۔ جیسے کہ اوپر بیان ہوا ہے۔

رخ روشن کی وہ چمک دمک اور پھر اس کے ساتھ وہ سہرے کے متحرک موتیوں کا بوجہ سہرے کے ہلنے کے چمکارہ مارنا ایسا ہے کہ گویا سہرا چاند اور ستاروں کی چمک دمک کو دکھلا رہا ہے۔ (ماہ سے مراد رخ نوشہ اور اختر سہرے کے موتی)

یہ رگ ابر بہار کوئی ریشم کا تار تو ہے ہی نہیں۔ کہ جیسے سہرے میں لگا ہوتا ہے۔ لہذا یہ سہرا ہی ہے۔ کہ وزنی موتیوں کے اٹھانے کی تاب لا سکتا ہے۔ نہ کہ ابر بہار۔ جس میں ایسے وزنی موتی ہوں تو وہ اٹھا بھی نہ سکے۔

ہم شعر و شاعری کے کمال سے واقف ہیں۔ دیکھیں ہمارے اس سہرے سے کوئی اچھا سہرا لکھدے۔

کہتے ہیں جب یہ سہرا بہادر شاہ ظفر کو دکھایا گیا۔ تو وہ مقطع کو پڑھ کے کچھ رنجیدہ سا ہو گیا۔ اور ذوق سے اس کا جواب لکھنے کی فرمائش کی۔ تو اس نے ایک سہرا اسی زمین میں تصنیف کر دیا۔ جو کہ مندرجہ ذیل ہے۔

یہ معاملہ دیکھکر غالب سمجھا۔ کہ بادشاہ فی الواقع اس سے کچھ ناراض ہو گیا ہے۔ لہذا معذرت کے طور پر مندرجہ ذیل قطعہ پیش کیا۔ یہ واقعہ کبھی نہ ہوتا۔ اگر ذوق اور غالب کی پیشتر سے چشمک نہ ہوتی۔

سہرہ ذوق

اے جواں بخت مبارک ہے تجھے سر پر سہرا
آج ہے یمن و سعادت کا ترے سر سہرا

آج وہ دن ہے کہ لائے دُرِ انجم سے فلک
کشتیِ زر میں مہِ نو کی لگا کر سہرا

تابش حسن سے مانند شعاع خورشید
رُخِ پُرنور پہ ہے تیرے منور سہرا

وہ کہے صل علیٰ یہ کہے سبحان اللہ
دیکھیں مکھڑے پہ جو تیرے مہ و اختر سہرا

تابے اور بھی ہیں رہتے اخلاص بہم
تو نے ختم سورۂ اخلاص کو پڑھ کر سہرا

دھوم ہے گلشن آفاق میں اس سہرے کی
گائیں مرغانِ نوا سنج نہ کیونکر سہرا

روئے فرخ پہ ہیں جو تیرے برستے انوار
تار بارش سے بنا ایک سراسر سہرا

ایک سے ایک مزین ہے دم آرائش
سر پہ دستار ہے دستار کے اوپر سہرا

ایک تر بھی نہیں صدکان گہر میں چھوڑا
تیرا بنوایا ہے لے لے کے گوہر سہرا

پھول خوشبو سے ہے اتراتی ہوئی بادِ بہار
اللہ اللہ رے پھولوں کا معطر سہرا

سر پہ طرہ ہے مزین تو گلے میں بدھی
کنگنا ہاتھ میں زیبا ہے تو سر پہ سہرا

رونمائی میں تجھے دے مہ و خورشید فلک
کھولے منہ کو جو تو منہ سے ہٹا کر سہرا

کثرت تار نظر سے ہے تماشائیوں کے
دم نظارہ ترے روئے نکو پر سہرا

دُر خوش آب مضامیں سے بنا کر لایا
واسطے تیرے ترا ذوق ثنا گر سہرا

جن کو دعویٰ ہو سخن کا یہ سنا دو ان کو
دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

بیان مصنف

منظور ہے گذارشِ احوالِ واقعی (۱۹۵۰)
اپنا بیان حسنِ طبیعت نہیں مجھے

(۱۹۵۱) سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

آزادہ رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلح کل (۱۹۵۲)
ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

(۱۹۵۳) کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں
مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے

اُستادِ شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال (۱۹۵۴)
یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے

(۱۹۵۵) جامِ جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر
سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے

میں کون اور ریختہ ہاں اس سے مُدّعا (۱۹۵۶)
جز انبساطِ خاطرِ حضرت نہیں مجھے

(۱۹۵۷) سہرا لکھا گیا ز رہِ امتثالِ امر
دیکھا کہ چارہ غیرِ اطاعت نہیں مجھے

مقطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات (۱۹۵۸)
مقصود اس سے قطعِ محبت نہیں مجھے

(۱۹۵۹) روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ
سودا نہیں جنون نہیں وحشت نہیں مجھے
قسمت بُری سہی پہ طبیعت بُری نہیں (۱۹۶۰)
ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے
(۱۹۶۱) صادق ہوں اپنے قول میں غالبؔ خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

(۱۹۵۰) میں اپنا سچا حال بیان کرنا چاہتا ہوں۔ یہاں مجھے اپنی طبیعت کے حسن کمال کا کچھ اظہار کرنا مقصود نہیں ہے۔

(۱۹۵۱) میرے باپ دادا کا پیشہ صدہا پشت سے سپہ گری رہا ہے لہذا شاعری میرے لئے کوئی ذریعۂ عزت نہیں ہو سکتی۔ (مراد یہ کہ میں نے ظاہرا کچھ اپنی عزت افزائی کے لئے مرتب نہیں کیا تھا۔)

(۱۹۵۲) میں ایک آزاد طبع اور صلح کل کے مسلک (رستے) پر چلنے والا آدمی ہوں۔ لہذا مجھے کسی سے ہرگز کچھ دشمنی نہیں ہے۔

(۱۹۵۳) کیا یہ کم رتبہ ہے۔ کہ میں بہادر شاہ ظفر کا غلام ہوں۔ کیا ہوا اگر مجھے کوئی عالی رتبہ۔ عہدہ۔ یا دولت حاصل نہیں ہے۔ (اس کی غلامی ہی میرے لئے سب کچھ ہے)

(۱۹۵۴) جب میری یہ حالت ہو کہ شاہ کا غلام ہوں تو شاہ کے اُستاد سے کبھی لڑائی کا خیال کرنا تو گویا ہر طرح میری تاب و طاقت اور امکان ہی سے باہر ہے۔

(۱۹۵۵) خود بادشاہ کا ضمیر یا دل ایک جام جہاں نما ہے۔ یعنی

ایسا جام کہ جس میں ساری دنیا کا حال آئینہ ہو جاتا ہے۔ اور اس بات کی تصدیق کے لئے مجھے نہ گواہ کی حاجت ہے نہ اس پر قسم کھانے کی۔

(۱۹۵۶) بھلا میں کون اور میری اردو شاعری ہی کیا۔ اس سے تو صرف مقصود یہ کہ دل کو کبھی کبھی خوش کرنا منظور ہے۔ اور بس! (انبساط خاطر دل کی خوشی۔)

(۱۹۵۷) امتثال امر: کسی کے کہنے کے مطابق عمل کرنا۔ یہاں غالب نے نواب زینت محل بیگم کے ایما پر یہ سہرا تصنیف کیا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ یہ سہرا میں نے حسب ایما لکھا ہے۔ کیونکہ میں نے دیکھا تھا۔ کہ بیگم صاحبہ کے حکم کی تعمیل کئے بغیر میرے لئے کوئی چارہ کار ہی نہیں ہو سکتا تھا۔

(۱۹۵۸) اُس سہرے کے مقطع (اخیر کے شعر میں) مجھے محض ایک شاعرانہ طرز کلام جیسے کہ تعلی و مبالغہ وغیرہ سے کچھ کام لینا پڑا تھا۔ ورنہ اس مقطع کو لکھنے سے میرا مدعا کسی سے ترک محبت ہرگز نہیں تھا۔

(۱۹۵۹) روئے سخن کسی کی طرف ہونا۔ مراد اس پر کچھ چوٹ کرنا مقصد شعر۔ میں نے اگر کسی شخص پر اپنے کلام میں کچھ چوٹ کی ہو تو میرا منہ خدا کالا کرے۔ کیا مجھے بھی کوئی سودا یعنی دیوانہ پن۔ جنون یا وحشت ہے کہ کسی پر ناحق چوٹ کیا کرونگا۔

(۱۹۶۰) میری قسمت بُری سہی (کہ میں کوئی عالی مرتبہ آدمی نہیں ہوں) اور نہ میری طبیعت (اخلاق یا عادت) کچھ ایسی بُری نہیں ہے کہ کسی سے خواہ مخواہ الجھ پڑوں۔ لہذا یہ مقام شکر ہے۔ کہ مجھے کسی سے شکایت نہیں ہے۔

(۱۹۶۱) اے غالب میں اپنے قول کا سچا آدمی ہوں۔ اور اس کا

خدا گواہ، میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، بالکل سچ سچ کہتا ہوں۔ کیونکہ جھوٹ بنانے کی مجھے عادت ہی نہیں ہے۔

مدح

(١٩٦٢) نصرت الملک بہادر مجھے بتلا کہ مجھے
تجھ سے جو اتنی ارادت ہے تو کس بات سے ہے
(١٩٦٣) گرچہ تو وہ ہے کہ ہنگامہ اگر گرم کرے
رونق بزم مہ و مہر تری ذات سے ہے
(١٩٦٤) اور میں وہ ہوں کہ گر جی میں کبھی غور کروں
غیر کیا خود مجھے نفرت مری اوقات سے ہے
(١٩٦٥) خستگی کا ہو بھلا جس کے سبب سے سر دست
نسبت اک گونہ مرے دل کو ترے ہاتھ سے ہے
(١٩٦٦) ہاتھ میں تیرے رہے توسن دولت کی عناں
یہ دعا شام و سحر قاضی حاجات سے ہے
(١٩٦٧) تو سکندر ہے مرا فخر ہے ملنا تیرا
گو شرف خضر کی بھی مجھ کو ملاقات سے ہے
(١٩٦٨) اس پہ گذرے نہ گمان ریو و ریا کا زنہار
غالب خاک نشیں اہل خرابات سے ہے

(١٩٦٢) نصرت الملک بہادر۔ تو مجھے بتا کہ تیرے ساتھ مجھ کو جو اتنی

عقیدت یا تیرے ساتھ اس قدر خلوص نیست ہے۔ تو یہ کس وجہ سے ہے۔ (نصرت الملک کسی درباری عہدہ کا نام ہے۔ اور غالباً اس سے کوئی رکن دربار شاہی مراد ہے)

(١٩٦٣) اگرچہ تو وہ ہے کہ اگر دربار آراستہ نہ کرے۔ یا ایک رونق کا ساز و سامان کرے تو مہر و ماہ کی محفل کی

(١٩٦٤) رونق بھی تیری ذات سے ہو سکتی ہے۔ اور ایک میں ہوں کہ اگر کبھی دل میں غور کروں۔ تو غیر تو غیر خود مجھے اپنی طرز حیات یعنی اوقات سے نفرت آتی ہے:

(١٩٦٥) میری درماندہ حالت کا بھلا ہو۔ کہ جس کے سبب فی الحال میرے دل کو ایک گونہ تیرے ہاتھ کے ساتھ تعلق ہو گیا ہے۔ یعنی میں مصیبت میں ہوں اور تو کچھ ہاتھ سے دیکر میری مدد کیا کرتا ہے۔

(١٩٦٦) صبح و شام میری یہ دعا قاضی حاجات یعنی خدائے کارساز سے ہے۔ کہ دولت کے گھوڑے کی باگ ہمیشہ تیرے ہاتھ میں رہے۔ یعنی تو خزانوں کا مالک رہے۔ اور جس طرح چاہے انکو چلائے۔

(١٩٦٧) تو میرا سکندر ہے۔ تیرے ساتھ میرا ملنا یعنی دوست ہونا میرے لئے باعث فخر ہے۔ اگرچہ مجھ کو خضر یعنی شاہزادہ خضر سلطان سے بھی میل ملاقات رکھنے میں بہت شرف یعنی عزت حاصل ہوتی ہے۔ (مراد یہ کہ سکندر یعنی نصرت الملک بہادر تو غالب کی مالی امداد کرتا ہے۔ اور خضر سلطان ایک شاہزادہ ٹھیرا وہ جب غالب کا معتقد ہو تو اس سے ایک وجہ شرف یعنی اعزاز کی صورت حاصل ہوتی ہے)

(١٩٦٨) غالب جو خاک میں پر بیٹھنے والا یعنی فقیر یا حقیر طبیعت کا

آدمی ہے۔ اہل خرابات سے ہے۔ مراد، نشہ پانی پینے والا آدمی ہے۔ پس جیسے نشئی آدمیوں کو بُرا سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح مجھ پر بھی ہرگز مکر و فریب کا گمان نہ کیا جائے۔ یعنی میں ایک غریب شرابی آدمی سہی مگر مکار نہیں ہوں۔ (یہ منظوم رقعہ غالبؔ نے کسی بدگمانی کے رفع کرنے کو بھی تحریر ہوا ہوگا)

قطعہ

ہے چار شنبہ آخر ماہ صفر چلو (۶۹ ، ۱۹)
رکھ دیں چمن میں بھر کے مئے مشکبو کی ناند

(۷۰ ، ۱۹) جو آئے جام بھر کے پئے اور ہو کے مست
سبزے کو روندتا پھرے پھولوں کو جائے پھاند

غالبؔ یہ کیا بیان ہے بجز مدح بادشاہ (۷۱ ، ۱۹)
بھاتی نہیں ہے اب مجھے کوئی نوشت و خواند

(۷۲ ، ۱۹) بٹتے ہیں سونے روپے کے چھلے حضور میں
ہے جن کے آگے سیم و زر مہر و ماہ ماند

یوں سمجھئے کہ بیچ سے خالی کئے ہوئے (۷۳ ، ۱۹)
لاکھوں ہی آفتاب ہیں اور بے شمار چاند

(۶۹ ، ۱۹) آج ماہ صفر کی آخری اور بڑا چار شنبہ ہے۔ چلو سبزی لگانے چلیں۔ اور باغ میں خوشبو دار شراب کا ایک کونڈا بھر کے

۔ آخری چہار شنبہ کو مسلمان سبزی لتاڑا کرتے ہیں۔

(دوستوں کی ضیافت کے لئے) رکھ دیں۔

(۷۰ ، ۱۹) جو دوست آئے پیالہ بھر کے شراب پئے۔ اور خوب بدمست ہوکے سبزہ کو روندے اور پھولوں پر اُچھلتا کودتا پھرے۔

(۷۱ ، ۱۹) غالبؔ تو یہ کیا باتیں بنا رہا ہے۔ مجھے تو بادشاہ کی تعریف سُنا۔ کیونکہ اس کے سوا اب مجھے کوئی تقریر یا تحریر ہرگز نہیں بھاتی۔

(۷۲ ، ۱۹) آج بادشاہ کے دربار میں سونے چاندی کے چھلے (عمل سے دم کئے ہوئے) سب کو بٹتے ہیں۔ کہ جن کے سامنے چاندی اور سونا اور چاند اور سورج کی بھی کچھ حقیقت نہیں ہے۔ یعنی چھلے روپہلی اور سنہرے ہیں۔ اسی طرح چاند اور سورج اور زر و سیم کی رنگت ہوا کرتی ہے مگر رنگت کے سوا اور کوئی مناسبت انھیں نہیں پائی جاتی۔

(۷۳ ، ۱۹) یوں سمجھئے کہ لاکھوں ہی سورج اور بے شمار چاند بیچ سے خالی کرکے بادشاہ کے آگے رکھ دیئے گئے۔ اور وہ خالی چھلوں کی صورت میں تقسیم کئے جا رہے ہیں۔ بادشاہ اس روز چاندی اور سونے کے چھلے بانٹا کرتے تھے۔

در مدح شاہ

اے شاہ جہانگیر جہاں بخش جہاندار (۷۴ ، ۱۹)
ہے غیب سے ہر دم تجھے صد گونہ بشارت

(۷۵ ، ۱۹) جو عقدۂ دشوار کہ کوشش سے نہ وا ہو
تو وا کرے اُس عقدے کو سو بھی بہ اشارت

ممکن ہے کرے خضر سکندر سے ترا ذکر (۱۹۷۶)
گر لب کو نہ دے چشمۂ حیواں سے طہارت

(۱۹۷۷) آصف کو سلیمان کی وزارت سے شرف تھا
ہے فخر سلیمان جو کرے تیری وزارت

ہے نقش مریدی ترا فرمان الٰہی (۱۹۷۸)
ہے داغ غلامی ترا توقیع امارت

(۱۹۷۹) تو آب سے گر سلب کرے طاقت سیلان
تو آگ سے گر دفع کرے تاب شرارت

ڈھونڈے نہ ملے موجۂ دریا میں روانی (۱۹۸۰)
باقی نہ رہے آتش سوزاں میں حرارت

(۱۹۸۱) ہے گرچہ مجھے نکتہ سرائی میں توغل
ہے گرچہ مجھے سحر طرازی میں مہارت

کیونکر نہ کروں مدح کو میں ختم دعا پر (۱۹۸۲)
قاصر ہے شکایت سے تری میری عبارت

(۱۹۸۳) نوروز ہے آج اور وہ دن ہے کہ ہوئے ہیں
نظارگیِ صنعتِ حق اہل بصارت

تجھکو شرف مہر جہاں تاب مبارک (۱۹۸۴)
غالب کو ترے عتبۂ عالی کی زیارت

(۱۹۷۴) اے بادشاہ جہانگیر (دنیا کو فتح کرنے والا) جہاں بخش (دولت کو بخشنے والا) اور جہاندار (دنیا پر تسلط رکھنے والا) مہر و قت

تجھے غیب سے کئی اشارے ہوتے رہتے ہیں۔ یعنی ہر مشکل میں تیری امداد غیبی کی جاتی ہے۔

(۱۹۷۵) جو مشکل گرہ کہ کسی کی ہمت اور کوشش سے نہ کھل سکے تو اس کو فوراً کھول دیتا ہے۔ اور وہ بھی ایک اشارے سے۔

(۱۹۷۶) کیا یہ کبھی ممکن ہو سکتا ہے۔ کہ خضر اپنے لب کو جب تک آب حیات کے پانی سے دھو نہ لے۔ سکندر سے تیرا ذکر کرے یعنے خود یہ خضر جو مشکلات کا حل کرنے والا ہے۔ وہ بھی اس قدر تجھکو مقدس تصور کرتا ہے۔

(۱۹۷۷) آصف بن برخیا کو سلیمان کی وزارت سے بڑی عزت حاصل تھی۔ مگر یہاں خود سلیمان کو تیری وزارت حاصل ہو تو وہ بڑا فخر کرے۔

(۱۹۷۸) نقش مریدی — بہادر شاہ ظفر سے اہل دربار بیعت لیا کرتے تھے۔ اور وہ اپنے آپ کو ایک فقیر یا صوفی بادشاہ تصور کرکے ان کو مرید بنایا کرتے تھے اور اپنا کوئی نشان انھیں دے دیا کرتے تھے۔ جو نقش مریدی سمجھا جاتا تھا۔

حل شعر۔ تجھ سے جو نقش مریدی حاصل ہوتا ہے وہ گویا خدا کا فرمان ہے یعنی تیرے ساتھ عقیدت رکھنا عین حکم الٰہی کے مطابق ہے۔ اور جو شخص تیری غلامی کا داغ حاصل کرے یعنی غلام بنے۔ تو گویا اس کو توقیع امارت یعنی امیری کی سند مل جاتی ہے۔

(۱۹۷۹) اگر تو پانی سے طاقت سیلان یعنی روانی کی طاقت
(۱۹۸۰) دور کر دے۔ مراد طوفان برپا کرنے کے سبب کچھ

بہائے جانے کی عادت سلب کر دے۔ اور اسی طرح وہ آگ سے سب کچھ جلا دینے کی یا شرارت کرنے کی طاقت دفع کر دے۔ تو دریا کی لہر میں نام کو بھی روانی باقی نہ رہے۔ اور نہ جلانے والی آگ میں کچھ حرارت۔ مراد یہ کہ تو آگ اور پانی پر بھی یہ قدرت رکھتا ہے۔

(۱۹۸۱) اگرچہ مجھ کو بھی تلی بات کہنے میں۔ یہاں مراد شعر و شاعری میں توغل یعنی کمال اشتغال حاصل ہے۔

(۱۹۸۲) اور اگرچہ شعر کہنے میں وہ مہارت مجھے حاصل ہے کہ گویا جادو پھونکتا ہوں۔ مگر کیونکہ میں تیری اس مدح کو تیرے حق میں دعا کہے ختم نہ کروں۔ کہ تیری اس حکایت یا مدح میں میری عبارت یا شعر گوئی بہت قاصر ہے۔ یعنی اور کچھ بیان کرنے کی قوت نہیں رکھتی۔

(۱۹۸۳) آج نوروز ہے یا جشن نوروز ہے۔ اور یہ وہ دن ہے۔ کہ جو اشخاص کچھ چشم بصیرت یعنی حق شناسی کا ملکہ رکھتے ہیں وہ خدا کی قدرتیں دیکھنے میں مصروف ہیں۔ گویا نوروز کی تجلی پہل سے قدرت کی تمام اچھی اچھی باتوں کا اظہار ہو رہا ہے۔

(۱۹۸۴) یہاں شرف سے مراد شرف خدمت ہے۔ یعنی کسی کی خدمت کرکے عزت حاصل کرنا۔

حل شعر۔ وہ سورج جو سارے جہان پر چمکتا ہے۔ گویا تیری شرف خدمت کے لئے آتا ہے۔ لہذا اس کا یہ شرف تجھ کو مبارک ہو۔ اور اسی طرح غالب کو تیرے عالی مرتبہ وجود کی زیارت ہمیشہ نصیب رہے۔

قطعہ

افطار صوم کی کچھ اگر دستگاہ ہو (۱۹۸۵)
اس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے
(۱۹۸۶) جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو
روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

(۱۹۸۵) افطار صوم یعنی روزہ کھولنے کی اگر کسی کو استطاعت حاصل ہو (۱۹۸۶) تو لازم ہے کہ وہ شخص روزہ رکھا کرے۔ لیکن جس کسی کے پاس روزہ کھول کے پیٹ بھرنے کو کچھ نہ ہو۔ اگر وہ شخص روزے ہی کو نہ کھا جائے یعنی روزہ کو نہ رکھا کرے تو اور کیا کرے۔

گذارش مصنف بحضور شاہ

اے شہنشاہ آسمان اورنگ (۱۹۸۷)
اے جہاندار آفتاب آثار
(۱۹۸۸) تھا میں اک بے نوائے گوشہ نشیں
تھا میں اک دردمند سینہ فگار
تم نے مجھکو جو آبرو بخشی (۱۹۸۹)
ہوئی وہ میری گرمی بازار

(۱۹۹۰) کہ ہوا مجھ سا ذرۂ ناچیز
روشناس ثوابت و سیار

گرچہ از روئے ننگ بے ہنری (۱۹۹۱)
ہوں خود اپنی نظر میں اتنا خوار

(۱۹۹۲) کہ گر اپنے کو میں کہوں خاکی
جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار

شاد ہوں لیکن اپنے جی میں کہ ہوں (۱۹۹۳)
بادشہ کا غلام کار گزار

(۱۹۹۴) خانہ زاد اور مرید اور مداح
تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار

بارے نوکر بھی ہو گیا صد شکر (۱۹۹۵)
نسبتیں ہو گئیں مشخص چار

(۱۹۹۶) نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں
مدعائے ضروری الاظہار

پیر و مرشد اگرچہ مجھ کو نہیں (۱۹۹۷)
ذوق آرائش سر و دستار

(۱۹۹۸) کچھ تو جاڑے میں چاہیے آخر
تا نہ دے باد زمہریر آزار

کیوں نہ درکار ہو مجھے پوشش (۱۹۹۹)
جسم رکھتا ہوں ہے اگرچہ نزار

(۲۰۰۰) کچھ خریدا نہیں ہے اب کے سال
کچھ بنایا نہیں ہے اب کی بار

رات کو آگ اور دن کو دھوپ (۲۰۰۱)
بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار

(۲۰۰۲) آگ تاپے کہاں تلک انسان
دھوپ کھاوے کہاں تلک جاندار

دھوپ کی تابش آگ کی گرمی (۲۰۰۳)
ربنا وقنا عذاب النار

(۲۰۰۴) میری تنخواہ جو مقرر ہے
اس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار

رسم ہے مردے کی چھ ماہی ایک (۲۰۰۵)
خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار

(۲۰۰۶) مجھ کو دیکھو تو ہوں بقید حیات
اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار

بس کہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض (۲۰۰۷)
اور رہتی ہے سود کی تکرار

(۲۰۰۸) میری تنخواہ میں تہائی کا
ہو گیا ہے شریک ساہوکار

آج مجھ سا نہیں زمانے میں (۲۰۰۹)
شاعر نغز گوئے خوش گفتار

(۲۰۱۰) رزم کی داستان گر سنیئے
ہے زبان میری تیغ جوہر دار

بزم کا التزام گر کیجئے (۲۰۱۱)
ہے قلم میرا ابر گوہر بار

(۲۰۱۲) ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد
قہر ہے گر کرو نہ مجکو پیار

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا (۲۰۱۳)
آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار

(۲۰۱۴) میری تنخواہ کیجئے ماہ بماہ
تا نہ ہو مجکو زندگی دشوار

ختم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام (۲۰۱۵)
شاعری سے نہیں مجھے سروکار

(۲۰۱۶) تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

(۱۹۸۶) اے شہنشاہ جس کا تخت آسمان ہے۔ اور اسے جہان کے مالک (بادشاہ) جو کہ آفتاب کے مانند (سب پہ غالب ہے)

(۱۹۸۸) میں ایک مفلس گوشہ نشین آدمی تھا اور ایک دردمند سینہ فگار شخص۔

(۱۹۸۹) تم نے مجھ کو جو عزت بخشی۔ تو میری اسقدر شہرت

بڑھی۔ یا سب میں اتنا چرچا بڑھا۔

(۱۹۹۰) کہ مجھ جیسا ناچیز آدمی بھی سیاروں اور ستاروں کا روشناس ہوگیا۔ یعنی بڑے بڑے باوقعت آدمیوں سے ملنے جلنے لگا۔

(۱۹۹۱) اگرچہ میں اپنی بے ہنری کی شرم کے سبب خود اپنی نظر میں اتنا ذلیل ہوں۔

(۱۹۹۲) کہ اگر میں اپنے آپ کو خاکی نژاد کہوں۔ تو جانتا ہوں کہ مٹی کو بھی اس بات سے شرم آئیگی۔ یعنی وہ میرے ساتھ ہم نسبت ہونا پسند نہیں کریگی۔

(۱۹۹۳) لیکن میں اپنے دل میں خوش ہوں۔ کہ میں بادشاہ کا ایک خدمت گذار غلام ہوں۔

(۱۹۹۴) حضور کے گھر کا پلا ہوا۔ اور آپ کا مرید۔ اور ثنا خواں یہ تو حضور کا عریضہ نگار ہمیشہ ہی سے تھا۔ (عریضہ نگار۔ کسی کو عرضی لکھکر کچھ مانگنے والا یا تو اسندگار) نوٹ:۔ بعض لوگ ظفر بادشاہ کے مرید بھی تھے۔

(۱۹۹۵) خدا کا شکر ہے۔ کہ اب حضور کا نوکر بھی ہوگیا۔ اسلئے اب چار نسبتیں یعنی میرے آپ کے ساتھ چار تعلق قایم ہوگئے۔ خانہ زاد۔ مرید۔ مداح اور ملازم حضور۔

(۱۹۹۶) میرے پیر و مرشد اگرچہ مجھ کو اپنے سر اور پگڑی کی زیبایش کا شوق نہیں ہے۔

(۱۹۹۷) آخر کچھ سازوسامان جاڑے کے لئے تو ضروری ہے تاکہ باد زمہریر مجھے تکلیف نہ دے۔ (زمہریر سخت ٹھنڈا کرہ ہوائی)

(۱۹۹۸) مجھ کو لباس کی ضرورت کیوں نہ پڑے۔ کیونکہ اگرچہ میں

زار و نحیف ہوں مگر پھر بھی جسم رکھتا ہوں۔

(۱۹۹۹) ابکے سال موسم سرما کے لئے کچھ نہیں خریدا اور نہ ابکی بار کوئی کپڑا ہی بنایا ہے۔

(۲۰۰۰) رات کو آگ تاپ رہا ہوں۔ اور دن کو دھوپ۔ ایسے دن اور رات بھاڑ میں جائیں۔ یعنی یہ فنافی اللہ ہوں۔

(۲۰۰۱) انسان کب تک آگ تاپا کرے۔ اور ایک جاندار یعنی مخلوق کب تک دھوپ سینکا کرے۔ اس سے موسم سرما نہیں گزر سکتا۔

(۲۰۰۲) دھوپ کی تیزی اور تپش اور آگ جو سینکی جائے اس کی گرمی۔ ربنا وقنا عذاب النار۔ یعنی خدا ہی اس آگ کی جلن سے بچائے۔

(۲۰۰۳) میری تنخواہ جو مقرر کی جا چکی ہے۔ اس کے ملنے کا عجب طریقہ ہے۔ (غالب کو بہادر شاہ ظفر سے کچھ ماہوار وظیفہ ملا کرتا تھا۔)

(۲۰۰۴) مردے کی صرف ایک ہی چھ ماہی منانے کا دستور ہے۔ اور تمام دنیا اسی رواج پر عمل کیا کرتی ہے۔

(۲۰۰۵) مجھ کو دیکھو کہ اگرچہ زندہ ہوں۔ میری چھ ماہی سال میں دو بار ہوتی ہے۔ (حالانکہ چھ ماہی ایک مردے کی بھی صرف ایک بار ہوا کرتی ہے۔)

(۲۰۰۶) چونکہ اسی وجہ سے (کہ تنخواہ دیر سے ملتی ہے) میں ہر مہینے قرض لے کر گذارہ کرتا ہوں۔ اور اس قرض کی رقم کے سبب سود کی تکرار ہوتی ہے۔ یعنی سود پر سود چڑھتا رہتا ہے۔

(۲۰۰۷) میری تنخواہ کے تیسرے حصہ کا وہ ساہوکار جس سے میں قرض دام لیتا ہوں۔ شریک ہو گیا ہے۔ مراد یہ کہ تنخواہ کا تہائی حصہ تو سود ہی میں چلا جاتا ہے۔ جو ساہوکار لے لیتا ہے۔

(۲۰۰۸) آج مجھ سا زمانہ بھر میں جدت پسند اور کوئی اچھا کہنے والا شاعر موجود نہیں ہے۔

(۲۰۰۹) اگر مجھ سے داستان جنگ سنئے۔ تو میری زبان ایک جوہر دار تلوار ہے۔ (جو میدان جنگ میں بہت کاٹ کرتی ہے) اور۔

(۲۰۱۰) اگر ایک محفل کا التزام کیجئے۔ یعنی مجھ سے داستان بزم لکھوائیے۔ تو میرا قلم ایک موتی برسانے والا ابر ہے۔

(۲۰۱۱) اگر مجھ کو میرے اشعار کی داد نہ دو۔ تو ظلم ہے اور اگر مجھ کو پیار نہ کرو یعنی مجھ کو عزیز نہ رکھو تو قہر ہے۔

(۲۰۱۲) میں آپ کا ایک خدمت گار اور ننگا پھرتا ہوں۔ (یعنی سردی کے نئے کپڑے آپ نے بنوا کر نہیں دیے۔) اور آپ کا نوکر ہو کے (تنخواہ نہیں ملتی تو) اُدھار کھا کے جیتا ہوں۔

(۲۰۱۳) میری تنخواہ کا حساب مجھے ہر ماہ دلوا دیا کیجئے۔ تاکہ مجھے اپنی زندگی گذارنا اسقدر دو بھر نہ ہو جائے۔

(۲۰۱۴) چونکہ مجھ کو صرف اپنا حال حضور کے آگے عرض کرنا تھا۔ سو کر لیا۔ ورنہ مجھ کو اپنی شاعری جتانا مد نظر نہیں تھا۔ لہذا اب اس دعا پر ختم کلام کرتا ہوں کہ۔

(۲۰۱۵) حضور ہزار برس زندہ و سلامت رہیں۔ اور پھر ہر برس

کے دن بھی پچاس ہزار ہوا کریں۔

قطعات

سیہ گلیم ہوں لازم ہے میرا نام نہ لے (۲۰۱۷)
جہاں میں جو کوئی فتح و ظفر کا طالب ہے
ہوا نہ غلبہ میسر کبھی کسی پہ مجھے (۲۰۱۸)
کہ جو شریک ہو میرا شریک غالب ہے

(۲۰۱۷) سیاہ گلیم۔ کالی کملی یہاں مراد سیاہ بخت۔

(۲۰۱۸) شریک غالب۔ فرض کرو کہ ایک بٹوے میں دس روپے پڑے ہیں۔ موہن کے آٹھ روپے ہیں اور حمید کے صرف دو روپے۔ تو موہن شریک غالب ہے۔

حل شعر۔ میں سیاہ بخت آدمی ہوں۔ جو شخص فتح یا ظفر کا خواہشمند ہو۔ اُس پہ لازم ہے کہ وہ میرا نام کبھی نہ لے۔ لیعنی ہرگز میرا شریک کار نہ ہو۔ کیونکہ (باوجود غالب نام ہونے کے) مجھ کو کسی پہ کبھی غلبہ حاصل نہیں ہوا۔ اس لئے جو شخص میرا شریک کار ہوتا ہے۔ وہی ہمیشہ شریک غالب رہتا ہے۔ لیعنی میری طرف سے تو اسے خسارہ ہی اُٹھانا پڑتا ہے۔ ہاں وہ کچھ اپنے نصیبے کا حاصل کرے تو کرے۔ (شریک غالب سے یہاں مراد میری شرکت کے سبب سخت نقصان اٹھانا ہے۔)

قطعہ

سہل تھا مسہل و لے یہ سخت مشکل آپڑی (۲۰۱۹)
مجھ پہ کیا گذرے گی اتنے روز حاضر بن ہوئے
(۲۰۲۰) تین دن مسہل سے پہلے تین دن مسہل کے بعد
تین مسہل تین تبریدیں یہ سب کے دن ہوئے

(۲۰۱۹) حاضر بن ہوئے۔ یعنی بن حاضر ہوئے۔ مراد غیر حاضری۔

(۲۰۲۰) حل۔ جلاب کرنا تو سہل تھا۔ مگر یہ سخت مشکل آپڑی کہ بوجہ جلاب کے اتنے دن (دربار شاہ سے) غیر حاضر ہو گیا۔ اب دیکھئے وہاں مجھ پہ کیا گذرے۔ (میں دراصل بارہ دن غیر حاضر رہا۔) تین دن جلاب کے قبل۔ اور تین دن جلاب کے بعد۔ اور تین دن جلاب کرتے وقت۔ اور تین دن جلاب لینے کی تیاری یعنی تبریدوں کے لئے۔ یہ سب غیر حاضری کے دن ہوئے۔

قطعہ تاریخ

خجستہ انجمن طوئے میرزا جعفر (۲۰۲۱)
کہ جس کے دیکھے سے سب کا ہوا ہے جی محظوظ

(۲۰۲۲) ہوئی ہے ایسے ہی فرخندہ سال میں غالب
نہ کیوں ہو مادۂ سالِ عیسوی محظوظ

(۲۰۲۱) انجمن طوئے۔ بیاہ کی انجمن مراد برات۔
(۲۰۲۲) حل۔ مرزا جعفر کی برات یا بیاہ کا مجمع مبارک ہے۔ کہ جس کے دیکھنے سے سب کا دل خوش ہو گیا ہے۔ چونکہ یہ ایک ایسے مبارک سال میں ایسی ہی محظوظ (خوشی پہنچانے والی) شادی ہوئی ہے۔ اس کا مادہ تاریخ بحساب سال عیسوی کیوں نہ لفظ "محظوظ" ہو (محظوظ = ۱۸۵۴ء)

قطعہ تاریخ دیگر

ہوئی جب میرزا جعفر کی شادی (۲۰۲۳)
ہوا بزمِ طرب میں رقصِ ناہید
(۲۰۲۴) کہا غالب سے تاریخ اس کی کیا ہے
تو بولا انشراحِ جشنِ جمشید

(۲۰۲۳) جب میرزا جعفر کی شادی ہوئی۔ تو محفل مسرت
(۲۰۲۴) میں زہرہ کا ناچ ہوا۔ غالب سے پوچھا گیا کہ اس کی تاریخ کیا ہے۔ تو اس نے جواب دیا "انشراح جشن جمشید" (۱۲۷۰ھ) یعنی جشن جمشید کا منایا جانا۔

قطعہ

گو ایک بادشاہ کے سب خانہ زاد ہیں (۲۰۲۵)
دربار دار لوگ بہم آشنا نہیں
(۲۰۲۶) کانوں پہ ہاتھ دھرتے ہیں کرتے ہوئے سلام
اس سے ہے یہ مراد کہ ہم آشنا نہیں

(۲۰۲۵) اگرچہ ایک ہی بادشاہ کے گھر کے سب پلے
(۲۰۲۶) ہوئے ہیں۔ مگر درباری لوگ ایک دوسرے سے آشنا نہیں ہیں۔ کیونکہ سلام کرتے وقت یہ اپنے کانوں پر ہاتھ رکھدیتے ہیں۔ (چونکہ کانوں پہ ہاتھ رکھنے سے مراد کسی امر کی واقفیت سے لاعلمی ظاہر کرنا ہے۔) تو اس کا مطلب گویا یہ ہوا کہ "ہم آشنا نہیں ہیں" یعنی کسی کو کسی سے واقفیت نہیں ہے۔ (مصنف کی مراد یہ کہ اہل دربار جو سلام کرتے وقت بھی ایک طرح اظہار لاعلمی کر دیتے ہیں۔ لہٰذا ان کے ساتھ جب کام پڑے تو یہ کس کے واقف یا آشنا نہیں گے۔)

رباعیات

بعد از اتمام بزم عید اطفال (۲۰۲۷)
ایام جوانی رہے ساغر کش حال

(۲۰۲۸) آ پہنچے ہیں تا سواد اقلیم عدم
اے عمر گذشتہ یک قدم استقبال

(۲۰۲۸) عمر گذشتہ کے دو ایک دن پلٹ آنے کی آرزو میں فرمایا ہے۔ کہ بچوں کی بزم عید ختم ہونے کے بعد (یعنی زمانہ بچپن کا گویا ایک عید تھی۔) پھر ایام جوانی آئے اور ہم سرخوش حال رہے۔ یعنی اپنے حال میں مست رہے۔ بعد ازاں ملک عدم کی حد یا اس کے گرد و نواح تک آ پہنچے ہیں۔ اے عمر گذشتہ۔ اب تو (ملک عدم سے) ایک قدم ہمارے استقبال کے لئے تو آ نکل۔ (تاکہ ہمیں دو ایک دن اور جینا نصیب ہو۔ مگر ایسا کہاں ہوتا ہے۔)

رباعی

شب زلف و رخ عرق فشاں کا غم تھا (۲۰۲۹)
کیا شرح کروں کہ طرفہ تر عالم تھا
(۲۰۳۰) رویا میں ہزار آنکھ سے صبح تلک
ہر قطرۂ اشک دیدۂ پُرنم تھا

(۲۰۲۹) و (۲۰۳۰) میں رات کو اس کے زلف اور پسینہ میں تر رخساروں کی یاد میں غم کر رہا تھا۔ اب کیا بیان کروں۔ کہ کیسا عجیب عالم تھا۔ میں صبح تک ہزار آنکھ سے روتا رہا۔ اور میرا ہر قطرۂ اشک گویا ایک آنسوؤں سے تر آنکھ تھی۔ (رات اور صبح کا اشارہ تو زلف اور رخ کی طرف ہے۔ اور قطرۂ اشک دوست کے پسینہ کی بوند کے مشابہ ہے۔ اور ہر آنسو گویا آنکھ بن گئی۔ تو ہزار آنکھیں ہاتھ آئیں)

آتشبازی ہے جیسے شغل اطفال (۲۰۳۱)
ہے سوز جگر کا بھی اسی طور کا حال
(۲۰۳۲) تھا موجد عشق بھی قیامت کا کوئی
لڑکوں کے لئے گیا ہے کیا کھیل نکال

(۲۰۳۱) و (۲۰۳۲) جس طرح آتشبازی لڑکوں کا ایک کھیل ہے کہ وہ بہت خوشی سے آتشبازی چلاتے ہیں مگر انجام سے بے خبر ہوا کرتے ہیں۔ کہ یہ جلا دینے والی چیز ہے ایسے ہی (عشق میں) ان کے سوز جگر کا حال ہے۔ کہ ابتداً وہ بہت شوق سے سوز عشق میں مبتلا ہوتے ہیں۔ مگر اس کا انجام بہت تلخ ہوتا ہے۔ لہذا موجد عشق بھی ایک قیامت کا یعنی فتنہ انگیز آدمی تھا۔ (جیسے کسی ظالم نے آتشبازی ایجاد کی تھی) اسی نے لڑکوں کے لئے یہ عشق کا ایک خطرناک کھیل نکالا تھا۔ (لڑکوں سے یہاں مراد نوجوان عشاق)

دوسرے معنی۔ آتشبازی جیسے لڑکوں کا شغل ہے۔ یعنی ایک تماشہ ہے۔ ایسے ہی عاشق کے سوزِ دل کا حال ہے۔ کہ اُن معشوق لڑکوں (مراد طفل حسین و نوخیز) کے لئے ایک تماشہ ہے۔ لہذا موجد عشق بھی ایک غضب کا آدمی تھا۔ کہ ان معشوق لڑکوں کے لئے کیا ایک عجیب کھیل پیدا کر گیا ہے۔ کہ وہ عاشق کے سوزِ دل کے ساتھ مثل آتشبازی کھیلا کرتے ہیں۔

(یہ دوسرے معنی شارحین غالب نے لکھے ہیں۔ لہذا نقل کرائے گئے۔

(٢٠٣٣) دل تھا کہ جو جان درد تمہید سہی
بیتابیِ رشک و حسرتِ دید سہی

(٢٠٣٤) ہم اور فسردن اے تجلی افسوس
تکرار روا نہیں تو تجدید سہی

(٢٠٣٣) پہلے ہم دل رکھتے تھے۔ کہ اس جان درد تمہید
(٢٠٣٤) (جس کی ابتدا درد و رنج ہے) کی (تکلیفات) سہہ گئے۔ اور رشک کی بیقراری اور حسرت دید بھی سہی افسوس اب ہم ہیں۔ اور افسردگی دل یعنی دل بالکل بجھ گیا ہے۔ اور اس میں رنج و غم تک بھی پیدا نہیں ہوتا۔ تو اے تجلی۔ یعنی اے روشن اور آشکارا ہونا۔ (مراد دل کے فسردہ ہونے کی برعکس حالت) اگر دل پھر زندہ نہیں ہو سکتا۔ یعنی یہ تکرار روا نہیں کی جا سکتی۔

تو "بیتابیِ رشک و حسرتِ دید" کی تجدید ہی سہی۔ یعنی کم از کم غم و حسرت ہی سہی۔ کہ دل کی وہ فسردہ حالت (جس میں نہ خوشی کا احساس ہوتا ہے۔ نہ غم کا وہ مُردنی تو) جاتی رہے۔

(٢٠٣٥) ہے خلق حسد قماش لڑنے کے لئے
وحشت کدۂ تلاش لڑنے کے لئے

(٢٠٣٦) یعنی ہر بار صورت کاغذ باد
ملتے ہیں یہ بد معاش لڑنے کے لئے

(٢٠٣٥) عوام دنیا لڑنے کے لئے حسد شعار ہیں۔ اور یہ
(٢٠٣٦) وحشت کدۂ تلاش معاش بھی ان کے لڑنے ہی کے لئے بنا یا گیا ہے۔ یعنی ہر مرتبہ یہ بد معاش کاغذ باد (یعنی تکل یا گڈی) کی طرح جب ملتے ہیں۔ تو گویا لڑنے ہی کے لئے جمع ہوتے ہیں۔

(٢٠٣٧) دل سخت نژند ہو گیا ہے گویا
اس سے گلہ مند ہو گیا ہے گویا

(٢٠٣٨) پر یار کے آگے بول سکتے ہی نہیں
غالب منہ بند ہو گیا ہے گویا

(٢٠٣٧ و ٢٠٣٨) ہمارا دل سخت غمگین ہو گیا ہے۔ اور

اُس دوست کا گلہ شکوہ کرتا رہتا ہے۔ لیکن جب یار کے آگے جاتے ہیں۔ تو کچھ بھی بول نہیں سکتے۔ (یعنی غم دل بیان نہیں ہو سکتا) تو غالب اب چپ سی لگی رہتی ہے۔

دکھ جی کے پسند ہو گیا ہے غالبؔ (۲۰۳۹)
دل رک رک کر بند ہو گیا ہے غالبؔ
(۲۰۴۰) واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں
سونا سوگند ہو گیا ہے غالبؔ

(۲۰۳۹) غالبؔ ہمارے دل کو اب دکھ پسند آتا ہے
(۲۰۴۰) بلکہ دل رک کر یا غم میں مبتلا ہو کر بالکل بند یعنی ٹھیری سا گیا ہے۔ (دل بند ہونا۔ ٹھیرنا یا بالکل مردہ سا ہو جانا) واللہ۔ رات کو مطلق سو نہیں سکتے۔ گویا نیند ہمارے لئے ایک قسم ہو گئی ہے۔

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل (۲۰۴۱)
سُن سُن کے اُسے سخنورانِ کامل
(۲۰۴۲) آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

(۲۰۴۱ و ۲۰۴۲) اے دل میرا یہ کلام سخت مشکل ہے

جس کو سن سن کر بہت کامل شاعر بھی مجھ سے آسان شعر کہنے کی فرمائش کرتے ہیں۔ لیکن گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل۔ یعنی اگر کچھ کہتا ہوں۔ تو سمجھنا مشکل ہوتا ہے۔ اور اگر کچھ کہوں ہی نہیں۔ تو یہ بھی مشکل ہے کہ شعر کہے بغیر رہ بھی نہیں سکتا۔

بھیجی ہے جو مجھ کو شاہ جمجاہ نے دال (۲۰۴۳)
ہے لطف و عنایات شہنشاہ پہ دال
(۲۰۴۴) یہ شاہ پسند دال بے بحث و جدال
ہے دولت و دین و دانش و داد کی دال

(۲۰۴۳) مجھ کو جمشید مرتبہ بادشاہ نے وہ دال بھیجی ہے
(۲۰۴۴) کہ جو اس کے لطف و عنایت پہ دلالت کرتی ہے۔ یہ بادشاہ پسند دال بلا قیل و قال۔ دولت۔ دین۔ دانش اور داد (انصاف) کی دال ہے۔ (یعنی ان سب کا پہلا حرف دال ہے۔) گویا بادشاہ نے یہ دال بھیجکر اپنی دولت۔ دین۔ دانش اور داد کی یاد دلائی ہے۔

ہیں شہ میں صفات ذوالجلالی باہم (۲۰۴۵)
آثار جلالی و جمالی باہم
(۲۰۴۶) ہوں شاد نہ کیوں سافل و عالی باہم
ہے اب کی شب قدر و دوالی باہم

(۲۰۴۵) ہمارے بادشاہ میں ہر دو جلالی اوصاف موجود
(۲۰۴۶) ہیں۔ اور وہ دو جلالی اوصاف آثار جلال و آثار جمالی ایک ساتھ جمع ہیں۔ (جلال کا مطلب شان قہر اور جمال رحم۔) اسی طرح اس سال دوالی اور شب قدر دونوں ایک ہی وقت آئے ہیں۔ تو اس سے اعلیٰ و اسفل کیوں نہ یکساں شاد ہوں۔ (گویا زمانہ بھی بادشاہ ہی کی روش کی تائید کرتا ہے)

رُباعی

حق شہ کی بقا سے خلق کو شاد کرے (۲۰۴۷)
تا شاہ وشیوع دانش و داد کرے
(۲۰۴۸) یہ دی جو گئی ہے رشتۂ عمر میں گانٹھ
ہے صفر کہ افزائش اعداد کرے

(۲۰۴۷) بادشاہ کی بقا سے خلق کو خدا شاد کرے تاکہ
(۲۰۴۸) بادشاہ عقل اور انصاف کو یہاں رواج دے۔ یہ جو بادشاہ کی عمر میں ایک گرہ دی گئی ہے۔ (سال گرہ کے موقع پر) یہ گویا صفر ہے۔ کہ اس سے بادشاہ کی عمر کے عددوں کی قیمت بڑھ جائے۔

رباعی

اس رشتہ میں لاکھ تار ہوں بلکہ سوا (۲۰۴۹)
اتنے ہی برس شمار میں ہوں بلکہ سوا
(۲۰۵۰) ہر سیکڑہ کو ایک گرہ فرض کریں
ایسی گرہیں ہزار ہوں بلکہ سوا

(۲۰۴۹) بادشاہ کے اس رشتہ عمر میں لاکھوں تار ہوں۔
(۲۰۵۰) بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ اور پھر اتنے ہی برس شمار کئے جائیں۔ جتنے کہ رشتۂ عمر کے تار۔ اور ان تاروں کا شمار یوں کیا جائے۔ کہ ہر سیکڑے کا ایک سمجھیں۔ اور پھر ایسے ایسے رشتۂ عمر میں گرہیں ہزاروں ہی بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ۔ گویا بادشاہ کی عمر بے حساب طول طویل ہو۔

کہتے ہیں کہ اب وہ مردم آزار نہیں (۲۰۵۱)
عشاق کی پرسش سے اُسے عار نہیں
(۲۰۵۲) جو ہاتھ کہ ظلم سے اُٹھایا ہوگا
کیونکر مانوں کہ اُس میں تلوار نہیں

(۲۰۵۱ و ۲۰۵۲) قاعدہ ہے۔ کہ جو شخص ایک دفعہ

پر مشہور ہو جائے۔ خواہ وہ چوری پھر ترک بھی کر دے تو کسی
کو اس کا اعتبار نہیں آتا۔ اسی بنا پر کہتا ہے۔ کہ سنا ہے اُس
نے اب لوگوں کو ستانا چھوڑ دیا ہے۔ اور وہ عشاق کی
پرسشِ حال کرنے سے بھی کچھ عار نہیں کرتا۔ لیکن میں کیونکر
مانوں کہ وہ ایک معشوق ہو کر ہاتھ میں تلوار نہیں رکھتا یعنی عشاق
کو قتل نہیں کیا کرتا۔ لہٰذا جو ہاتھ کہ ظلم سے اُٹھایا ہوگا۔ (خواہ
کسی پر کچھ ظلم کرنے کے لئے یا خود ظلم ہی سے ہاتھ اُٹھا رکھنے کے
لئے) اس میں تلوار مجھے ضرور نظر آئے گی۔ یعنی میں اس کو اپنے
درپے قتل ہی تصور کروں گا۔ خواہ وہ ایسا کرے یا نہ کرے۔ (مراد
یہ کہ لوگ تو کہتے ہیں۔ کہ اس نے ترکِ ستم کیا۔ مگر میں کیونکر مانوں۔
کہ وہ بحیثیت معشوق کبھی ترکِ ستم کر سکتا ہے۔)

رباعی

ہم گرچہ بنے سلام کرنے والے (۲۰۵۳)
کرتے ہیں درنگ کام کرنے والے
(۲۰۵۴) کہتے ہیں کہیں خدا سے اللہ اللہ
وہ آپ ہیں صبح و شام کرنے والے

(۲۰۵۳) ہم اگرچہ سلام کرنے والے ٹھیرے۔ یعنی ان کے
(۲۰۵۴) پاس جا کر سلام کیا کرتے۔ اور اپنی حاجت برآری

کو تقاضا کیا کرتے ہیں۔ مگر وہ درنگ یعنی دیر کرنے والے (ہماری
منت سماجت کی کچھ پروا نہ کرکے) دیر کر ہی دیتے ہیں۔ اور جو
پھر ہم اور تقاضا کرتے ہیں۔ تو وہ کہتے ہیں۔ کہ ہم خدا سے اپنا مدعا کہیں۔
اللہ اللہ (جائے تعجب ہے) کہ اللہ میاں تو خود صبح و شام
کرنے والے ہیں۔ یعنی لیت و لعل کرنے والے۔ اور مطالب
کو ٹالدینے والے ہیں۔ ان سے ہم اپنا مدعا کیا کہیں۔ مراد۔ جس
کسی سے کام پڑتا ہے۔ پس وہ دیر ہی کرکے مایوس کرنے والا
ثابت ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ خدا بھی۔

رباعی

سامانِ خور و خواب کہاں سے لاؤں (۲۰۵۵)
آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں
(۲۰۵۶) روزہ مرا ایمان ہے غالبؔ لیکن
خسخانہ و برف کہاں سے لاؤں

(۲۰۵۵) کھانے پینے کا سامان کہاں سے لاؤں (غریب
(۲۰۵۶) آدمی ہوں۔) اور پھر روزہ رکھ کے آرام
کرنے کو ٹھنڈا مکان وغیرہ اور خس کی ٹٹی اور برف کا پانی۔
(افطاری کے لئے) کہاں سے مجھے میسر آئے۔ مانا کہ غالبؔ روزہ
پر مجھے پورا پورا اعتقاد ہے۔ کہ اس کا رکھنا واجب ہے لیکن

غزبی روزہ رکھنے نہیں دیتی۔

رباعی

ان سیم کے بیجوں کو کوئی کیا جانے (٢٠٥٧)
بھیجے ہیں جو ارمغان شہ والا نے
(٢٠٥٨) گن کر دیویں گے ہم دعائیں سو بار
فیروزہ کی تسبیح کے ہیں یہ دانے

(٢٠٥٧) یہ سیم کے بیج جو بادشاہ (ظفر) نے بطور ارمغان
(٢٠٥٨) (تحفہ) مجھے بھیجے ہیں۔ ان کی نسبت کوئی کیا
جانے۔ کہ یہ کیا چیز ہے۔ یہ دراصل فیروزہ (پتھر) کی تسبیح کے
دانے ہیں۔ کہ جن دانوں کو پھرا پھرا کر ہم بادشاہ کو سو دعائیں
یعنی بہت سی دعائیں دیا کریں گے۔ (تسبیح عموماً سو دانوں کی
بنائی جاتی ہے)۔

عنقائے معانی یعنی شرح اُردو دیوان غالب
جلد دویم ختم ہوئی

(مطبوعہ انقلاب سٹیم پریس بیرون موری دروازہ لاہور) باہتمام ملک

ضمیمہ **غالب کی شاعری** ضمیمہ

ادبِ اُردو آجکل غالبؔ کو ایک الہامی شاعر قرار دیتا ہے۔ جیساکہ وہ خود ایک جگہ صاف لکھتا ہے

گر شعر و سخن بدہر آئیں بودے ‏ دیوان مرا شہرت پروین بودے
غالبؔ اگر ایں فن سخن دیں بودے ‏ آں دین را ایزدی کتاب ایں بودے

ایک الہامی کلام سے عموماً مراد بے مثل و بے نظیر کلام ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ مر
شاعری ہر لحاظ سے ایسی ہے۔ کہ جس کی خصوصیات مختصراً مندرجہ ذیل ہیں۔

١۔ فصاحت و بلاغت۔ کلام غالب کا آخری دور (جیساکہ اس کتاب کی جلد اول میں
کیا گیا تھا) بہت فصیح ہے۔ بلکہ بعض غزلیں سہل ممتنع واقع ہوئی ہیں۔ مثلاً ؎

ابن مریم ہوا کرے کوئی ‏ میرے دکھ کی دوا کرے کوئی
یا
کوئی امید بر نہیں آتی ‏ کوئی صورت نظر نہیں آتی

وغیرہ وغیرہ۔ بلحاظ بلاغت مرزا اپنے قلیل الفاظ سے اسقدر مطالب پیدا کرتے
کہ ایک ایک شعر کی مکمل شرح کی جائے تو ایسی کئی جلدیں درکار ہوں۔ مثلاً ؎

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا جو میری شامت آئے ‏ اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے

٢۔ بحریں۔ مرزا نے اُردو زبان میں زیادہ تر غزلیں ہی لکھی ہیں۔ مگر انکے لئے ہر
کام لیا ہے۔ بلکہ کئی مشکل سے مشکل بحروں میں بھی شعر کہا ہے! اور عمدہ عمدہ خیالات پیدا کئے ہیں
کتنے ہونہ دیکھئے ہم دل اگر پڑا پایا ‏ دل کہاں کہ گم کیجے ہم نے مدعا پایا
یا
آکہ میری جان کو قرار نہیں ہے ‏ طاقت بیداد انتظار نہیں ہے

٣۔ جدت خیالات۔ زبان فارسی کے اعلیٰ درجے کے نازک خیال شعراء
جلال اسیر، صائب، اور بیدل وغیرہ) کے تتبع میں مرزا نے حسن و عشق تصوف! وغیرہ
وغیرہ کے متعلق ادبِ اردو میں ہزارہا نئے نئے خیالات داخل کئے۔ جسکی مثالیں انکے تمام

موجود ہیں، خصوصاً حسن و عشق کے متعلق بڑے پتے کی باتیں وہ ہنسی ہنسی میں کہہ جاتا ہے مثلاً معشوق کے دلی تنفر کو کیسا خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے ؎

میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیے غیر سے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھکو اٹھا دیا کہ یوں

تصوف

جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

یا

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خودبیں

۴۔ اسلوب بیان۔ مرزا کا اسلوب بیان بہت دقیق ہے۔ کیونکہ ادائے مطالب میں اس نے معمول سے زیادہ فارسی الفاظ و محاورات سے کام لیا ہے۔ اور اشعار کے معنی بھی عموماً وہ مقصور رکھے ہیں کہ بعض اوقات وہ عوام تو کیا خواص سے بھی ذہن نشین نہیں ہو سکے۔ بالخصوص وہ اشعار کہ جن میں کسی فارسی محاورے کو با ترجمہ یا بلا ترجمہ استعمال کیا ہے۔ مثلاً ؎

از مہر تا بہ ذرہ دل و دل ہے آئینہ
طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ

یا

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

ان میں جو فارسی محاورات برتے گئے ہیں، انکو تشریح ہذا میں ملاحظہ فرمائیں۔

۵۔ آئینہ جذبات۔ مرزا نے غم و حسرت، غصہ و مسرت، رشک و رقابت، تنگدلی اور ابنائے عالم کی خود غرضی، بیگانگی وغیرہ کے مضامین بہت خوش اسلوبی سے نظم کئے ہیں۔ ایسی مثالیں دیوان ہذا میں بکثرت پائی جاتی ہیں

۶۔ واعظ و شیخ۔ مرزا نے ان سے بظاہر کچھ تخاطب نہیں کیا ہے۔ مگر ان کے بعض کوتہ خیالات کی خوب دھجیاں اڑائی ہیں مثلاً ؎

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

یا

زندگی اپنی اسی طرح جو گذری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کرینگے کہ خدا رکھتے تھے

یا

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں

غرض بلحاظ مجموعی مرزا کے کلام سے ادب اردو کو لفظاً و معناً بہت وسعت حاصل ہوئی ہے۔ اور اس کا رتبہ اردو کے کسی شاعر سے کیا دنیا کے کسی شاعر سے بھی ہرگز کم نہیں ہے۔

عنقائے معانی

یعنی

بہترین و صحیح ترین و مکمل شرح دیوان غالب (اردو) معہ ضمیمہ

انتخاب "نسخہ حمیدیہ"

از محقق اردو زبان جناب **شیر علیخان** معروف بہ مولانا **سرخوش**

مؤلف تذکرہ اعجاز سخن مترجم و کلائے سرفروش رباعیات بابا طاہر وغیرہ

بفرمائش پاپولر بکڈپو موہن لال روڈ بیرون موری دروازہ لاہور

قیمت فی جلد عہ - تینوں جلدوں کی مجموعی قیمت سعہ

انقلاب سٹیم پریس لاہور باہتمام ملک دین محمد پرنٹر چھپا اور شیر علیخان پبلشر نے چھپوا کر موہن لال روڈ لاہور سے شائع کیا

ضمیمہ

عنقائے معانی

(انتخاب نسخۂ حمیدیہ دیوانِ غالب)

تنگی رفیقِ رہ تھی عدم یا وجود تھا (۱) میرا سفر بہ طالعِ چشمِ حسود تھا

(۱) میں عالمِ عدم میں تھا۔ یا اس دنیا میں ہر جگہ تنگی میرے ساتھ تھی۔ گویا میری یہ سرگزشت حاسد کی آنکھ کی طرح ہے جسے ہمیشہ تنگ بتایا کرتے ہیں۔ تنگی سے تعلق رکھتی ہے۔ (عالمِ عدم بھی بوجہ نیستی ہونے کے گویا سخت تنگ ہوتا ہے)

مہ اخترفشاں کی بہرِ استقبال آنکھوں سے (۲) تماشہ کشورِ آئینہ میں آئینہ بند آیا

(۲) وہ چاند سا محبوب جس کے وجود سے گویا ستارے جھڑتے ہیں۔ اس کے انتظار میں یہ تماشہ میری آنکھوں میں ظہور پذیر ہوا کہ کشورِ آئینہ یعنی میری آنکھیں جو بوجہ حیرت آئینے کا ملک بن گئی تھیں۔ (کیونکہ آئینے کو حیرت سے مناسبت ہوتی ہے۔) ایک ایسے کشورِ آئینہ میں وہ آئینہ بند یعنی زیب و زینت کرنے والا آگیا یا سما گیا اور یہ امر موجبِ حیرت ہے۔ آئینہ بند = زیب و زینت دینے والا۔

تغافل بدگمانی بلکہ میری سخت جانی ہے (۳) نگاہِ بے حجابِ ناز کو بیمِ گزند آیا

(۳) بلکہ ایک عربی لفظ بل سے مرکب ہے جس کا مفہوم زیادہ یہ کیفیت

یا حالت ہے۔ حلِ شعر۔ محبوب کی بے حجاب نگاہ کو جو سخت مؤثر ہوا کرتی ہے یہ بیم یا ڈر ہے کہ وہ مجھ پر پڑی اور اس سے گزند ہوا یعنی بوجہ مؤثر نہ ہونے کے گویا ضائع گئی تو اس محبوب نے خیال کیا کہ میں اس کی طرف سے غافل تھا۔ اس لئے یہ بات واقع ہوئی حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ میں اس سے غافل نہیں ہوں۔ بلکہ خود ہی ایسا سخت جان ہو گیا ہوں کہ اس کی ایسی بے حجاب مؤثر نگاہِ ناز بھی مجھ پر کچھ اثر نہ کر سکی

فضائے خندۂ گل تنگ و ذوقِ عیش بے پروا (۴) فراغت گاہِ آغوشِ وداعِ دل پسند آیا

(۴) خندۂ گل یعنی بہار کی فضا یا اسکا موسم بہت تھوڑا عرصہ رہتا ہے۔ اور لذتِ عیش ہم جیسوں سے بے پرواہ ہے یعنی ہمارے نصیب ہی میں نہیں ہے لہذا اپنے دلِ عیش پسند (دل کو اپنے سے جدا کر کے جو فراغت گاہ یعنی فراغ کا زمانہ ہمیں میسر ہوا۔ وہ بہت پسند آیا (کہ نہ دل رہا نہ عیش کا خیال)

ہوئی جس کو بہارِ فرصتِ ہستی سے آگاہی (۵) برنگِ لالہ جامِ بادہ بر محمل پسند آیا

(۵) جس کسی کو زندگی کی (کم) فرصتِ بہار کا علم ہو گیا۔ اس نے گلِ لالہ کی طرح محمل ہی پر بادہ (نوشی) کرنا پسند کیا یعنی چلتے چلتے وہ ایک گھونٹ چڑھا لئے۔ زیادہ تردد فضول سمجھا۔ جیسے مسافر کبھی تردد و تکلف نہیں کیا کرتا۔

نوٹ۔ گلِ لالہ قدرے آسمان کی طرف اٹھا ہوا ہوتا ہے۔ لہذا وہ بصورتِ محمل یا کپی وہ ... کرتا ہے

وحشتِ خوابِ عدم شورِ تماشہ ہے اسد (۱) جو مزہ جوہر نہیں آئینۂ تعبیر کا

(۱) انسان خوابِ عدم میں پڑا تھا کہ شورِ تماشہ یعنی اس دنیا کے شور سے وہ جاگ اٹھا۔ یعنی اس شور سے خوابِ عدم میں وحشت یا خلل واقع ہوا۔ تو اس تعبیر یعنی خواب مذکور کی حالت مابعد کا آئینہ یعنی اس کی کیفیت کچھ بد مزہ جوہر نہیں ہے۔ یعنی اس کی اصلیت یا خواص کچھ بد مزہ نہیں۔ مراد یہ کہ دنیا کے شور نے انسان کو خوابِ عدم

سے جگایا تو یہ دنیا جو اس خوابِ عدم کی گویا تعبیر ہے بڑی لطف انگیز ہے۔ کیونکہ دنیا
بہ نسبت عدم فی الواقع عیش مزے کرنے کی جگہ ہے (نسخہ حمیدیہ دیوانِ غالب میں جو مزہ
غلط لکھا ہے۔ صحیح بدمزہ ہے)

بازیٔ خورفریبی ہے اہلِ نظر کا ذوق (۷) ہنگامہ گرم حیرتِ بود و نبود تھا

۷۔ جو لوگ عقل سلیم نظر رکھتے ہیں۔ انکا ذوقِ نظر انکو (دنیا کی اصلیت کی طرف سے)
بہت دھوکا دے رہا ہے کیونکہ یہ عالمِ وجود ایک ہنگامہ گرم حیرت ہے یعنی سخت متحیر
کن مقام ہے۔ در بارہ بود و نبود یعنی ایک کیفیت اب نظر کے سامنے ہے اور اہلِ نظر
اسکو بود یا موجود مان رہے ہیں یکدم ہی وہ نبود یعنی بہ حالتِ معدوم ہو جاتی ہے۔

گردشِ محیطِ ظلم رہا جس قدر فلک (۸) میں پائمالِ غمزۂ چشمِ کبود تھا

۸۔ آسمان کی رنگت عموماً نیلی ہوا کرتی ہے اور بعض معشوق بھی نیلی چشم کبود نظر آیا
کرتے ہیں۔ اسی مناسبت سے کہتا ہے کہ جس قدر آسمان مجھ پر ظلم کرنے کو چکر کھاتا رہا۔
اسی قدر میں کسی کی نیلی آنکھ کے غمزوں کا پائمال رہا۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب (۹) ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

۹۔ یارب ہماری تمنا کا ایک قدم تو گویا یہ دنیا ہے یعنی ہماری دوڑ دھوپ یہاں تک
محدود ہے اور ہم جو کچھ آرزو کرتے ہیں۔ اس کا ماحصل یہ دنیا ہے۔ مگر ہمارا دوسرا
قدم اس اگلے جہان یا عالمِ عقبیٰ کی طرف ہے (کیونکہ دین و دنیا ہی انسان کے دو
تمناگاہ ہیں) تو حیرت ہے کہ وہ عالم کہاں ہے حالانکہ یہ دشتِ امکان یعنی دنیا بلا شبہ تو ہمارا
وہ نقشِ قدم ہے کہ جس سے ہم گزر چکے یا جس سے جاری تمنا کا ایک قدم پار ہو چکا ہے
اور اب دوسرا کسی عالم کی طرف جا رہا ہے

بے دماغِ خجلت ہوں رشکِ امتحاں تا کے (۱۰) ایک بیکسی تجھ کو عالم آشنا پایا

۱۰۔ یہاں ایک بیکسی اور جیرودی کا سا عالم ہے یعنی بے کوئی پوچھتا تک نہیں اور ادھر

دوست گویا عالم آشنا ہے یعنی سب اسی کے دوست ہیں۔ تو وہ ہمیں رشکِ امتحان کیو
دلاتا ہے۔ یعنی اوروں سے ہماری وفا کا مقابلہ کیا کرتا ہے۔ ہم تو بوجہ بیکسی کچھ کر
نہیں سکتے اور اغیار جو زیادہ وسائل رکھتے ہیں۔ وہ تیرے ساتھ مقابلتاً بہت
وفا کر سکتے ہیں۔ لہٰذا اب میں بے دماغِ خجلت ہوں مراد ایسی کسی رسوائی کی کچھ پر
ہی نہیں کرتا کہ یہ معاملہ میری طاقت ہی سے باہر ہے (دوسرے مصرعے میں
بیکسی سے پہلے یہاں کا لفظ بوجہ تنگیٔ قافیہ درج ہونے سے رہ گیا ہے اس شعر میں

فکرِ نالہ میں گویا حلقہ ہوں زسر تا پا (۱۱) عضو عضو جوں زنجیر یک دلِ صدا پایا

۱۱۔ شور و فغاں کے فکر یا تردد میں میری یہ حالت ہے کہ گویا ایک مجسم زنجیر بن گیا ہوں
جس طرح زنجیر کی سب کڑیاں ایک ہی مرتبہ بہ یکدل و جان یعنی سب کی سب ایک
شور برپا کر دیتی ہیں۔ میرا عضو عضو بدن بھی اس طرح دفعتہً نالہ بپا کیا کرتا ہے

اسدؔ جفا سائل نے ستمِ جنوں کیا (۱۲) کھچکر جس قدر ڈھونڈا الفت آزما پایا

نسخہ حمیدیہ دیوانِ غالب میں بعض الفاظ غلط طور پر نقش ہو گئے ہیں۔ جیسا کہ
غمِ جنوں کو ستمِ جنوں لکھدیا گیا ہے جل شعر یہ اسد نے تو کسی معشوق سے جو بد جفا ک
ہے۔ اور نہ اس سے غمِ جنوں حاصل کرنے کا شائق ہے۔ حالانکہ تجھ کو جس قدر
یعنی آزمایا تو الفت آزما ہے مراد یہ کہ جو بد جفا کر کے میری محبت کا امتحان کیا
ہے۔ سو مجھے ایسی باتوں کا شوق نہیں ہے۔ یا مجھ سے ایسی باتیں اس
ہو سکتی کہ جس قدر تو الفت آزما ہے۔

نہ ہوئی ہم سے رقم حیرتِ خطِ رخِ یار (۱۳) صفحۂ آئینہ ہوا آئینہ طوطی نہ
دوست کے رخساروں کے خط کو دیکھکر جو حیرت ہمیں نہ عق ہوئی۔ اس کا
کبھی ہم سے ادا نہ ہو سکا چنانچہ کاغذ کا ایک صفحہ آئینہ ہو یعنی لکھا گیا۔ ویسی بھی
یعنی ہمارا آئینۂ دل طوطی نہ ہوا۔ مراد پوری طرح اپنی کیفیت پیش نہ کر سکا یعنی

شب اختر قدحِ عیش نے محمل باندھا (۱۴) بارِ یک قافلۂ آبلہ منزل باندھا

۱۴۔ چاندنی رات میں عیش کے قدح نے محمل باندھا یعنی چاندنی رات میں مجھ کو عیش عشرت کا خیال پیدا ہوا۔ اور میں اس قدر یہ راہ طے کرنے لگا۔ کہ گویا ایک قافلۂ آبلہ منزل باندھا اور دور تر جانے سے جیسے پاؤں میں چھالے پڑ جاتے ہیں۔ اور ایک ایسی دور کے منزل گویا آبلہ پائی کی منزل بھی جانی چاہیئے۔ اس قسم کی دور تر منزلوں کے طے کرنے کے لئے میں نے ایک بار قافلہ باندھا۔ یا ان کے طے کرنے کے لئے مستعد ہو گیا۔ حاصل شعر یہ کہ چاندنی رات کو میں نے خوب گھر سے اڑانے کا ارادہ کر لیا ہے۔

سبحہ واماندگی شوق و تماشہ منظور (۱۵) جادہ پُر زیور رسا آئینہ منزل باندھا

۱۵۔ سبحہ واماندگی شوق و تماشہ سے مراد ایسی تسبیح کہ جو شوق و تماشہ (دنیا ہش و ہوس) سے واماندہ یا اس کی طرف مائل نہیں ہے یہ (تسبیح) مجھے پسند آئی ہے ہٰذا میری راہ جو میں نے بطور سالک اختیار کی ہے۔ وہ صد آئینہ (آئینہ بمعنی صاف و شفاف) ہے اور صد آئینہ منزل۔ مراد پاکیزہ راہ ہے۔ ہٰذا جادہ پُر زیور یعنی میری راہ بطور سالک ایسی پاکیزہ منزل سے پُر زیب و زینت ہے۔ حاصل شعر یہ کہ میں عیش و ہوس سے منزہ ہوں اور ایک پاکیزہ و زینیدہ راہ کا سالک ہوں۔

حسنِ آشفتگی جلوہ سے عرضِ اعجاز (۱۶) دستِ موسیٰ بہ سرِ دعوے باطل باندھا

۱۶۔ اس شعر میں حضرت موسیٰ کے دعوے دیدارِ خدا کی طرف اشارہ کیا گیا ہے مراد یہ کہ حسن آشفتگی جلوہ یعنی خدا کا دیدار۔ دیکھ کر موسیٰ پر جو حیرانی کی ایک عجیب کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ وہ گویا عرض اعجاز یعنی خدا کا معجزہ نما ہونا تھا۔ اس سے موسیٰ کے دعوے دیدار کا ہاتھ گویا اس دعوے کے سر سے باندھ دیا گیا تھا۔ یعنی موسیٰ کا دعوے باطل کر دیا گیا تھا۔ (اعجاز کا یہ قاعدہ ہے۔ کہ وہ کسی دعوے کا ابطال کیا کرتا ہے)۔

ناتوانی سے تماشائی عمرِ رفتہ (۱۷) رنگ نے آئینہ آنکھوں کے مقابل باندھا

۱۷۔ بڑھاپے میں کمزوری گویا گذشتہ عمر کا حال ظاہر کر رہی ہے۔ یعنی اس کمزوری سے منتج ہو رہا ہے کہ انسان بہت بوڑھا ہو گیا ہے۔ گویا اسی رنگت نے دیکھنے والوں کی آنکھوں کے سامنے ایک آئینہ باندھ دیا کہ جس کی بدولت وہ انسان کی پیری کی حالت معلوم کر سکے۔

تپشِ آئینہ پروازِ تمنا لائی (۱۸) نامۂ شوق بہ بالِ پرِ بسمل باندھا

۱۸۔ نامۂ شوق کو بسمل (مرغ) کے پر سے باندھ دیا (تو وہ اڑا) گویا تپش آئینہ یعنی میرے دل کی تڑپ پروازِ تمنا لائی مراد تڑپ شوق نے مجھ کو یوں پرواز میں لائی۔ یا اس طرح سے ہماری دلی تمنا کا اظہار ہوا۔

دیدہ تا دل ہے یک آئینہ چراغاں کس نے (۱۹) خلوتِ ناز پہ پیرایۂ محفل باندھا

۱۹۔ تنہائی میں محبوب مجھ سے ناز کرنے لگا۔ تو اس خلوتِ ناز میں اس کے چہرے کی خوبصورتی مجھ پر چراغاں کی طرح روشنی ڈالنے لگی۔ ہٰذا چراغاں جو محفل سے نسبت رکھتی ہے۔ اور جس سے میری آنکھوں سے لے کر دل تک روشن ہو گئے یہ تنہائی کے عالم میں محفل کا سماں کس نے پیدا کر دیا۔

موج سے پیدا ہوئے پیراہنِ دریا میں خار (۲۰) گریہ وحشت بیقرار جلوۂ مہتاب

۲۰۔ خار در پیراہن۔ ایک فارسی محاورہ ہے یعنی ایذا پہنچانا۔ موج سے یہاں موجِ گریہ ہے۔ گریہ وحشت بیقرار گریہ بہ حالتِ وحشت و پریشانی بیقرار تھا۔ گویا ادھر لہر اور موج کی صورت میں بیقرارانہ بہہ رہا تھا۔ جلوۂ مہتاب۔ چاندنی کا نظارہ۔ چاندنی رات کا جلوہ دیکھ کر مجھے جو دوست کی یاد آئی (قاعدہ ہے کہ موسم بہار یا چاندنی عالم میں دوست کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔) تو اس قدر رویا کہ گریہ لہروں کی صورت بہنے لگا۔ اور اس قدر کہ اس سے دریا کے پیراہن میں بھی خار محسوس ہونے لگا گویا

بھی رشک کی تکلیف اٹھانے لگا۔ (یہ ساری غزل دوست کی یاد اور اس کے عواقب ہی کے متعلق ہے)

جوشِ تکلیفِ تماشا محشرآبادِ نگاہ (۲۱) فتنۂ خوابیدہ کو آئینہ مشتِ آب تھا

۲۱۔ دوست کا شوقِ آئینہ اس قدر ہے کہ اس کے تماشا یعنی آئینے کے دیکھنے کے تردد کا جوش دوست کیلئے گویا ایک محشرآبادِ نگاہ بن گیا ہے یعنی یہ شوقِ آئینہ اس کیلئے گویا فتنۂ قیامت بن گیا ہے۔ اور اس سوئے ہوئے فتنے کو جگانے یعنی تر و تازہ کرنے کے لئے دوست کا آئینہ ایک مشتِ آب ہے مراد ایک چلو ہے کہ کسی سوئے ہوئے پر ڈالیں تو وہ خواب سے جاگ اٹھتا ہے۔

بیخبر مت کہہ ہمیں بیدرد خودبینی سے پوچھ (۲۲) قلزمِ ذوقِ نظر میں آئینہ پایاب تھا

۲۲۔ یہ شعر بھی دوست کے شوقِ آئینہ کی تفسیر ہے کہتا ہے تو مجھکو بیخبر یا اپنی طرف سے غافل ہونے کا طعنہ نہ دے۔ اے ظالم تو اپنی ہی خودبینی یا غرور سے پوچھ کہ شوقِ آئینہ میں کبھی فرصت ہی نہیں ملی گویا تیرا یہ ذوقِ نظر یا شوقِ آئینہ بینی ایک دریائے ذخار ہے جس میں وہ تیرا منہ دیکھنے کا آئینہ بھی پایاب یا غرق ہو گیا ہے۔ مراد آئینہ بینی کے شوق میں خود ہی اس قدر محو ہے اور دوسروں کو غافل ہونے کی تہمت لگاتا ہے۔

زبس آتش نے فصلِ رنگ میں رنگِ دگر پایا (۲۳) چراغِ گل سے ڈھونڈے ہے چمن میں شمع خار اپنا

۲۳۔ بہار کے موسم میں آگ بھی اب دوسری کوئی وضع اختیار کر چکی ہے۔ چنانچہ شمع اپنے خار یعنی پتنگ کو تلاش کرتی ہے تو وہ اس کو چراغِ گل سے (جو موسمِ بہار میں آگ کی طرح سرخ رنگ کا ہوا کرتا ہے) ڈھونڈ کر حاصل کرتی ہے۔

اگر آسودگی ہے مدعائے رنجِ بیتابی (۲۴) نثارِ گردشِ پیمانۂ مے روزگار اپنا

۲۴۔ اگر ہر قسم کی بیقراری یا زحمت کشی کا حاصل حصول محض آسودگی ہے۔ تو پھر ہمارے شراب کے پیالے کی گردش یعنی اس کی زحمت کشی پر ہمارا روزگار نثار ہے

یعنی ایسی زحمت کشی کے معاوضے میں ہم دنیا کے کاروبار یا اس کے مفاد کی کچھ پرواہ نہیں کرتے۔ یہی ہماری آسودگی یا فلاح اور بہتری کا سامان ہے۔

ہوس گستاخیٔ آئینہ تکلیفِ نظربازی (۲۵) بجیبِ آرزو پنہاں ہے حاصل دلربائی کا

۲۵۔ ہوس گستاخیٔ آئینہ۔ دل کے آئینے کی گستاخانہ ہوس۔ حاصل دلربائی مراد مقصدِ عشق۔ جس شعر نظربازی کی تکلیف اٹھانا تو آئینۂ دل کی گویا گستاخانہ ہوس کی دلیل ہے۔ لہٰذا یہ جیبِ آرزو یعنی شوقِ عشق کو چھپ کر رکھنا یا اسکو خفیہ رکھنا ہی مقصدِ عشق ہے۔ اسکا نظربازی کے ذریعے اظہار نہیں ہونا چاہئے۔ جو ایک طرح کی گستاخانہ حرکت ہے

کس کا خیال آئینۂ انتظار تھا (۲۶) ہر برگِ گل کے پردے میں دل بیقرار تھا

۲۶۔ مصنف کہتا ہے۔ باغ میں پھولوں کو بھی اس کی آمد کا انتظار تھا۔ لہٰذا پوچھتا ہے کہ یہ کس محبوب کی یاد پھولوں کے لئے انتظار کا آئینہ بن گئی تھی۔ (یعنی جیسے آئینہ سامنے رکھکر گھنٹوں دیکھا کرتے ہیں۔ اسی طرح وہاں دوست کا انتظار بھی بہت عرصہ کیا جا رہا تھا) کہ پھول کی ہر پتی کے پردے میں گویا ایک دل رہا پھول کا دوست کے لئے بیقرار تھا۔

کس کا جنونِ دید تمنا شکار تھا (۲۷) آئینہ خانہ وادیٔ جوہر غبار تھا

۲۷۔ کس کو آئینہ دیکھنے کا شوق رہا ہمارا تمنا شکار تھا۔ یعنی دوست بوجہ آئینہ بینی ہم سے غافل تھا اور یوں ہماری آرزو کا گویا خون ہو گیا تھا اور آئینہ خانہ یعنی ہمارا یہ آئینہ دل وادی جوہر غبار رہا یعنی ایک ایسی جوہرِ آئینہ کی وادی بن گیا تھا کہ جس کا ہر جوہر جوہر نہیں بلکہ ہمارے دل کا ایک غبار تھا یا جو کہ دشت بن گیا تھا۔

دیکھی وفائے فرصتِ رنج و نشاطِ دہر (۲۸) خمیازہ یک درازیٔ عمرِ خمار تھا

۲۸۔ دنیا کے رنج اور خوشی کے قیام کی مدت تو ہمیں معلوم ہے کہ یہ کچھ بھی طویل نہیں ہوتی۔ اس پر جو خمار یعنی اسی کیفیت رنج و نشاط کے گزر جانے کے بعد جو حالت واقع ہوا کرتی ہے۔ وہ ایک عمر بھر طاری رہا کرتی ہے۔

صبحِ قیامت ایک دُمِ گرگ تھی اسد (۲۹) جس دشت میں وہ شوخ دو عالم شکار تھا

۲۹: دُمِ گرگ ۔ فارسی محاورہ ہے بمعنی صبح کاذب ۔ شوخ دو عالم شکار ۔ مراد عاشق کی دین و دنیا دونوں کو تباہ و برباد کرنیوالا ۔ حل شعر ۔ وہ شوخ ہماری دین و دنیا یعنی دونوں عالموں کے برباد کرنیوالا جس جنگل میں تھا ۔ وہاں کی ایک صبح کاذب گویا صبح قیامت تھی دُمِ گرگ شکار ۔ اسد دشت کی رعایت ہی ایسے ناقص شعر کے کہنے کی مقتضی ہوگئی ہے ۔

زبس خوں گشتہ رشکِ وفا تھا وہمِ بسمل کا (۳۰) چرایا زخمہائے دل نے پانی تیغِ قاتل کا

۳۰ ۔ جب دل کے زخموں نے تیغِ قاتل کی آب کو چرا لیا ۔ مراد زخموں کے اندر جب تلوار داخل ہوئی ۔ اور انہوں نے گویا آبِ تیغ کو چرا لیا تو اس رشکِ وفا یعنی زخم کی وفاداری کے رنج و رشک میں عاشق بسمل کا وہم یا وسواس بہت خون گشتہ ہوا ۔ مراد برہم ہوا ۔ مطلب شعر یہ کہ عاشق کو وسواس ہے کہ اس کے زخمِ دل میں جو پانی چرا گیا ہے ۔ وہ آبِ تیغ بارے لیا گیا ہے ۔ اسلئے اسے رشکِ وفا ہے یعنی وفا پر غصہ و بیر بھی پیدا ہوتی ہے

نگاہِ چشمِ حاسد وام لے اے ذوقِ خود بینی (۳۱) تماشائی ہوں وحدت خانۂ آئینۂ دل کا

حاسد کی آنکھ ہمیشہ تنگ بتائی جاتی ہے ۔ لہذا کہتا ہے کہ میں اپنے آئینۂ دل کے وحدت خانے کے دیکھنے کا مشتاق ہوں ۔ لہذا اے ذوقِ خود شناسی حاسد کی (تنگ بین) نگاہ بطور قرض سے لے تاکہ مجھے آئینۂ دل بہت تنگ دکھائی دے اور یہ وہ وحدت خانہ ہو کہ جس میں کثرت سے کچھ سروکار نہ رکھا گیا ہو ۔

شرر فرصت نگہ سامانِ یک عالم چراغاں ہے (۳۲) بقدرِ رنگ یاں گردش میں ہے پیمانہ محفل کا

۳۲ ۔ ہماری نگاہ تو ایک شرارے کی طرح کم فرصت ہے مگر جو چراغاں اس محفلِ دنیا میں ہو رہی ہے ۔ یعنی جو رونق اور چہل پہل یہاں موجود ہے ۔ وہ بہ سامانِ یک عالم ہے ۔ یعنی کثرتِ ساز و سامان کو لئے ہوئے ہے تاہم بقدرِ رنگ یعنی جس قدر کہ

رنگ و بہار قیام ہو سکتا ہے ۔ اسی کے اندازے کے مطابق محفلِ دنیا میں پیمانۂ عیش کو گردش نصیب ہوا کرتی ہے ۔ مراد یہ کہ دنیا میں سامانِ عشرت تو کثرت موجود ہے ۔ مگر فرصتِ ہستی اتنی ہی حاصل ہے ۔ جتنا کہ موسمِ بہار چند روزہ ہوا کرتی ہے ۔

شگفتن کمین دارِ تقریب جوئی (۳۳) تصور ہوں بے موجب آزردگاں کا

۳۳ ۔ وہ لوگ جو بلا وجہ آزردہ رہا کرتے ہیں ۔ میں ان کا تصور یا ان کی ایک تصویر ہوں کہ جن کا شگفتن یعنی کھلنا یا بشاش ہونا گویا کمین دارِ تقریب جوئی ہوتا ہے یعنی وہ بشاش ہونا کسی خاص موقع کی گھات میں چھپا رہا کرتا ہے ۔ کہ محض کوئی ایسا اتفاق ہی پیش آئے تو وہ مسرور ہو سکیں گے ۔ ورنہ آزردہ ہی رہیں گے ۔

غریبِ بدرجستہ بازگشتن (۳۴) سخن ہوں سخن بر لب آوردگاں کا

۳۴ ۔ بدرجستہ بازگشتن ۔ دروازے تک جا کے لوٹ آنا ۔ حل ۔ میں ان لوگوں کی بات ہوں جو کہ سخن برلب آوردہ ہیں ۔ یعنی جن کے ہونٹوں پر بات آ گئی ہے ۔ اور وہ بات گویا دہن تک آ کے رہ جاتی ہے ۔ اسی طرح میں بھی غریبِ بدرجستہ بازگشتن ہوں یعنی ایسا مسافر ہوں کہ جس کو کسی کے دروازے تک جانا اور پھر وہاں سے لوٹ آنا پڑتا ہے ۔

سراپا یک آئینہ دارِ شکستن (۳۵) ارادہ ہوں یک عالم افسردگاں کا

۳۵ ۔ میں شکستن یعنی ٹوٹ پھوٹ کا ایک مجسم آئینہ دار ہوں ۔ یعنی سرتاپا اظہارِ شکستگی کیا کرتا ہوں ۔ گویا میں ان افسردہ رہنے والوں کا ارادہ ہوں جو کہ یک عالم یعنی بے انتہا افسردہ ہیں ۔ اور جن کا دل ہمیشہ ٹوٹا ہی رہا کرتا ہے ۔

ضعفِ جنوں کو وقتِ تپش در بھی دور تھا (۳۶) اک گھر میں مختصر سا بیاباں ضرور تھا

۳۶ ۔ دیوانگی کے سبب ضعف ہوا تو اس وقت بوجہ اضطرابِ دل اپنے دروازے تک پہنچنا بھی بہت دور معلوم ہوتا تھا ۔ یعنی اپنے گھر کے دروازے تک بھی نہیں جا سکتے

تھے۔ حالانکہ ایسے جنونی جیسے کہ ہم ہیں۔ ہمارے لئے خود اپنے ہی گھر میں (بوجہ ویرانی) ایک بیابان بیشک موجود تھا۔ لیکن ہم اس میں چل پھر بھی نہیں سکتے تھے۔

اے وائے غفلتِ نگہِ شوق ورنہ یاں (۳۷) ہر پارہ سنگ لختِ دلِ کوہِ طور تھا

۳۷۔ نگہ شوق کی بے پروائی تجھ پر افسوس ہے (کہ تو کچھ تمیز نہیں رکھتی یا پروا نہیں کرتی) ورنہ دنیا میں ہر ایک پتھر کا ایک ٹکڑا کوہ طور کے دل کا گویا ایک ٹکڑا ہے۔ مطلب یہ کہ خدا تو سب چیزوں میں موجود ہے۔ مگر ہماری نگاہ ہی اسکو دیکھنے میں غفلت کرتی ہے (کوہ طور پر خدا نے موسیٰ کو دیدار دکھایا تھا۔ اسی لئے وہ پہاڑ مقدس مانا جاتا ہے)

جنت ہے تیری تیغ کے کشتوں کی منتظر (۳۸) جوہر سوادِ جلوۂ مژگانِ حور تھا

۳۸۔ چونکہ جنت کی ہر حور کی پلکوں کی صورت ایسی ہے جیسے کہ کوئی جوہر سواد ہو۔ یعنی اس کے ارد گرد آبجے کی طرح کے جوہر نظر آتے ہوں (مانند کسی کی آنکھوں کی پلکیں مثل جوہر بھی کھڑی دکھائی دے سکتی ہیں کہ وہ شخص کسی کے انتظار میں ہو لہذا جنت یا اہل جنت بھی تیری تیغ قتل کے گھائل لوگوں کے منتظر ہیں (جو ہر سواد ایسے جیسے ہو سکتے ہیں۔ سواد شہر یعنی کسی شہر کی فصیل جوہر سواد۔ وہ جس کا کنارہ جوہر آئینے سے گھرا ہو

ہر رنگ میں جلا اسدِ فتنہ انتظار (۳۹) پروانۂ تجلیِ شمعِ ظہور تھا

فتنہ سے یہاں مراد روزِ قیامت ہے جبکہ خدا اپنا دیدار سب لوگوں کو دکھائیگا۔ شمع ظہور۔ خدا کا جلوہ دکھانا مثل شمع۔ ۳۹۔ چونکہ اسد قیامت کا منتظر تھا اور جلوہ خدا کے دیکھنے کا پروانہ تھا۔ وہ ہر ایک حالت یا ہر رنگ میں (جیسا کہ خدا ہر شے میں موجود ہے) جلتا رہا یعنی تکلیفیں اٹھاتا رہا۔ تاکہ روز آخرت خدا کا دیدار کرے جبکہ وہ بہشت میں داخل ہو

بہار رنگِ خونِ گل ہے ساماں اشکباری کا (۴۰) جنونِ برق نشتر ہے رگِ ابرِ بہاری کا

۴۰۔ چونکہ گلہائے پھول کی سرخی کی کیفیت کی بہار میرے لئے خون کے آنسو بہانے کا ساز و سامان ہے۔ لہذا میرے نزدیک ابر بہار کی رگ یعنی اس کے اندر جو بجلی کو جنون یا

اضطراب کی سی حالت ہو رہی ہے وہ گویا اس رگ ابر بہار پر ایک نشتر چل رہا ہے علاوہ بریں غم کی حالت میں مجھکو عیش کے ساز و سامان سے کیا نسبت۔

طاؤس در رکاب ہے ہر ذرہ آہ کا (۴۱) یا رب نفس غبار ہے کس جلوہ گاہ کا

۴۱۔ یا رب میرا وجود کس حسین کی جلوہ آرائی کا مقام ہے کہ میری آہ کا ہر ذرہ (اس قدر) خوبصورت ہے کہ (گویا ایک مور در رکاب ہے۔ یعنی ہر ذرہ آہ گویا مور کی طرح ناچتا دکھائی دیتا ہے۔

عزلت گزینِ بزم ہیں واماندگانِ دید (۴۲) مینائے مے ہے آبلہ پائے نگاہ کا

۴۲۔ واماندگان دید یعنی جن کی آنکھیں انتظار کرتے کرتے تھک چکی ہیں۔ آبلہ پائے نگاہ یعنی ان تھکی ہوئی آنکھوں کی نگاہ کے پاؤں کا آبلہ جو بوجہ تھکنے کے پڑ گیا ہے۔ جن اس کے انتظار میں جن کی آنکھیں تھک کر ان کی نظر کے پاؤں میں جو چھالے پڑ چکے ہیں۔ وہ ان واماندگان کے لئے شراب کی صراحی ہیں۔ اور وہ اس شراب کو تنہا بیٹھ کے پینے کے سبب گویا عزلت گزین بزم ہیں کیونکہ شراب تو عموماً محفل میں پی جاتی ہے۔ اور وہ اسی طرح تنہائی میں محفل کا لطف حاصل کر رہے ہیں۔

خود پرستی سے رہے باہم دگر ناآشنا (۴۳) بیکسی میری شریک آئینہ تیرا آشنا

۴۳۔ چونکہ بیکسی میری رفیق تھی۔ اس لئے میں اپنے حال میں مگن رہا کے خود پرست بنا رہا یعنی کسی کا دوست نہ بن سکا۔ ادھر تو ہمیشہ آئینہ دیکھنے میں مصروف رہا اور کسی سے سروکار نہ رکھا لہذا ہم تم دونوں کبھی آپس میں مل جل نہ سکے۔

ربطِ یک شیرازۂ وحشت ہیں اجزائے بہار (۴۴) سبزہ بیگانہ صبا آوارہ گل ناآشنا

۴۴۔ بہار کے اجزا یا اس کا ساز و سامان سب ایک آوارگی کے بندھن میں مربوط ہے۔ جمع ہے۔ یعنی سبزہ بہار سے ہے ستر رکھنے بیگانہ یعنی آوارہ و خود رو۔ اور صبا آوارہ مصروف ہے اور پھول تو کسی کا دوست ہی نہیں گویا وہ سب سے وحشت رکھتا ہے۔

جوشِ بہار کلفتِ نظارہ ہے اسد (۴۵) ہے ابر پنبہ روزنِ دیوارِ باغ کا

۴۵ - اے اسد بہار کا جوش یا اسکا سماں گھٹا - دیکھنے بھالنے کے لئے موجب تکلیف ہوتا ہے - کیونکہ اس موسم میں بادل بہت گھرتے اور چھپتے (بادل دیوارِ باغ کی کھڑکی میں اٹکسکا روئی بن جاتا ہے کہ جس سے دیوار کے کسی چھید وغیرہ کو بند کیا کرتے ہیں۔)

گر وہ مستِ ناز تمکین دے صلائے عرضِ حال (۴۶) خارِ گل بہرِ دہانِ گل زباں ہو جائیگا

۴۶ - اگر وہ متانت کا مست ناز سب کو اپنا حال کہنے کی اجازت دے تو پھول کے منہ میں کانٹا ہی زبان کا کام دے سکیگا - جو عرض حال کریگا -

گر شہادت آرزو ہے نشے میں گستاخ ہو (۴۷) بال شیشے کا رگِ سنگِ فساں ہو جائیگا

۴۷ - اگر تجھ کو یہ تمنا ہے کہ تو شہید یا قتل کیا جائے تو نشے میں گستاخ ہو یعنی پیالہ یا شیشہ گرا دو شیشے ٹھکرا دے (جیسے کہ بدمست شرابی کیا کرتا ہے) اس سے ہر شیشے میں بال پڑ جائیگا - اور وہ بال شیشے کا (جیسے کہ قاعدہ ہے ٹھلکر رفتہ رفتہ) سنگ فساں کی رگ بن جائیگا - کہ جس سے رہا کر کھا کے زخمیوں کی طرح شہید یا پامال کیا جا سکتا ہے ، تو ایسے ہی تو بھی اس سے زخمی یا شہید ہو سکیگا

گرمیِ دولت ہوئی آتش زنِ نامِ نکو (۴۸) خانۂ خاتم میں یاقوتِ نگیں اخگر ہوا

۴۸ - نسخہ حمیدیہ دیوان غالب میں غلطی سے دوسرے مصرعے میں اخگر کی بجائے اختر درج ہو گیا ہے - یہاں وہ غلطی درست کر دی گئی ہے - حاصل شعر : - دولت کی گرمی یا اسکی بدمستی نے نیک نام کو جلا کے برباد کر دیا ہے - (جیسا کہ دستور ہے کہ نو دولت اکثر عیاشی میں پڑ کر بدنام ہو جاتے ہیں) گویا مہر کے خانے میں نگین کا یاقوت (ایک قیمتی لال پتھر) اخگر ثابت ہوا ہے کیونکہ اس سے نیک نام گویا برباد ہو گیا ہے - اور یاقوت کی انگوٹھی عموماً امیر آدمی ہی پہنا کرتے ہیں

نشے میں گم کردہ راہ آیا وہ مستِ فتنہ خو (۴۹) آج رنگِ رفتہ دورِ گردشِ ساغر ہوا

۴۹ - رنگ رفتہ فارسی محاورہ ہے مراد گذشتہ عیش - حاصل - آج وہ فتنہ خو نشے میں رستہ

بھول کے آ گیا - گویا ہماری گذشتہ عیش (جس کے لوٹنے کی امید نہ تھی وہ) واپس آئی اور وہ گردشِ ساغر یا شراب کے دور چلنے کا باعث ہو گئی -

اس چمن میں ریشہ داری جس نے سر کھینچا اسد (۵۰) تر زبانِ لطفِ عامِ ساقیِ کوثر ہوا

۵۰ - ریشہ داری سر کھینچنا - ایک فارسی محاورے کا ترجمہ ہے - مراد کلغی دار کلاہ لگانا - جیسے کہ علما و مشائخ استعمال کیا کرتے ہیں - تر زبان ہونا بات چیت کرنا - حاصل شعر - اس چمن یا دنیا میں جس شیخ یا زاہد نے لمبی کلغی والا کلاہ لگا کے اپنا سر اونچا کر لیا تو بس وہ ساقیِ کوثر کے لطفِ عام کی بات چیت کرنے لگا - مراد یہ کہ زاہد مولوی کیسی وضع بنا کے بہشت کے دعویدار بن جاتے ہیں اور ساقیِ کوثر کے لطفِ عام کا ذکر کیا کرتے ہیں -

ہر چند ہوں میں طوطیِ شیریں سخن اسد (۵۱) آئینہ آہ میرے مقابل نہیں رہا

۵۱ - اگرچہ میں ایک شاعر شیریں زبان ہوں - لیکن افسوس کہ جس طرح طوطے کے سامنے آئینہ رکھکر آئینے کے پیچھے سے کچھ بولتے ہیں تو وہ طوطا اس کی نقل کرتا ہے - میں ایسا نقال نہیں ہوں - یعنی ایک ایسا آئینہ میرے آگے نہیں دھرا ہے - حاصل شعر یہ کہ دوسرے شعرا گذشتہ اساتذہ کی تقلید کرکے بہت فائدہ اٹھایا کرتے ہیں افسوس مجھ سے ایسا نہیں ہو سکتا -

بوالہوس دردِ سرِ اہلِ سلامت تا چند (۵۲) مشکلِ عشق ہوں مطلب نہیں آساں میرا

۵۲ - میں عشق کی مشکل ہوں ، زبان حال کہتی ہوں کہ اہل سلامت یعنی بوالہوس یا ایسے لوگ جو عاشق بنکے آرام طلب ہوتے ہیں - میں بوجہ ان کی ہوس کے کب تک ان کا دردِ سر یا ایک فضول مشغلہ ہی رہوں گی - کیونکہ میرا مقصد حاصل ہونا کچھ آسان کام نہیں ہے

بت پرستی ہے بہارِ نقش بندی ہائے دہر (۵۳) ہر صریرِ خامہ میں یک نالۂ ناقوس تھا

۵۳ - نقش بندی - مصوری - دنیا میں مصوری کا شوق ایک قسم کی بت پرستی ہے گویا مصور کے قلم سے جو آواز پیدا ہوتی ہے - وہ صریر خامہ نہیں - بلکہ نالۂ ناقوس - یعنی بت پرستوں کا سنکھ بجانا ہے -

خود آرا وحشتِ چشمِ پری سے شب وہ بد خو تھا (۵۴) کہ موم آئینۂ تمثال کو تعویذِ بازو تھا

۵۴ - وہ بد مزاج معشوق (بہ حالتِ غیض و غضب یعنی) اپنی وحشت میں (غصے سے) لال لال آنکھیں نکال کے خود آرائی کر رہا تھا اور ممکن تھا کہ اس کی غضب آلود نظر سے شیشے کے ٹکڑے اڑ جاتے مگر اس آئینۂ تمثال (جس آئینے میں اس کی صورت دکھائی دیتی تھی) کو جو موم لگا تھا (کیونکہ ہر آئینے کے عقب میں موم مستعمل ہوتا ہے) وہ اس کے لئے تعویذِ بازو تھا یعنی جب معشوق کی وحشتِ چشمِ پری ایک آسیب تھا - تو اس سے بچاؤ کے لئے یہ تعویذ بن گیا تھا لیکن حقیقتِ حال یہ ہے کہ آئینے کو موم ہی نے مضبوط کر رکھا تھا ورنہ معشوق کی غضب آلود نظر تو ایسی تھی کہ شیشے کا وجود کبھی قائم نہ رہتا - وتعویذِ بازو کا فائدہ یہ ہوا کرتا ہے کہ اس سے آسیب ٹل جاتا ہے (یہ وحشتِ چشمِ پری کی رعایت سے کہا ہے

بہ شیرینیِ خواب آلودہ مژگاں نشترِ زنبور (۵۵) خود آرائی سے آئینہ طلسمِ مومِ جادو تھا

۵۵ - دوست کے لئے آئینہ دیکھنے میں اس قدر محو ہے کہ اسکو نیند آ رہی ہے مگر وہ اپنے شغل سے باز نہیں آتا - لہٰذا خواب آلود آنکھوں میں اس کی پلکیں اسکو بھڑ کا ڈنک بن کے کاٹتی ہیں - لیکن وہ پھر بھی آئینہ دیکھتا رہتا ہے اور کچھ درد اسے محسوس نہیں ہوتا - کیونکہ آئینہ مومِ جادو یعنی موسیائی کا طلسم بن گیا ہے کہ جس سے ہر زخم درست ہو سکتی ہے - یعنی موسیائی ایک قسم کا اکسیر تصور ہوتی ہے -

نہیں ہے بازگشتِ سیل غیر از جانبِ دریا (۵۶) ہمیشہ دیدۂ گریاں کو آبِ رفتہ در جو تھا

۵۶ - غیر از یعنی بغیر - جانبِ دریا - دریا کی طرف - سیل - طوفانِ آب کی بازگشت بغیر دریا کی طرف کے اور کسی طرف ہوتی ہی نہیں ہے (جیسے جوار بھاٹا آئے تو پھر طوفانِ آب دریا ہی کی طرف لوٹتا ہے) لہٰذا میرے دیدۂ گریاں سے جو آنسو نکلتے تھے - وہ اسی میں لوٹ کر آ جاتے تھے - (اس سے میرا رونے کا سلسلہ کبھی بند نہیں ہوتا تھا) آبِ رفتہ در جو سے یہاں مراد آبِ گریہ کا بہکر پھر آنکھوں ہی میں آ جانا گویا اس کثرت سے آنسو بہا کہ طوفانِ گریہ بازگشت کرتا معلوم ہوتا تھا -

رہا نظارہ وقتِ بے نقابی ہا بخود لرزاں (۵۷) سرشک آگیں مژہ سے دستِ زنہار شیشہ رو تھا

۵۷ - جب وہ بے نقاب ہوا تو اس کا نظارہ خود (بوجہِ رعبِ حسن) کانپ رہا تھا اور شیشے کی پلکیں سرشک آلودہ ہو کر (شیشہ بر دو یعنی اس کے دوبدو دستِ زنہار) یعنی جان سے تنگ آ گیا تھا - مطلب یہ کہ دوست کے جلوے کا اس قدر رعب تھا کہ خود اس کا نظارہ کانپنے لگا - اور جب شیشے میں اس نے منہ دیکھا - اس کی تو جان ہی پر آفت برپا ہو گئی (شیشے کو جو پانی سے نسبت دینے کے یہاں سرشک آگیں مژہ قرار دیا ہے)

غمِ مجنوں عزاداریِ لیلیٰ کا پرستش گر (۵۸) غمِ رنگِ سیاہ از حلقہ ہائے چشمِ آہو تھا

چونکہ لیلیٰ مجنوں سے پہلے مر گئی تھی - لہٰذا مجنوں کا غم (جو سب پیا ہوا تھا) گویا لیلیٰ کے ماتم گر خواہوں کیلئے پرستش گر تھا یعنی انکو رونے رلانے کی عظمت کی طرف محرک تھا - جس نے اس قدر رلایا کہ ایک ہرن (جو لیلیٰ کے عزاداروں میں بوجہ مجنوں کا دوست ہو گیا تھا) اس کی آنکھوں کے حلقوں مراد آنکھوں سے غمِ رنگِ سیاہ ابھرا تھا یعنی اشکا عبیر سیاہ آنسو بہہ نکلے تھے -

دمیدن کے کمیں جوں ریشۂ زیرِ زمیں پایا (۵۹) بگردِ سرمو انداز نگاہِ شرمگیں پایا

۵۹ - بگردِ سرمو - مراد سر کے بال کے برابر جبل - اس کی شرمیلی نگاہ (جو بہت کم نکلا کرتی ہے) اس کا انداز گویا بال کے برابر تھا - جیسے کہ اگنے کی گھات میں یعنی بوقتِ پیدائش کسی پودے کا ریشہ یا کونپل زیرِ زمین ہوتی ہے اور تھوڑا تھوڑا کر کے اس گھات سے اپنا سر باہر نکالتی ہے - (نگاہِ شرمگیں بھی اسی طرح رفتہ رفتہ ظہور پذیر ہوا کرتی ہے)

کھلے اک غنچۂ روزن کی بھی چشمِ سفید آخر (۶۰) جیا کو انتظارِ جلوہ ریزی کے کمیں پایا

۶۰ - اس شعر میں یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے - کہ دوست رقیب کیلئے اپنی دیوار میں ایک سوراخ کر کے اس کا سخت منتظر رہا کرتا ہے - اور جب ضرورت نہ ہوا تھوڑی

رہی ہے اس سوراخ دیوار کو بند کر دیا کرتا ہے۔ اور چشم سفید مراد انتظار میں آنکھیں سفید ہونا۔ جیسے کہ یوسف کے انتظار میں حضرت یعقوب کا حال ہوا تھا۔ حل شعر:۔ دوست بوجہ حیا (رقیب کو) اپنا جلوہ نہیں دکھا سکتا۔ یعنی اعلانیہ اسے دیکھ نہیں سکتا ہے لہذا اپنے گھر کی دیوار میں کے ایک سوراخ میں سے یوں دیکھ رہا ہے۔ جیسے کوئی گھات میں بیٹھا ہوا ہو لہذا اس انتظار میں مذکورہ بالا پنبہ روزن سے بھی زیادہ اس دوست کی آنکھ آخر سفید ہو جائے علاوہ یہ کہ رقیب کے انتظار میں مثل یعقوب اس کی بھی ایسی حالت ہو جائے۔

بحسرت گاہِ نازِ کشتۂ جان بخشی خوباں (۶۱) خضر کو چشمۂ آبِ بقا سے تر جبیں پایا

۶۱۔ عاشق جو کشتۂ ناز ہو کے اپنے قاتل کو جان بخش چکا ہے۔ اور اس سے وہ عاشق گویا زندۂ جاوید ہو گیا ہے۔ (جیسا کہ شعرا کا عقیدہ ہے) اس نازکشتہ جان بخشی خوباں کی حسرت گاہ کی بدولت کہ جس سے حیات جاوید نصیب ہوا کرتی ہے خضر بھی اسی چشمہ آب حیات پر تر جبیں ہو رہا ہے (تر جبیں سے مراد کسی چشمے میں منہ ڈال کے پانی پینا اور پیشانی کا وہاں پانی سے تر ہو جانا)

پریشانی سے مغزِ سر ہوا ہے پنبۂ بالش (۶۲) خیالِ شوخیٔ خوباں کو راحت آفریں پایا

۶۲۔ معشوقوں کی شوخی و شرارت کی یاد ہمارے لئے ایک جزِ راحت ہے۔ کیونکہ ان کی شوخی و شرارت یا رنج رسانی سے ہمارا مغز سر مراد بھیجا۔ پریشان ہو گیا یا گھس گیا اور تکیے کے تنکے کی روئی بن گیا۔ کہ جس پر ہم پڑے ہوئے آرام کر رہے ہیں

نفس حیرت پرستِ طرزِ ناگیرائیٔ مژگاں (۶۳) مگر یک دستِ دامانِ نگاہِ واپسیں پایا

۶۳۔ بیخوابی کی وجہ سے مژگاں میں اسقدر ناگیرائی پیدا ہو گئی ہے یعنی پلک سے پلک نہیں لگتی کہ اس کی طرف سے میرے نفس یا خود مجھکو بہت حیرانی لاحق ہو رہی ہے کیونکہ یہ پلک سے پلک نہ لگنا ایسا ہے کہ شاید میں نے نگاہ واپسیں یعنی بوقت مرگ جیسے نظر اٹک جایا کرتی ہے۔ اس کے دامن کو ایک ہاتھ یعنی ہاتھ ڈال کے پکڑ لیا ہے

مراد نگاہ واپسیں میں آنکھیں کھلی رہتی ہیں۔ اسی طرح بیخوابی میں میری پلک سے پلک نہیں لگتی

نزاکت ہے فسونِ دعوئ طاقت شکستن ہا (۶۴) شرار سنگ انداز چراغ از جسم جستن ہا

۶۴۔ نزاکت یا کمزوری کے ذریعہ دعوی طاقت کے اثر کو زائل کرنا ایسا ہے جیسے کہ شرار سنگ پتھر کے جسم سے جستہ ہو یعنی نکلے اور وہ چراغ کا انداز کرے یعنی شرارہ جیسے کبھی چراغ کی برابری نہیں کر سکتا۔ کمزوری بھی کسی طاقت کا مقابل ہرگز نہیں ہے بعض نسخوں میں دوسرے مصرعے میں غالباً اصل شعر کو نقل کرتے وقت جستن کا خستن لکھا گیا تھا جو درست کر دیا گیا ہے)

ہوائے ابر سے کی موسم گل میں نمد بافی (۶۵) کہ تھا آئینۂ خورشید بے نقاب زنگ بستن ہا

۶۵۔ رنگ بستن مراد کوئی رنگ چڑھانا۔ سادہ نہ رہنے دینا حل:۔ موسم بہار میں ہوا نے (جو بادلوں کو اڑائے پھرتی تھی) سورج پر بادل کے ذریعہ ایک نمدہ سا چڑھا دیا کیونکہ خورشید کا شیشے پر کسی طرح کا کوئی رنگ نہیں چڑھایا گیا تھا وہ تا ہنوز سادہ اور بے نقاب تھا۔

اسد ہر اشک ہے یک حلقہ بر زنجیر افزودن (۶۶) بہ بند گریہ ہے نقش بر آب امید بستن ہا

۶۶۔ اے اسد رونے دھونے میں ہر آنسو جو نکلے گویا اپنے زنجیر پر ایک اور سوا کڑا بڑھا دیتا ہے۔ لہذا رونے دھونے کی ایسی پابندی گویا اپنی امید کو نقش بر آب کی صورت سے بستن یعنی پیدا کرنا یا پروان چڑھاتا ہے۔ مراد رونے دھونے سے اور زیادہ مایوسی ہوتی ہے۔ اور امید گویا نقش بر آب بن جاتی ہے۔

بسانِ جوہرِ آئینہ از ویرانیٔ دلہا (۶۷) غبار کو چہائے موجہ ہر خاشاک ساحلہا

۶۷۔ آئینے میں جوہر پیدا ہو کر جس طرح آئینہ ویران ہو جایا کرتا ہے۔ اسی طرح میرے دل کی ویرانی کی بدولت دریا کے کناروں کی خاک دھول دریا کی لہروں کے کوچے کی گرد بن کے رہ گئی ہے۔ یعنی میں اسقدر پریشان طبیعت ہو رہا ہوں۔

اپنے ورود سے آشنا یا واقف کرتا اور ان کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے

سرو کار تواضع تا خم گیسو رسانیدن (۷۷) لبسانِ شانہ زینت ریختِ دستِ سلام اسکا

۷۷۔ جس طرح کنگھی کا ہاتھ زلفوں کے خم تک پہنچ کر اپنی تواضع یا خدمت کا ساز و سامان بہم پہنچاتا ہے اور اس سے زلف آراستہ ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اس محبوب کا کسی کو سلام کرنے کے لئے ہاتھ اٹھانا موجب زینت ہے یعنی اس سے جسکو وہ بہت بھلا معلوم ہوا کرتا ہے (قاعدہ ہے کہ سلام و تواضع کے سبب ہر شخص بہت اچھا نظر آیا کرتا ہے)

مسی آلودہ ہے مہر نوازش نامہ پیدا ہے (۷۸) کہ داغ آرزوئے بوسہ لایا ہے پیام اسکا

۷۸۔ دوست نے ہمیں خط بھیجا ہے۔ مگر اس پر اپنی مہر لگاتے وقت اس نے مسی کا نشان لگا دیا ہے۔ اس سے یہ بات ہویدا ہے کہ اس کا خط آرزوئے بوسہ کی حسرت اپنے ساتھ لایا ہے (یہاں آرزوئے بوسہ معشوق کی طرف سے کہی گئی ہے اور اس نے یہ بات مسی کے داغ کے پردے میں اشارۃً اپنے عاشق پر ظاہر کی ہے)

بہ امید نگاہِ خاص ہوں محملکشِ حسرت (۷۹) مبادا ہو عنانگیرِ تغافل لطفِ عام اسکا

کہیں وہ (خدا) اپنا لطفِ عام چھوڑ کر عنانگیر تغافل نہ ہو —

. . . . یعنی ہم سے لاپرواہی نہ کرے

کیونکہ ہم اس قدر حسرت کش ہیں اور اس کے لئے سخت تکلیفیں برداشت کر رہے ہیں تو اسکی نظر خاص کی امید پر۔

یادِ روزے کہ نفس در گرۂ یارب تھا ۔ نالۂ دل بہ کمر دامنِ قطعِ شب تھا

در گرۂ یارب یعنی یارب یارب کی گرہ لگانا یا مسلسل یوں کہنا۔ نالۂ دل بکمر تھا فریاد دل (مسافر کی طرح) کمر باندھے تیار (تھی) چل (دی) مجھے وہ وقت یاد آتا ہے۔ جبکہ میں یارب یارب کا نعرہ لگا کے آہ کھینچا کرتا تھا اور ان دنوں میری فریاد دل بوقت دامن قطع شب یعنی آخر وقت شب (چلنے) کو تیار ہوا کرتی تھی۔ گویا میں پچھلی رات دل

دل سے فریاد کیا کرتا تھا۔

بہ تحیر کدۂ فرصتِ آرائشِ وصل (۸۱) دلِ شب آئینہ وارِ تپشِ کوکب تھا

۸۱۔ وہ دوست وصالِ رقیب کی تیاری کی تحیر کرنیوالی فرصت یا وقت میں (اس قدر متردد و پریشان) تھا کہ اس رات جو اس کے وصال کی رات تھی، دل شب یعنی وہ آدھی رات ستارے کی تڑپ کی آئینہ دار تھی گویا ستارہ جو جھلملایا کرتا ہے وہ نصف شب اس ستارے کے دل کی تڑپ کا اظہار کر رہی تھی (کیونکہ وہ معشوق کسی وصال کے انتظار میں اس قدر مضطرب ہو رہا تھا)

بہ تماشا کدۂ حسرتِ ذوقِ دیدار (۸۲) دیدہ گو خوں ہو۔ تماشائے چمن مطلب تھا

۸۲۔ تماشائے چمن سے مراد دوست کے پھول جیسے چہرے کا نظارہ ہے۔ حسرت ذوق دیدار کے تماشا کدہ میں یعنی اس کے دیدار کے شوق میں اگر آنکھیں خون یعنی خون کے آنسو رونے لگیں تو بھی دوست کے پھول جیسے چہرے کا دیکھنا مطلوب تھا۔

جوہرِ فکر پرافشانیِ ہر رنگِ خیال (۸۳) حسنِ آئینہ و آئینہ چمن مشرب تھا

۸۳۔ جوہر فکر یعنی فکر شعر کا خاصہ عموماً خیال کی پرافشانی یا اس میں ایک تحرک کا پیدا ہونا ہے اور وہ حسن آئینہ ہے۔ یعنی ہمارے آئینہ دل کا وہ ایک حسن یا خاص وصف ہے جس سے یہ آئینہ دل چمن مشرب تھا۔ مراد اس میں خیال کے طرح طرح کے گل بوٹے موجود تھے۔ حاصل شعر یہ کہ فکر شعر سے خیال میں تحرک واقع ہوتا ہے اور وہ تحرک دل کی ایک خاص خوبی ہے۔ (کہ یہ ایسی باتوں سے متاثر ہوا کرتا ہے) عجیب عجیب یہ دل طرح طرح کے خیالوں کا گویا ایک چمن تھا۔ تو ہم اس سے عجیب عجیب خیالات نظم کرنے لگے۔

پردۂ دردِ دل آئینۂ صد رنگ نشاط (۸۴) بخیۂ زخمِ جگر خندۂ زیرِ لب تھا

۸۴۔ دل کے درد کا پردہ سینکڑوں خوشیوں کا آئینہ یا ذریعۂ اظہار تھا۔ مراد

ورزش ہمارے لئے موجب راحت تھا۔ لہذا زخم جگر کا بخیہ ہمارے لئے ایک ہونٹوں تلے کی ہنسی بن گیا یعنی بخیے کے جو ٹانکے نظر آیا کرتے ہیں گویا وہ ہنسی کے وقت دانت نکلنے کے مشابہ ہوا تو بخیہ زخم جگر خندہ زیر لب ہو گیا۔

نالہ ہا حاصل اندیشہ کہ جوں کشت سپند (۸۵) دل نا سوختہ آتش کدہ صحبت تھا

۸۵۔ نغم کا ماحصل نالے ہیں کیونکہ یہ نغم زشل سپند دل سپند کی جس کو بالکل جلا نہیں دیا جاتا بلکہ تھوڑے ناسوختہ رکھا جاتا ہے) ہم کو کلیم جلا کے بھسم نہیں کر دیتا لہذا یہ دل ناسوختہ سپند کے ان بیجوں کی طرح گویا بھٹی ہے۔ کہ جس میں ہم جلے اور ہمیشہ نالے ہی کرتے رہتے ہیں۔

رات دل گرم خیال جلوۂ جانانہ تھا (۸۶) رنگ روئے شمع برق خرمن پروانہ تھا

۸۶۔ رات کو ہمارا دل اس محبوب کے نظارے کے خیال میں اس قدر محو و سرگرم تھا۔ کہ اس سرگرمی خیال کی تاثیر سے ہماری شمع کی روشنی پروانے کے لئے ایک معمولی روشنی نہیں بلکہ برق خرمن بن گئی تھی۔

شب کہ بھی کیفیت محفل بیاد روئے یار (۸۷) سر نظر داغ مے خال لب پیمانہ تھا

۸۷۔ رات کو دوست کے چہرے کی یاد میں جو ہم ایک طرح محفل کیسی کیفیت محسوس کر رہے تھے کیونکہ یار گویا ہمارے پاس ہی موجود تھا) اس وقت شراب کا داغ اجو کہ بزم عیش کے بعد ہر جگہ پڑ جایا کرتا ہے) ہر طرح پیمانہ شراب کے لب کا خال بن گیا تھا یعنی ہر داغ شراب کو ہم نے پیمانہ شراب کے آثار خیال کیا اور بزم دوست کی یاد کرتے رہے۔

کو بوقت قتل بھی آشنائی لے نگاہ (۸۸) خنجر زہراب دادہ سبزۂ بیگانہ تھا

۸۸۔ اے نگاہ دوست۔ ہمارے قتل کرتے وقت تجھ پر ہمارا وہ حق دوستی کیا ہوا۔ یعنی تونے ہمارا کچھ بھی لحاظ و پاس نہ کیا۔ گویا وہ تیز خنجر زہر آلودہ یا نظر ایک

سبزہ بیگانہ تھی یعنی ایک ایسا سبزہ کہ جو باغ کے گل بوٹوں سے نا آشنا اور اجنبی محض ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ خود رو ہوا کرتا ہے اور اسکو اہل چمن سے کچھ سروکار نہیں ہوا کرتا۔ اسی طرح ہمارے حق میں تیری قاتل نگاہ ثابت ہوئی۔

کرے گر حیرت نظارہ طوفان نکتہ گوئی کا (۸۹) حباب چشمۂ آئینہ ہو بیضہ طوطی کا

۸۹۔ اگر ہماری نکتہ بیانی کا طوفان حیرت نظارہ پیدا کرے یعنی اس کے سننے سے لوگ سخت حیرانی اور تعجب محسوس کرنے لگیں تو ہمارے دل کے آئینے کے چشمے کا بلبلہ گویا بولنے والے طوطی کا ایک انڈا بن جائے یعنی پھر ہمارے دل سے تخم گویائی پیدا ہوا کرے۔

پڑے قیس دست شرم پہ مژگان آہو (۹۰) مگر روز عروسی گم ہوا تھا شانہ لیلےٰ کا

۹۰۔ روز عروسی یعنی دلہن کی طرح بننے سنورنے کے دن شاید کہ لیلیٰ کا شانہ گم ہوا تھا۔ جو کہ ایک ہرن کی پلکوں کی صورت میں جبکہ مجنوں ان پلکوں کو ہاتھ میں لئے ہوئے تھا نظر آیا اور یہ مجنوں کیلئے گویا باعث شرم ہے۔

نہیں گرداب خرسنگی کئے طلب ہرگز (۹۱) حباب بحر کے ہیں آبلوں میں خار ماہی کا

۹۱۔ سمندر کا خاصہ ہے کہ اس میں سخت حرکت پیدا ہوتی ہے اور بلبلے بھی اٹھتے ہیں۔ اسی نسبت سے کہتا ہے۔ چونکہ سمندر کے بلبلے مثل آبلے کے ہیں اور ان آبلوں میں مچھلی کا کانٹا چبھ رہا ہے (اور مچھلی کی عادت ہے کہ وہ ہر وقت تیرتی رہتی ہے) لہذا کوئی سمندر ایسا نہیں ہے کہ جو کسی کی طلب میں آبلہ پا ہو کے سرگشتہ و حیران نہ رہ گیا ہو (یہ شعر محض شاعرانہ خیال بندی ہے)

نیاز جلوہ بیدی طاقت بالین شکستن یار (۹۲) تکلف کو خیال آئے ہو گر بیمار پرسی کا

۹۲۔ فارسی میں بالین شکستن سے مراد تعظیم بجا لانا ہے۔ لہذا اگر دوست آنے کی تکلیف کرے تو میں اپنی قوت تعظیم کو اس کے جلوے کے نظر کر دوں یعنی جہاں تک ہو سکے اس کی تعظیم بجا لاؤں

نہ بخشی فرصت یک شبنستان جلوہ گر مے (۹۳) تصور نے کیا سامان ہزار آئینہ بندی کا

یک شبستان سے مراد۔ رات بھر شبنم جیسا عالم ہونا۔ آئینہ بندی ۔ مکان کو شیشہ آلات سے
سجانا۔ حل: ہم سورج کی شعاعوں نے کبھی ایسا وقفہ نہ دیا کہ وہ نہ چمکتا تو ایک رات تو شبنم
زمین پر بھی رہتی اور اس سے رونق ہوتی۔ مراد یہ کہ اس آفتاب جیسے حسین دوست نے ایک
رات کے لئے بھی ہمیں وہ موقع نہ دیا کہ وہ ہمارا رونق محفل ہوتا تاکہ ہمارے تصور نے
یعنی اس کی یاد ہی یاد میں ہم نے اپنے مکان کو ہزار طرح کے شیشہ آلات سے سجانے کا بندوبست
کیا۔

یک گام بیخودی سے لوٹیں بہار صحرا (۹۴) آغوشِ نقشِ پا میں کیجے فشارِ صحرا

۹۴۔ ہم چاہتے ہیں کہ ایک قدم وحشت کا اٹھا کر جنگل کی بہار لوٹیں یعنی دیوانہ بن جائیں
اور صحرا گردی کیا کریں اور اپنے پاؤں کے آغوش یعنی تلوے کے نیچے جو ابھار خلا ہوتا ہے اس
کے نقش میں تمام صحرا کی گرد کو جمع کر کے رکھ دیں یعنی اس کا وہاں نشاء کریں

کیا کس شوخ نے ناز از سرِ تمکین شکستن کا (۹۵) کہ شاخ گل کا خم انداز ہے بالیں شکستن کا

۹۵۔ بالیں شکستن۔ تعظیم بجا لانا۔ حل شعر: کسی شوخ نے متانت کے ساتھ بیٹھنے کی ادا کی
ہے۔ کہ شاخ گل (جو بوجہ بوجھ جھکی ہوتی ہے) اس کے خم کا انداز ایسا ہے کہ جیسے تعظیم کر رہی ہے

وسعت جیبِ جنونِ تپش دل مت پوچھ (۹۶) محمل دشت بدوش رم نخچیر آیا!

۹۶ حل شعر: جیب کرون فارسی میں کسی کیفیت پر غالب آنا کہتا ہے۔ دل کے
مجنونانہ اضطراب کو وسیع جانے پر جیب کرنے یعنی اس پر قابو پانے کی کیفیت نہ پوچھ۔ گویا
سارا جنگل ایک محمل کی صورت بن گیا۔ اور وہ محمل ایک شکار کی بھاگ دوڑ کے کندھے
پر لد گیا۔ یعنی جبکہ سارا وحشت ہی یوں ہاتھ میں کر لیا گیا۔ تو پھر اس جنگل میں بھٹکنے والوں
کے جنون تپش کا کیا پوچھنا ہے۔ وہ تو اسی میں گویا شامل ہے۔

ہے گرفتاری نیرنگ تماشا ہستی (۹۷) پر طاؤس سے دل پائے بزنجیر آیا

۹۷۔ چونکہ یہ زندگی نیرنگی ہوس و تماشہ کی قید ہے۔ ہمارا دل مور کے پر دیکھ کر

پابہ زنجیر ہو گیا یعنی مقید و مبتلا ہو گیا۔ یہاں مور کے پروں سے مراد دنیا کے عیش و مزے
جو بظاہر بہت توجہ کش ہوا کرتے ہیں لیکن دراصل وہ ایک جانور ہی کے پر ہونے کی حیثیت
سے کچھ اصلیت نہیں رکھتے۔

عشق تر سا بچہ و شوق شہادت مت پوچھ (۹۸) کہ کلہ گوشہ بہ پرواز پر تیر آیا

۹۸۔ اس یہودی لڑکے کا عشق اور اس میں شہادت پانے کا حال نہ پوچھ۔ کہ میری کلاہ
کا کونہ اس قدر بلند ہو گیا کہ حقیقۃً تیر اڑ کر پرے چلا جاتا ہے۔

سرِ خط بند ہوا نامہ گنہگاروں کا (۹۹) خون ہدہد سے لکھا نقش گرفتاروں کا

۹۹۔ سرخط۔ قبالہ یا اقرار نامہ۔ حل: ہم (عشق) کے گنہگاروں کا پیام قبالہ قید ہو گیا
یعنی ہم نے اس کی طرف جو خط بھیجا تو اسی کا جرم ہے وہ خط ہماری قید کا اقرار نامہ قرار پا گیا۔
اور ہم گرفتاروں کا نقش یا حلیہ ہدہد کا لہو لے کے لکھا گیا (ہدہد سے یہاں مراد قاصد یا محض
ہدہد جانور ہے کہ جو حضرت سلیمان کا پیامبر تھا)۔

داد خواہ تپش و مہر خموشی بر لب (۱۰۰) کاغذ سرمہ ہے جامہ تیرے بیماروں کا

جامہ کا کاغذی ہونا سے مراد فریادی ہونا ہے "نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا" اور سرمہ سے استعارہ خموشی کا لیا جاتا ہے۔ حل شعر:
تیرے بیماروں یا عاشقوں کا لباس جب کاغذ سرمہ ہے یعنی سرمہ کی پڑیا کا کاغذ تو ظاہر ہے
کہ وہ اپنی بے چینی عشق کے ہاتھوں سے فریادی ہیں۔ لیکن خموشی کی مہر ان کے لب پر لگی
ہے۔ اور وہ کچھ فریاد نہیں کر سکتے۔

ہے تنگ و اماندہ شدن حوصلہ پا (۱۰۱) جو اشک گرا خاک میں ہے آبلہ پا

۱۰۱۔ واماندہ شدن یعنی تھک جانے سے۔ پاؤں کا حوصلہ کم ہو جاتا ہے (یعنی پھر
چلنے پھرنے کی جرات نہیں کرتا) گویا جو آنسو اس وقت (تھکے آدمی کا) خاک میں
گرتا ہے۔ وہ اس کے لئے آبلہ پا بن جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ پاؤں میں چھالا پڑ جانے سے

تو کوئی چل پھر ہی نہیں سکتا۔

تیرگی ظاہری ہے طبعِ موزوں کا نشاں (۱۰۲) غافلاں عکسِ سوادِ صفحہ ہے گردِ کتاب

۱۰۲۔ جو لوگ طبع موزوں رکھتے ہیں۔ یا شعرا کی نشانی انکی ظاہرا خراب حالت ہے۔ کیونکہ اے غافلو کتاب کے صفحے کے عکس یعنی اس کے بالمقابل کتاب پر مٹی پڑی ہوتی ہے پس جب یہ مٹی ہٹا دو تو صفحہ کتاب کا جوہر کھلتا ہے۔ اسی طرح شعرا کی تیرگی ظاہری ان کے کمال کو چھپائے ہوتی ہے۔

گرمی ہے زباں کی سببِ سوختنِ جاں (۱۰۳) ہے شمعِ شہادت کیلئے سرتا سر انگشت

۱۰۳۔ چونکہ شمع کی زبان یا لَو کی روشنی ہی اس کی جان کے جلائے جانے کا باعث ہے۔ لہذا خود شمع ہی اپنی شہادت (یعنی فنا) کیلئے سرتاپا ایک انگشت یا انگشتِ شہادت بن گئی ہے۔

دودِ شمعِ کشتہ ہے گل بزم سامانی عبث (۱۰۴) یک شبہ آشفتہ نازِ شبستانی عبث

۱۰۴۔ اے پھول کی بجھی ہوئی شمع کے دھوئیں تیری بزم سامانی یعنی رونقِ محفل ہونا عبث ہے۔ تیرا ایک رات کھل کے گویا نازِ شبستانی کرنا دھوئیں کی رعایت سے نازِ شبستانی کہا ہے محض فضول تھا۔ مراد یہ کہ پھول کو شمع فرض کر کے کہتا ہے کہ تیرا جوبن افسوس ہے زیادہ دیر قائم نہ رہا۔

سرنوشتِ خلق ہے طغرائے عجزِ اختیار (۱۰۵) آرزو با خارِ خارِ چینِ پیشانی عبث

۱۰۵۔ انسان کی پیشانی پر کچھ لکیریں سی کھنچی ہوتی ہیں جنکو قسمت کی سرنوشت کہا جاتا ہے حل شعر۔ لوگوں کی سرنوشت ان کے عاجز اور محدود اختیار کا ایک طغرا ہے یعنی اس سرنوشت سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان بے اختیار ہے وہ جو کچھ چاہے با اختیار نہیں کر سکتا۔ لہذا ہماری آرزوئیں ان پیشانی کی شکنوں کے خار ہیں یعنی ہماری قسمت ہی میں یہ بات نہیں ہے کہ آرزوئیں سرہو کے ہمیں راحت پہنچائیں۔

نازِ لطفِ عشق با وصفِ توانائی عبث (۱۰۶) رنگ ہے سنگِ محک عوضِ مینائی عبث

۱۰۶۔ باوجود توانائی یعنی دولت وثروت کے لطفِ عشق پر فخر کرنا عبث ہے کیونکہ وہ دیر پا نہیں ہوا کرتا۔ یہ رنگ یعنی عیش گویا کسوٹی کا سیاہ پتھر ہے جس پر سونا اپنی چمک دکھا سکتا ہے مگر وہ دعوائے مینائی یعنی خوشنمائی کا فخر نہیں کر سکتا۔ حاصل یہ کہ امیروں کی عیش بظاہر خوب نظر آتی ہے۔ مگر وہ دیرپا نہیں ہوتی جیسے محک پر سونے کا رنگ اس کی اصلیت پانے کی طرح ہے لہذا عبث ہے۔

ناخنِ دلِ عزیزاں یکقلم ہے نقب زن (۱۰۷) پاسبانِ طلسمِ گنجِ تنہائی عبث

۱۰۷۔ جبکہ دوستوں کا ناخن خود نقب زن ہوتا ہے تو گنجِ تنہائی کے جادو کی نگہبانی فضول ہے۔ مراد یہ کہ جب دوست تنہائی میں بھی ہمارے دل میں رہتے ہیں تو ہماری گوشۂ تنہائی کی یہ لذت غیر محفوظ ہے۔ اور اس کی احتیاط بے فائدہ ہے۔

طبعِ عاشق حاملِ صد غلبۂ تاثیر ہے (۱۰۸) دل کو اے بیدادجو تعلیمِ خارائی عبث

۱۰۸۔ جبکہ عاشق کی طبیعت ہر ایک اثر کے صدہا غلبوں کی متحمل ہو سکتی ہے یعنی اس پر کچھ اثر نہیں ہوتا تو پھر اے ظالم محبوب اپنے دل کو سختی کرنے کی تعلیم دینا فضول ہے۔ عاشق تو تیری کسی سختی کو کچھ سمجھتا ہی نہیں ہے۔

یک نگاہِ گرم ہے جوں شمع سرتا پا گداز (۱۰۹) بہر از خود رفتگاں رنجِ خود آرائی عبث

۱۰۹۔ جو عاشق کہ خود رفتہ یعنی اپنے بس ہی میں نہیں ہیں۔ انکو بن سنور کے مرعوب کرنا عبث ہے۔ ان کو تو تیری ایک نظر شمع کی طرح پگھلا سکتی ہے۔

اے اسد بیجا ہے نازِ سجدۂ عرضِ نیاز (۱۱۰) عالمِ تسلیم میں یہ دعوےٰ آرائی عبث

۱۱۰۔ اے اسد عرضِ نیاز کے سجدے یعنی اپنی عقیدت مندی کے لئے خدا کے سامنے سجدہ کرکے یہ ناز یا غرور کرنا بیجا ہے کیونکہ انسان ایک عالمِ تسلیم یا عبودیت کی حالت میں ہے اور اس کا کوئی دعوی (خدا کے سامنے) بالکل فضول ہے۔

گریہ ہائے بیدلاں گنجِ شرر در آستیں (۱۱۱) قہرمانِ عشق ہیں حسرت سے لیتے ہیں خراج

۱۱۱۔ بیدل عاشقوں کا رونا گویا اپنی آستین میں خزانہ رکھنا ہے۔ مراد یہ کہ عاشق جب روتے ہیں تو ان کے گوہر اشک جو آستین پر گرتے ہیں وہ ان کے لئے ایک خزانہ بن جاتا ہے اور یہ خزانہ اس طرح جمع ہوتا ہے کہ عشاق ملک عشق کے فرمانروا ہیں اور اپنی حسرت سے یہ خراج گریہ لیتے رہتے ہیں۔ چونکہ اس قدر قیمتی ہے (قہرمان مراد فرمانروا)

نہ کہہ کہ طاقتِ رسوائیِ وصال نہیں (۱۱۲) اگر یہی عرقِ فتنہ ہے مکرر کھینچ

۱۱۲ ۔ یہ نہ کہو کہ وصال سے جو رسوائی یا فتنہ پیدا ہوگا اس کے برداشت کرنے کی طاقت نہیں ہے۔ اگر یہ وصال عرقِ فتنہ ہے تو ایسے عرق دوبارہ کھینچ یعنی ایسی رسوائیاں مکرر اٹھا۔

یمنی بہار سے ہوں میں پا در رفتار ہنوز (۱۱۳) اے خار دشت دامنِ شوقِ شہید کھینچ

۱۱۳ ۔ موسم بہار میں تجلی گری کی وجہ سے میرے پاؤں رنگ گئے جیسے علاج کیلئے مہندی ابھی تک نئے پاؤں پر مہندی لگی ہے اسلئے اب صحرا میں نہیں جا سکتا۔ اے صحرا کے کانٹے تو نے اس سے گزر سے لگے شوق کا جو میرے پاؤں کو چھیدنے کیلئے تو تکتا تھا اب دامن کھینچ لے یعنی ترک کر دے۔

قطعِ سفرِ ہستی و آرامِ فنا ہیچ (۱۱۴) رفتار نہیں بیشتر از لغزشِ پا ہیچ

۱۱۴ ۔ زندگی کے سفر کا قطع ہونا یعنی بسر اوقات اور مرنے کے بعد فنا کا آرام پانا یہ دونوں ہیچ باتیں ہیں کیونکہ رفتار پاؤں کی لغزش سے کچھ زیادہ ہیچ نہیں ہے یعنی دونوں برابر کے ہیچ ہیں تو سفرِ زندگی اور آرامِ فنا گویا یکساں ٹھہرے۔

وصلِ آئینہ رخاں ہمنفسِ یک دیگر (۱۱۵) ہیں دعا ہائے سحرگاہ سے خواہاں گل و صبح

۱۱۵ ۔ پھول اور صبح یہ دونوں صبح کی دعاؤں سے خواہاں ہوتے ہیں کہ وصل آئینہ رخاں ایک دوسرے سے ہمنفس ہو یعنی ہمیشہ ایک دم کے ساتھ رہے یہاں آئینہ رخاں سے مراد ایک تو پھول ہے کہ آئینے کی طرح شفاف ہوتا ہے دوسرے صبح کہ وہ بھی صاف و پاکیزہ ہوتی ہے گویا گل و صبح دونوں دل سے چاہتے ہیں کہ ہمیشہ وہ ایک دوسرے کے ہمنفس رہیں کہ پھول ہمیشہ صبح ہی کو کھلتا ہے

کیجے آہوئے ختن کو خضرِ صحرائے طلب (۱۱۶) مشک ہے سنبلستانِ زلف میں گردِ سواد

۱۱۶ ۔ چونکہ زلف کے سنبل جیسے (سیاہ) بالوں کی گرد سواد یعنی فصیل یا اردگرد کی دیوار ہے مشک سے بنی ہے۔ لہذا اس مشک کیلئے اپنی طلب مشک کے صحرا کا خضر آہوئے ختن کو بنانا چاہئے کہ آدمی اس کی وساطت سے مشک نافہ حاصل ہوتا ہے۔

قربانِ اوج ریزیِ چشمِ حیا پرست (۱۱۷) یک آسماں ہے مرتبۂ پشتِ پا بلند

۱۱۷ ۔ ایک حیا پرست انسان (جو اپنی آنکھ کبھی اوپر نہیں اٹھایا کرتا) اس کی اوپر سے نیچے آنکھ ڈالنے یعنی اوج ریزی کے قربان جائیے۔ اس کی تو پشتِ پا کا رتبہ بھی یک آسمان بلند ہے۔ یعنی آسمان تک اعلیٰ و ارفع ہے۔

ہے دلبری کمینگہِ ایجادِ یک نگاہ (۱۱۸) کارِ بہانہ جوئیِ چشمِ حیا بلند

اس کی دلبری ایک نگاہ کے ایجاد کرنے کی گھات میں ہے یعنی ایک موثر نگاہ پیدا کیا چاہتی ہے۔ لہذا اس کی شرمیلی آنکھ کی فریبکاری کا عمل بلند ہو مراد وہ اپنی شرمگیں نگاہ کو گھات سے یعنی تہہ در تہہ کھولے اور دیکھے تاکہ وہ اپنا جادو کرے۔

حسرتِ دستگہ و پائے تحمل تا چند (۱۱۹) رگِ گردن خطِ پیمانۂ بے مل تا چند

۱۱۹ ۔ حسرتِ دستگہ یعنی سرمایہ و دولت کا غم اور تحمل کا پاؤں یعنی ثبات یہ دونوں کب تک ساتھ چل سکتے ہیں۔ مفلسی میں تحمل نہیں رہتا لہذا۔ ایک بے شراب کے ساغر کے خط پر غرور کب تک کیا جا سکتا ہے

بزم داغِ طرب و باغ کشادہ پر رنگ (۱۲۰) شمع و گل کے درِ پروانہ و بلبل تا چند

۱۲۰ ۔ محفل خوشی کا داغ ہے یعنی محفل آرائی سے نیز اکثر حسرت ہوتی ہے اور باغ رنگ یعنی عیش سے پر کی کشادگی پا اس کا گھر جاتا ہے۔ تو بزم میں شمع و پروانہ اور باغ میں گل و بلبل کب تک بھٹکے

نالہ دامِ ہوس و دعوئ اسیری معلوم (۱۲۱) شرحِ برخود غلطیہائے تحمل تا چند

۱۲۱ ۔ رقیب کی نسبت کہنا ہے کہ اس کا نالہ محض ہوس کا جال پھیلانا ہے تاکہ اس شوق پر کچھ اثر ہو ورنہ اس کو اسیری یعنی اسیری عشق کا کچھ درد پہنچا ہے یہ تو معلوم ہے کہ نہیں۔ لہذا

آہیں خواہ پیدا کرتی ہیں جو جاگ کر دل سے نکل جاتی ہیں۔

دوران سر سے گردش ساغر ہے متصل (۱۶۹) خمخانۂ جنوں میں دماغ رسیدہ ہوں

۱۶۹۔ چونکہ جنون میں مجھ کو ہر وقت دوران سر رہتا ہے۔ تو یہ سر کا گھومنا میرے لئے دور ساغر ہے اور اس طرح جنون کے خمخانے میں میں دماغ رسیدہ یعنی مست ہوں (دماغ رسیدہ ناسخ کا محاورہ ہے یعنی مست)

عروج نشۂ واماندگی پیمانہ محمل تر (۱۷۰) برنگ ریشۂ تاک آبلے جادے میں پنہاں ہیں

۱۷۰۔ عروج نشہ واماندگی یعنی خستگی و افسردگی کی زیادتی۔ پیمانہ محمل تر۔ پیمانہ لبریز ہو گیا ہے۔ ریشۂ تاک۔ انگور کے ریشے میں جو مواد ہوتا ہے وہ شراب کی طرح کا ہوتا ہے۔ محمل۔ خستگی کا پیمانہ لبریز ہو گیا ہے۔ یعنی اس حد تک نشہ پیدا ہوئی جس سے انگور کے اندر جس طرح مواد چھپے ہیں پاؤں کے آبلے بھی پگڈنڈی میں چھپے ہوئے ہیں۔ یعنی میں خستہ ہو کے رستے ہی میں پڑا رہا ہوں اور یہ حالت ہے۔

مگر آتش بہار آکو کب اقبال چمکا دے (۱۷۱) وگرنہ مثل خار خشک سود گلستان ہیں

۱۷۱۔ غالب کا ایک اور شعر بھی اسی مضمون کا ہے جس میں وہ کہتا ہے کہ میں خار ہوں آتش پر جیسوں رنگ نکالوں یعنی میں کانٹا ہوں آگ میں پڑوں جلوں شعلہ اسلئے تو گویا رنگ نکالوں اسی طرح کہتا ہے کہ شاید آگ چاہئے اقبال کے ستارے کو چمکا دے ورنہ ابھی تو یہ حالت ہے کہ میں خشک کانٹے کی طرح باغ کا راندہ ہوا ہوں (کیونکہ خار و خاشاک باغ سے صاف کر کے باہر پھینک دیا کرتے ہیں۔)

سایۂ گل داغ دود نکہت گل موج دود (۱۷۲) رنگ کی گرمی سے تاراج چمن کی فکر میں

۱۷۲۔ رنگ کی گرمی سے یہاں مراد پھولوں کے سرخ رنگ کی سرخی آگ اور اس کی گرمی جل پھولوں کے لال رنگ کی گرمی چمن کے برباد کر جلانے کے فکر میں ہے۔ یعنی فصل خزاں آ پہنچی ہے۔ لہذا پھول کا سایہ (بوجہ سیاہ رنگت کے) داغ ہے۔ جس کا خاصہ

دود پیدا کرنا ہے اور پھول کی خوشبو کا جوش گویا موج دود ہے۔ مطلب یہ کہ خزاں کی آمد پر حالت غم پیدا ہو گئی ہے۔

ہوا ہے گریۂ بیباک ضبط سے تسبیح (۱۷۳) ہزار دل پہ ہم اک اختیار رکھتے ہیں

۱۷۳۔ ہمارا گریہ جو بے خوف ہو چکا ہے اور خود بخود جاری ہو جایا کرتا ہے ہم نے اس کو ضبط کیا تو وہ گریہ یا اس کے آنسو ضبط کے سبب سے ایک تسبیح بن گئے اور اس تسبیح میں ہزاروں یعنی بے شمار قطرے آنسوؤں کے موجود ہیں لہذا ہم اس تسبیح کی وجہ سے گویا ہزاروں دلوں پر ایک اختیار رکھتے ہیں۔ مراد یہ کہ دل کو ایک قطرۂ اشک خونی بتایا جاتا ہے۔ تو ایسے قطرات اشک گویا ہزاروں دل بصورت تسبیح ہیں۔ میر تقی سے بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا۔ جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نکلا۔

بیبائی حیلہ جوئے ترک تنہائی نہیں (۱۷۵) ورنہ کیا موج نفس زنجیر رسوائی نہیں

۱۷۵۔ اس کا عذر اس تنہائی یا فراق کو (جو ہمیں اس نے دے رکھا ہے) ترک کرنے کا حیلہ جو نہیں ہے یعنی کچھ اس پر وہ کوشش نہیں کرتا ورنہ کیا موج نفس یعنی خود اس کے نفس کی موج یا لہر اس کے لئے زنجیر رسوائی یعنی موجب بدنامی نہیں ہے؟ مراد یہ کہ اس کے عذر پر خود اس کا ضمیر اسے ملامت کرتا ہے۔ مگر وہ کچھ پرواہ نہیں کرتا۔

ہے طلسم دہر میں صد حشر پاداش عمل (۱۷۶) آگہی غافل کہ یک امروز بے فردا نہیں

۱۷۶۔ اس طلسم خانہ یعنی دنیا میں عمل کا معاوضہ سو حشر اسی طرح ملتا ہے جیسا کہ کل یعنی قیامت کے روز سزا و جزا ملے گی (اسے آگاہ۔ تو اس امر سے کیا غافل ہے کہ یہاں کوئی ایسی امروز (آج) نہیں ہے کہ جس کا فردا (کل) نہ ہو۔ مراد جیسا آج کوئی کرتا ہے۔ ویسا ہی کل ضرور وہ پاتا ہے۔ یعنی اوسکا بدلہ ملتا ہے۔)

بسمل اس تیغ دو دستی کا نہیں کہتا ہوں (۱۷۷) عافیت بیزار شغل کمیتین اچھا نہیں

۱۷۷۔ کمیتیں دو پاسوں سے کھیلتے ہیں۔ اسی لئے تیغ دو دستی کہا ہے جل

نارسا یعنی بے اثر و نامراد ہوتا ہے۔ لہذا سمجھ لو کہ خواجہ خضر کی عمر دراز کا سلسلہ ایک بے اثر و نامراد ہوتا ہے ورنہ اتنی لمبی عمر میں تو کوئی نہ کوئی ان کی بیکسی کی طرف متوجہ ہو کے ان کی پریشانی کا علاج ضرور ہی کر دیتا۔

شیشۂ شکست اعتبار رنگ بہ گردش استوار (۱۹۴) گر نہ مطیع یہ کوہسار آپ کو تو صدا سمجھ

۱۹۴ شیشہ ہمیشہ شکست اعتبار ہوتا ہے۔ یعنی اس کی نسبت سب کو یقین ہے کہ یہ ایک دن ضرور ٹوٹ جائیگا۔ اسی طرح رنگ یعنی دورِ عیش کی نسبت خیال ہے کہ اسکو گردش دائمی ہے۔ لیکن اگر یہ چیزیں نہ شیشے اور رنگ کو مضبوط ہو جائیں تو اپنے آپ کو تو ان پہاڑوں کی صدا سمجھ کہ جو ہمیشہ عارضی ہوا کرتی ہے کہ ادھر سے آئی اور ادھر چلی گئی مراد یہ کہ دنیا میں عیش کے زمانے کو استقلال نصیب نہیں ہے اور اگر ہو بھی تو انسان خود کب تک زندہ رہ سکتا ہے کہ ان سے ہمیشہ متمتع ہو۔

لغزشِ پا کو ہے بلد نغمۂ یا علی مدد (۱۹۵) ٹوٹے گر آئینہ اسد سبحہ کو خوں بہا سمجھ

۱۹۵۔ بلد ہونا۔ رہنما ہونا۔ حل شعر۔ بسر شراب پی کر لغزش پا ہو یعنی پاؤں راہ میں پھسل پڑے تو اسکا رہنما نعرۂ یا علی مدد ہے۔ اسی طرح اے اسد اگر دل کا آئینہ ٹوٹ جائے تو اس شکست کا خون بہا یا معاوضہ تسبیح کو سمجھ مراد یہ کہ اگر نشے میں تو اس میخواری کی راہ سے بھٹک جائے تو یا علی کہکر مدد مانگ اور اگر تیرا دل میخواری سے بیزار ہو جائے تو تسبیح یا نہ کو اس پر قربان کر دے یعنی چھوڑ دے اور شراب اس تسبیح کے معاوضے میں لیکر پی لے تاکہ تیرا دل ٹوٹا ہوا نہ ہو۔

ہستی فریب نامۂ موجِ سراب ہے (۱۹۶) یک عمر نازِ شوخیٔ عنوان اٹھائیے

۱۹۶۔ یہ زندگی سراب کی لہر کا سا (جو پانی کی طرح دکھائی دیا کرتی ہے) محض ایک فریب نامہ ہے کہ جس کا آغاز یعنی آغازِ سراب تو ہمیشہ دلکش ہوا کرتا ہے لیکن انجام مایوس کن ہوتا ہے) لہذا اس ہستی بھر یعنی تمام عمر اس فریب نامہ سراب کے عنوان (سرنامہ) کی ایسی حرکت کا ناز اٹھایا کیجئے۔ مراد یہ کہ زندگی محض ایک سراب ہے لہذا اس کی نزاکتیں تمام عمر اٹھایا کرو۔